رخصت و عزیمت

(قرآن و حدیث کی روشنی میں)

عبداللطیف خان گنڈہ پور

نام کتاب: رخصت وعزیمت قرآن و سنت کی روشنی میں

مرتب: عبداللطیف خان گنڈہ پور

ناشر : الفوز اکیڈمی اسلام آباد

کمپوزنگ : حضرت رحمان

کمپیوٹر کیلی گرافی : سید عجائب حسین

پہلا ایڈیشن : نومبر2016ء

صفحات:

قیمت:

انتساب

اہلیہ محترمہ اوربچوں کے نام جنہوں نے اس نیک کام کی تکمیل میں نہ صرف بھرپو ر تعاون کیابلکہ قدم قدم حوصلہ افزائی کی۔ اللہ تعالی ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

آمین

فہرست مضامین

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اسلام دین فطرت ہے اور اس لحاظ سے انتہائی حقیقت پسند۔ اسلام مفروضوں اور تصوراتی نظریات و عقائد پر مشتمل دین نہیں ہے کہ زندگی کے جھمیلوں اور حقائق سے فرار اختیار کرکے انسان کو ایک تصوراتی دُنیا میں پہنچا دے۔ اور پھر وہ دُنیا و ما فیھا سے بے خبر اپنے آپ میں گم ہو کر نہ صرف اپنی شناخت کھودے۔ بلکہ ایک عضوِ معطل بن کر ایک بے فائدہ حقیر چیز بن کر رہ جائے۔

اسلام زندگی ہے تحریک ہے اور واقعیت پسند ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھتا ہے۔ انسان کو زندگی جینے کی راہ سکھاتا ہے۔ اُس کی تربیت کرتا ہے۔ عین منجدھار میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔ اور انسان کو گمراہیوں میں بھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ انسان کو مایوس ہونے سے بچاتا ہے۔ وہ انسان جو مشکلات اور مصائب دیکھکر گھبرا اُٹھتا ہے۔ یہ اُسے سہارا دیتا ہے۔ وہ انسان کی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے۔ اُس کی جلدباز کیفیت سے واقف ہے۔ اس لیے تو اُس کے لیے مشکل حالات میں بھی آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ اُس کی استعداد، اُس کی صلاحیتوں اور ساتھ ساتھ اُس کی مجبوریوں کا احساس کرکے اُسے رحصتیں اور سہولیات عطا کرتا ہے۔ اس لیے تو اس کو دین سمحیہ کہا گیا ہے۔

اسلام اس طرح زندگی کو حسین اور آسان بناتا ہے۔ اور ایک ''وسط'' دین کی بنا پر وسط ، معتدل اور متوازن رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی تو اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کتاب رخصت و عزیمت میں نہ صرف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ اسلام نے انسان کے سامنے ادنیٰ اور

کمال کے درجوں کی تقسیم کی ہے۔ تاکہ اگر وہ کمال کے درجے تک اپنی کسی کمزوری اور عدم استعداد کی بنا پر نہ پہنچ سکے۔ تب بھی وہ مایوس نہ ہو اور اُس ادنیٰ درجے تک تو بہرحال پہنچے۔ جو کہ ایک مسلمان کے لیے Bare Minimum ہے تاہم اس کا منشا یہ ہے کہ انسان کمال حاصل کرے اور نامساعد حالات میں بھی کمال درجے کے حصول کے لیے عزیمت کی راہ اختیار کرے جو اولوالعزم پیغمبروں کی سیرتوں میں نمایاں ہے۔ اور جس کا عملی نمونہ اُسوۂ حسنہ میں موجود ہے۔

اس کتاب کا ابتدائی خاکہ جناب ثناء اللہ بلوچ صاحب کی خواہش پر جناب ارشاد اعظم نے تیار کیا۔ اور انہوں نے ۸/۷ صفحوں کی ایک outline بنائی۔ جناب بلوچ صاحب کی خواہش تھی کہ میں اُس میں جزوی ترمیم و اضافہ کرکے اس کو ایک درس کی شکل دیدوں۔ تاکہ اس طرح کے دیگر موضوعات کے ساتھ ''دروس قرآنی'' کا ایک کورس عام قارئین کے لیے دین کی تفہیم کے لیے مرتب کر لیا جائے۔ لیکن جب اس ابتدائی خاکہ پر کام شروع کیا تو وضاحتی نکات یوں سامنے آتے گئے۔ کہ وہ ابتدائی خاکہ یکسر بدل کر رہ گیا۔ اور یہ کام پھیلتے پھیلتے کتاب کی ضخامت اختیار کر گیا۔ اور اب ایک درس کی بجائے اس موضوع پر کسی حد تک ایک جامع کتاب ہے۔

اس موضوع پر فقہاء کے ہاں فقہی مباحث موجود ہیں اور میں نے کوشش کی ہے۔ کہ اُن کی آرا کو اس انداز سے مرتب کروں کہ اس موضوع کے مختلف پہلو وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے آجائیں۔

عام طور پر اُمت کے افراد کو جدید زمانے کی آسائشوں اور نیرنگیوں نے اتنا سہل پسند اور مادیت پسند بنا دیا ہے کہ اب عزیمت تو اپنی جگہ، وہ اس دین کی انتہائی آسان عبادات اور احکامات سے بھی پہلو تہی کے لیے دین ہی کی تعلیمات میں ہیر پھیر کرکے حیلہ بازیوں اور بہانوں سے فرار کے راستے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور پھر اس پر ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اس دین کی غلط تعبیرات کرنے پر کمر کس لیتے ہیں۔

اس کتاب کے پہلے باب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ رخصت اور عزیمت کے شرعی مفہوم سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور اس کے قواعد و ضوابط اور اضطراری حالات میں اس کے حدود واضح کر دئیے جائیں۔ اور ساتھ ہی اس تصورکو بھی ذہن نشین کر دیا جائے کہ دین نے جن رخصتوں کا حکم دیا ہے۔ اور نص نے جن کی تصریح کی ہے۔ وہ نہ صرف حتمی واجب اور فرض ہیں بلکہ اگر ان صریح رخصتوں پر عمل نہ کیاگیا تو آپ گویا اللہ کے احکام سے روگردانی کر

رہے ہیں۔ یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ رخصت عام طور پر عزیمت کے اصل احکام میں ایک قسم کی استثنا (exemption)یا سہولت (Relaxation) ہے جو کہ انسان کی بعض مجبوریوں مثلاً مرض، سفر وغیرہ کی وجہ سے دی گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی یہ حدیث کہ رسول اللہ دو اُمور میں آسانی کا پہلو اختیار فرماتے تھے ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ کہ رسول اللہ صرف اُن دو امور میں آسان امر اختیار فرماتے تھے۔ جن کا ثواب برابر ہوتا تھا۔اور جو اختیاری امور تھے اس کی مثالیں دی گئیں۔ اور ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جہاں تک دعوت اور جہاد کا تعلق تھا تو رسولؐ نے کبھی بھی آسان راہ اختیار نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ عزیمت اختیار کی۔ اور صحابہ کرام کی بھی عملی اور علمی تربیت اس انداز میں کی۔ اور اُمت کو بھی اس کی تعلیم اور ہدایت دی۔ کہ راہِ حق میں مشکلات انگیز کرکے اللہ کے کلمے کو بلندکریں۔ اور اس راہ میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

دوسرے باب میں عزیمت کے تقاضےبیان کیے گئے ہیں۔ جن سے عزیمت کی راہ کی مطلوب صفات اور اس کے اہم پہلو واضح ہو جاتے ہیں اور وہ غلط فہمی بھی رفع ہو جاتی ہے۔ کہ آدمی بس اپنی حد تک مکلف ہے۔ تقویٰ، شکر، صبر، توکل، احسان، غوروفکر ، ذکر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکروغیرہ کی اصطلاحات کا وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ جو اس محدود مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ جو تصوف کے بعض حلقوں نے یہاں متعارف کرایاہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشن میں ثابت قدمی، جلد بازی سے پرہیز اور مقصد اور ذریعہ کی تقدیس بیان کی گئی ہے۔ کہ جلد بازی کے نتیجے میں منزل کے لیے ناجائز ذرائع اور سنت رسول کے برعکس راستے تلاش کرنا ساری جدوجہد کو اکارت کر ڈالتا ہے۔اس سلسلے میں یہ اسلامی تصور بھی دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان کو عزیمت کی راہ پر چلنے کے لیے رزم خیر وشر کے سفرنامے سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔صرف خیر کو جاننا اور شر کے سرچشموں سے بے خبری اور لاعلمی مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔ ان تمام تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہجرت اور جہاد کی اس راہ میں اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ یہ سارے تقاضےایک دوسرے سے مربوط (integrated) ہیں اور سب پر یکساں عمل اس راہ میں کامیابی کا ضامن ہے۔

تیسرے باب میں وہ ذرائع بیان کیے گئے ہیں کہ جن کے بغیر آپ عزیمت کی راہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن، اُسوہ حسنہ، سیرت صحابہ، صالح لٹریچر

اور صالح اجتماعیت کی طرف رجوع کریں۔قرآن و سنت ہی وہ دونوں بنیادی مصادر ہیں کہ جو مسلمانوں کیلیے ہدایت اور نور کے سرچشمے ہیں۔ ان کی تعلیمات ہی کی بنیاد پر آپ وہ صالح معاشرہ وجود میں لا سکتے ہیں۔ جہاں صرف اخوت، محبت، رفاقت اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ماحول ہو۔ اور یہ سب کچھ بغیر اللہ کی توفیق اور استعانت کے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اللہ اُن کو توفیق دیتا ہے اور مدد فراہم کرتا ہے جو خود آگے بڑھ کر ہدایت کے طلب گار ہوں۔

اور آخری باب میں قافلہ اہل عزیمت کی تاریخ کی روشنی میں وہ درخشاں مثالیں پیش کی گئی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ہر مشکل وقت میں احیائے دین کے لیے کوششیں فرمائیں۔ اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے آواز بلند کی۔ اور یہ سلسلہ اور قافلہ نہ تھما ہے اور نہ رکا ہے۔ بلکہ اس قافلے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حق و باطل کا معرکہ اب بھی جاری ہےاورامت اپنا خون دیکر حق کی سربلندی کے لیے کوشاں ہے۔

یہ کاوش اس لحاظ سے تو نئی نہیں کیونکہ اُمت کے انتہائی جلیل القدر علماء بالخصوص مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ابولحسن علی ندویؒ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر تصنیفات پیش کی ہیں۔مولانا مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجدددین کے کارناموں کا احیائے دین کے حوالے سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ باوجود اس کے، کہ یہ مقالہ شاہ ولی اللہ کی خدمات کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ یہ احیائے دین کے حوالے سے کوششوں کا ایک انتہائی مدبرانہ اور جامع تجزیہ ہے۔ جس میں اُنہوں نے اصلاح احوال کے لیے راستے بھی تجویز فرمائے ہیں۔

دوسری جانب اُن کی اس ۱۹۴۰ کی تصنیف کے بہت بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے دعوت و عزیمت کے نام سے مشاہیر اسلام کی تاریخ اپنے نقطۂ نظر سے مرتب کی۔ اور اُن کی دعوت کا جائزہ لیا۔ اور بہت عمدہ طریقے سے اُن کی دعوتی جدوجہد پر تفصیلاً روشنی ڈالی۔

میں نے دونوں علماء کی تصنیفات سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں لیکن حالیہ کتاب اس لحاظ سے اُن کتابوں سے مختلف ہے کہ اس میں عزیمت کے تناظر میں رخصتوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر جیسا کہ عرض کیا چکا ہے۔ عزیمت کے تقاضوں اور ذرائع سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور یوں ایک عام

مسلمان کے لیے عزیمت کی راہ کا راہ عمل(Action Plan) پیش کیا گیا ہے۔
اس کتاب کا منشا و مدعا صرف یہ ہے کہ اس افراط و تفریط کے دور میں اُمت کی اسلام کے منشاء کے مطابق صحیح رہنمائی کی جائے۔ اور افراد امت اُن تمام فتنوں،اورگروہوں سے آگاہ ہو جائیں جو ایک طرف اُمت کو عیش کوشی، نفرت پسندی اور سہل انگاری میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اُن کے سامنے اسلام کی غلط تعبیریں پیش کرکے اُس کو افراتفری، انتہا پسندی اوردینی اُمور میں بے جا غلو کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ وقت کی انتہائی ضرورت ہے کہ ہم دین اسلام کے بارے صحیح آگہی حاصل کریں۔ اور پھر عزم صمیم کے ساتھ اپنے اس موقف پر ڈٹ جائیں۔
اس کتاب میں خصوصی طور پر یہ اہتمام کیا گیا ہےکہ جو حضرات وقت کی کمی یا دوسری مصروفیات کی بنا پر صفحاً صفحاً کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے ان کے لیے کہیں تو اہم نکات کے نیچے خط کھینچ لیے گئے ہیں ۔ اور کہیں fontمیں مناسب تبدیلی کر دی گئی ہے تاکہ وہ بیک نظر (at a glance)ساری کتاب کو دیکھ سکیں۔

انگریز ی خواں طبقے کی سہولت کی خاطر اہم الفاظ و اصطلاحات کی انگریزی میں وضاحت (Glossary of Words)کتاب کے آخر میں کی گئی ہے تاکہ بروقت مناسب رہنمائی ہو سکے۔

میں خصوصی طور پر جناب ثناء اللہ بلوچ، جناب ارشاد اعظم، پشاور میڈیکل کالج کے جناب حضرت رحمٰن اور الفوزاکیڈمی اسلام آباد کے جناب سید عجائب حسین کا مشکور ہوں جن کے تعاون و مدد کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان کے علاوہ اُن تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے علمی مواد مہیا کر نے میں مدد فرمائی ۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر عطا فرمائے۔آمین
آخر میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔کہ ‘‘یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے، ہوا کے رخ پر اڑنے والے خش و خاشاک، اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ

دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کےدریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رخ پر بہنے کے لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے، وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعا پروانہ ہوگی، وہ ہر اس نقصان کو گوارا کر لے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو، حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں، اور پانی کی موجیں اس کو نیم جاں کرکے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہر گز شکست نہ کھائے گی، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔

انقلاب یا ارتقاء ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے، اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں ڈھال دینے کا نام ہے۔مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے، موڑ دینے کو کہتے ہیں۔دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا، جو لوگ اپنا کوئی اصول، کوئی مقصد حیات، کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں، جو بلند مقصد کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، جو خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی ہمت نہ رکھتے ہوں، جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو، جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں، ایسے لوگوں کا کوئی قابل ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے۔ انہی نے اپنے جہاد اور اپنی قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں۔ مناہج عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ کر چھوڑا ہے۔

میں ایک مجاہد کے ایسے ایمان کا طالب ہوں، ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندرکی طوفانی موجوں کے مقابلے میں ٹوٹی ہوئی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہو جائے، ایسی روح مانگتا ہوں جو شکست کھانے اور سپر کا رکھ دینے کا تصور بھی نہ کر سکتی ہو، ایسی عزیمت

مانگتا ہوں جو مادی سہاروں سے قطعا مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے، ایسا ارادہ مانگتا ہوں جسے کوئی طاقت اپنے راستے سے نہ ہٹا سکے۔''

مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہےکہ اس اہم موضوع کا کماحقہ حق ادا نہ کر سکا۔اس میں جو بھی غلطی ہوئی وہ میری جانب سے ہے۔ جس کے لیے اللہ سے معافی کی درخواست ہے۔ اور جو کچھ حق ہے۔ وہ اللہ کی جانب سے ہے۔
اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کو شش کو قبول فرما کر اسے لوگوں کے لیے ہد ایت کا ذریعہ بنائے اور میر ے لیے باعث اجر و ثواب۔ آمین۔
سُبحانک اللّٰھم وبحمدک استعفراللہ الذی لا الہ الا انت و اتوب الیہ۔
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

مورخہ : ۸ذی الحج۱۴۳۷ ھ
بمطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۱۶

عبد اللطیف خان گنڈہ پور
ایڈوائزرتربیہ پشاور
میڈیکل کالج
ورسک روڈ پشاور

باب اول

رخصت و عزیمت

رخصت و عزیمت

اسلام دین فطرت ہے اور یہ انسان کی فطرت اور لوگوں کے درمیان اس فطری فرق سے آنکھیں بند نہیں کرتا جو اعلیٰ درجات تک پہنچنے کیلیے درکار استعداد و صلاحیت کے حوالے سے ان میں پایا جاتا ہے۔اس حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے اسلام نے ہر عمل کیلیے اعلیٰ اور ادنٰی دو سطحیں مقرر کی ہیں۔اسلام انسان کے ضعف کا اعتراف کرتا ہے اس لیے اسلام نے انسانوں کو ترغیب بھی دی ہے اور ڈرایا بھی ہے۔نیکی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کا حکم دیا ہے۔ سزائیں بھی مقرر کی ہیں اور توبہ کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے۔ اسلام نے ضرورتوں کیلیے احکام وضع کیے ہیں اور مجبور اور معذور لوگوں کے عذر کا خیال رکھا۔ لہٰذا مختلف حالات میں رخصتیں اور استثناء کی گنجائش رکھی ہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کیلیے مشکل اور مصیبت کےاوقات میں ایسے جائز راستے کھول دیے ہیں جن سے وہ مشکلات سے نکل سکتے ہیں۔ ان صورتوں میں وہ چیزیں لازم نہیں ہوتیں جو پہلے عام حالات میں اُن کیلیے لازم اور ضروری یا حرام اور مکروہ تھیں۔ جب اعلیٰ اور ارفع صورت کو اختیار نہ کیا جا سکتا ہو تو ادنیٰ اور نسبتاً ہلکی صورت کو اپنا لینے کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ان شرعی احکام کو عزیمت اور رخصت کہا جاتا ہے۔ان پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ حکم شرعی کی نوعیت معلوم کی جائے تاکہ اس کی روشنی میں مندرجہ بالا اصطلاحات کی حقیقت واضح ہونے میں آسانی ہو۔

حکمِ شرعی:

اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب(Address) ہے جو براہِ راست قرآن مجید میں یا رسول اللہ کی زبان مبارک سے سنت کے ذخائر میں ہم تک پہنچا ہو۔

اور جو بندوں کے افعال اور اعمال کی کسی کیفیت یا حیثیت سے متعلق ہو۔ اس کو اصطلاح میں "حکم شرعی"کہتے ہیں ۔
(مبادیات اُصول فقہ از عبداللطیف خان گنڈہ پور و محمد خان منہاس صفحہ ۷۴)

حکم شرعی کی دو قسمیں ہیں۔ حکم شرعی تکلیفی اور حکم شرعی وضعی

حکم شرعی تکلیفی:

‘‘حکم شرعی تکلیفی’’ وہ ہے جس کے نتیجے میں انسان کو کسی چیز کا مکلف قرار دیا گیا ہو۔ یا کسی چیز کا مکلف ہونے سے بری قرار دیا گیا ہو۔ یعنی یا تو یہ بتایا گیا ہو کہ یہ کام کرنا لازمی ہے اور یا یہ بتایا گیا ہو کہ یہ کام نہیں کرنا ہے۔ یا یہ بتایا گیا ہو کہ تمہیں اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کی اجازت ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بتائی گئی ہو تو یہ ‘‘حکمِ شرعی تکلیفی’’ کہلاتا ہے

جس کام کو لازمی کرنے کا حکم دیا گیا ہو مثلاً:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ **(البقرہ:۴۳)** "اور نماز قائم کرو اور زکواۃ دو"۔

جس کام سے منع کیا گیا ہو۔ مثلاً:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ **(الانعام:۱۵۲)** "اوریہ کہ مال یتیم کے قریب نہ جاؤ"۔

جس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہو۔ مثلاً:

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا **(المائدہ:۲)** "ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم شکار کر سکتے ہو"۔

(ایضاًصفحہ ۷۴ تا ۷۵)

اکثر علماء نے حکم تکلیفی کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ایجاب (واجب) ۲۔ ندب (مندوب) ۳۔ تحریم (حرام) ۴۔کراہت (مکروہ)
۵۔اباحت (مباح)

اس تقسیم سے یہ ظاہر ہے کہ جس فعل کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں۔ واجب اور مندوب۔ جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اُس کی بھی دو قسمیں ہیں حرام اور مکروہ۔ اور کسی کام کے

کرنے یا چھوڑنے میں اختیار دیا گیا ہو تو اُس کی ایک ہی قسم ہے مباح۔
علماء احناف نے اس کو سات قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ فرض، واجب، مندوب، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور مباح
(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مبادیات اُصول فقہ از عبداللطیف خان گنڈھ پور ومحمد خان منہاس، اور جامع الأصول از عبدالکریم زیدان صہ۴۹ تا ۶۷)

حکم وضعی:

وضع کے لغوی معنی کسی چیز کو بنانایا اختیار کرناہے۔اصطلاح میں حکمِ وضعی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب (Address)ہے جو کسی چیز کو کسی فعل کے لیے سبب (cause)، شرط (condition) یا مانع (impediment) بنا دے۔ یا کسی چیز کے صحیح (valid)یا فاسد (irregular) ہونے کا ذریعہ بنے۔(علم اصول فقہ۔ایک تعارف جلد اول از ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلّوں۔صفحہ۔۵۷)
اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا **(بنی اسرائیل۔۷۸)**
"نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کررات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو ! کیونکہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے۔ (یعنی فجر میں پڑھے جانے والے قرآن کی فرشتوں کی طرف سے گواہی دی جاتی ہے)"۔
اس آیت میں زوالِ آفتاب کو شام کی نماز کا سبب قرار دیاگیا ہے۔

رخصت و عزیمت:

حکم شرعی میں عزیمت اور رخصت کی حیثیت کے بارے میں علماءاصول کی دو آرا ہیں۔کچھ اسے حکمِ تکلیفی میں شامل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اقتضا (طلب) اور تخییر (اختیار) شامل ہے۔ عزیمت اقتضا ہے لیکن رخصت میں تخییر ہے۔ بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ یہ حکمِ وضعی میں سے ہے۔ کیونکہ رخصت حقیقت میں شارع کی طرف سے تخفیف کے اسباب میں سے کسی ایک سبب کا بیان ہے۔عزیمت اس عادت پر عمل کرنا ہے جس کے مطابق کلّی احکام نازل ہوتے ہیں۔ اس موقف کے مطابق رخصت اور عزیمت فعل کی اقسام میں سے ہیں۔ جن فقہا کا یہ موقف ہے اُن میں علامہ ابن الحاجبؒ، علامہ شاطبیؒ اور علامہ استویؒ شامل ہیں۔ ان دونوں اسالیب کے حاملین کا طریقہ درست ہے۔ حکم مکلف کے فعل سے متعلق ہے۔ ایک گروہ

نے اسے اپنے انداز میں اور دوسرے گروہ نے اسے اپنے طریقے سے تقسیم کیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۹۷تا ۹۸)

بہرحال ہم دونوں کے موقف کو یکجا کرتے ہوئے ان کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

عزیمت کا لغوی و اصطلاحی معنٰی

عزیمت کا لغوی معنیٰ:

عزیمت (ع ز م) سے ماخوذ ہے اَلعَزمُ وَالعَزِیمَةُ: کسی کام کو قطعی اورحتمی طور پر کرنے کا اِرادہ کرنا:

فَاِذَاعَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ (۳۔۱۵۹)"جب کسی کام کاعزمِ مصمم کرلوتو خدا پربھروسہ رکھو"۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (۲۔۲۳۵) "اور نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا"۔

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۳۱۔۱۷) "بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں"۔

امام رازی ؒ نے اپنی تفسیر کی جلد 1صفحہ نمبر 352میں عزیمت کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے:

عقد القلب علی امضاء شیء ترید فعله۔

"یعنی کسی کام کو کرنے کے لیےدل کا مضبوط ہونا عزیمت کہلاتا ہے"۔

عزیمت کا اصطلاحی مفہوم:

طاقت اور گنجائش کے مطابق اللہ کی اطاعت کرنے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کرنے کے ارادے کو دل میں مضبوط اور پختہ کرنے کا نام عزیمت ہے ۔

(جو اولوالعزم پیغمبروں کی سیرتونمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے)

بعض حضرات نے عزیمت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے:

ہواءِ نفس سے آزاد ی حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی طرف متوجہ ہو کر مقدور بھر کوشش وجدوجہد کا نام عزیمت ہے ، تاکہ ظلمات سے بچ بچ کرنورِ شریعت کے تحت زندگی گزاری جائے ۔

ابن الاثیر ؒ نے اپنی کتاب "النہایة فی غریب الحدیث والاثر" کے جلد نمبر 3، صفحہ نمبر 231میں عزیمت کا مندرجہ ذیل مفہوم بیان کیا ہے :

هِیَ مَا وَکَّدتَّ رَأَیکَ وَ عَزَمَکَ عَلَیهِ وَوَفَأَیتَ بِعَهدِاللهِ فِیهِ۔

"یعنی اپنی رائے اور ارادے کوکسی کام کے کرنے کے لیے مضبوط اور پختہ کرنا اور اس کا م کے متعلق اللہ تعالیٰ سے جو عہدوپیمان کیا ہے اس عہد و پیمان کو پورا کرنا".
چاہے اس راستے میں مال و اولاد اور جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔اور انسان اس استقامت کے ساتھ چلتا جائے کہ: حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ۔
بعض علماء کے نزدیک اس کی جامع تعریف یہ ہے:
ہو اصل من الاحکام غیر متعلق بالعوارض
"وہ حکم جو احکام میں اصلی اور مستقل ہو اور عارضی احکام سے وابستہ نہ ہو".
اس کا مطلب یہ ہے کہ عزیمت کا اطلاق اُن شرعی احکام پر ہوتا ہے جو انسانوں کو عام حالات میں دئیے گئے ہیں۔ عارضی حالات اور مجبوری کا اس میں اعتبار نہیں کیا گیا۔ یہ وہ مستقل اور اصلی احکام ہیں۔جو اس لیے دئیے گئے ہیں تاکہ تمام انسانوں کے لیے معمول کے حالات میں ان کو عام قانونی حیثیت حاصل ہو۔ اس میں ضرورت اور عذر کا لحاظ نہیں رکھا گیا جیسے نماز اور دوسری عبادات۔
(جامع الاصول از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۶۸)
اسی طرح عزیمت میں وہ حکم بھی شامل ہوتا ہے۔ جو شارع نے شرعی اسباب کے لیے وضع کیا ہو ایسے حکم کا وجود اپنے سبب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جیسے مشرکین کو گالی دینے سے منع کیا گیا۔
قرآن میں ارشاد ہے:
وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔
(الانعام:۶۔۱۰۸)
"اور (اے ایمان والو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں اُنہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں".
یہ آیت اس سبب کو منع کرنے کے لیے نازل ہوئی جس کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو گالی دیں۔
عزیمت میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو شارع نے مصلحتِ عامہ کے تحت وضع کی ہیں جیسے :بیع،مضاربت، قصاص وغیرہ۔
اس میں عمومی ا ستثناء بھی شامل ہے ۔ جیسے ارشاد ہے:
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَـيْـــًٔـا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔

(البقرہ۔۲۲۹)
"اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو ، اس میں سے کچھ واپس لے لو ۔ البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زَوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو"۔
اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مہر میں سے کوئی چیز واپس لینا درست نہیں ہے لیکن حقوق اللہ کی ادائیگی میں کمی کا خوف ہو تو پھر کسی چیز کا لینا عزیمت ہے۔
عزیمت کی اقسام پہلے بیان کی جا چکی ہیں ۔اُن میں سے اسی قسم پر عزیمت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جس کے مقابلے میں رُخصت ہو اور جس حکم میں رخصت نہ ہو اُس پر عزیمت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

رخصت کا لغوی و اصطلاحی معنٰی:

رخصت کا لفظ سہولت ،آسانی اور نرمی پر دلالت کرتا ہے ۔ یہ لفظ عربی زبان کے فعل رَخَصَ سے ہے جس کے معنی کم ہونے کے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے۔رَخَصَ السِّعرُ یعنی نرخ کم اور ارزاں ہو گئے۔
اور کہا جاتا ہے کہ شارع نے فلاں چیز میں ہمارے لیے رخصت دی ہے ، یعنی شارع کی طرف سے آسانی اور سہولت دی گئی ہے ۔
عربی زبان میں رخصت کے لغوی معنی تسہیل، تخفیف، تیسیر اور عدم تشدید کے آتے ہیں۔ (مقاییس اللغۃ ابن فارس ج ۲ صفحہ ۵۰۰۔ لسان العرب ابن منظور جلد ۵ صفحہ ۴۰)
شرعی رخصت کے اصطلاحی معنی ہیں‘‘ وہ حکم شرعی جو صعوبت سے سہولت کی طرف منتقل ہوا ہو اور جس میں کسی عذر کے باعث آسانی پیدا کر دی گئی ہو اگر چہ اساسی حکم کا سبب جوں کا توں اپنی جگہ قائم ہو۔’’(رفع الحاجب عن مختصر اب الحاجب تاج الدین سبکی جلد ۲ صفحہ ۲۴ مذکرۃ فی اصول الفقہ محمد امین شنقیطی صفحہ ۴۰ بحوالہ ترجمان القرآن لاہور جنوری ۲۰۱۲)
حدیث میں آیا ہے :
اِنَّ اللہَ یُحِبُ اَن تُوتیٰ رُخَصَہ ُکَمَا یَکرَہُ اَن تُوتیٰ مَعصِیَتَہُ۔(مسند احمد)
’’بے شک اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی (دی ہوئی) رخصتوں کو بجا لایا جائے جیسے کہ وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے ‘‘۔
دینی امور و معاملات میں رخصت کا اطلاق ہر اس حکم پر ہوتا ہے جس میں نرمی ، سہولت اور آسانی کو مدنظر رکھا گیا ہو اور مشقت و

شدت سے روکا گیا ہو ۔ تاکہ فرار کے راستوں کا انسان راہی نہ بن جائے
بعض علماء نے اس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔
ھی ما وسع للمکلف فی فعلہ بعذر و عجز عنہ مع قیام السبب المحرم۔
(رُخصت وہ حکم ہے جس میں مکلف کیلیے کسی عذر و مجبوری کی بنا پر سہولت پیدا کی گئی ہو کیونکہ وہ اس کام کو سر انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتا اور حرمت کا سبب باقی رہتے ہوئے اُسے اُس کام کے کرنے یا نہ کرنے کی اجازت دی گئی ہو۔) یا رخصت وہ فعل ہے جس کی شرعاً کسی عذر و مجبوری کی بنا پر اجازت دی گئی ہو۔ حالانکہ وہ فعل حرام ہو۔ اگر وہ عذر نہ ہوتا تو وہ چیز حرام ہوتی۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ رخصت وہ احکام ہیں جو شارع نے انسانوں کی مجبوری کی بنا پر دئیے ہیں اگر یہ مجبوریاں نہ ہوتیں تو یہ اصلی حکم اپنی جگہ باقی رہتا۔ یہ اصلِ کلی سے استثنائی حکم (exemption) ہے۔اس استثنا (exemption)کا سبب مکلف کی تنگی دور کرنے کے لیے اضطراری حالات اور مجبوریوں کا اعتبار ہے۔ اکثر حالات میں یہ اصلی حکم کو لازمی کے درجے سے مباح کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور کبھی مندوب اور مستحب کی طرف۔
۔علمائے شافعیہ کے نزدیک رخصت سے مراد وہ حکم ہے جو دلیل سے ثابت حکم کے خلاف کسی عذر کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اکراہ و جبر کے وقت کلمۂ کفر کہنااور مجبوری کی حالت میں مردار کا گوشت کھانا ہے۔ پہلی صورت میں عذر اکراہ ہے اور دوسری صورت میں عذر نفس کی حفاظت ہے۔ ان حالتوں میں اصل حکم یعنی ایمان کی فرضیت اور کفر کی حرمت تو موجود ہے لیکن عذر کی بنا پر استثنا دے دیا گیا ہے۔
شرعی رخصت کے عام مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ ان گنجائشوں کی مشروعیت سے شارع حکیم کے پیش نظریہ ہے کہ مکلفین پر تخفیف ہو اور احکامِ شریعت میں سہولت کا پہلو نمایاں رکھا جائے۔ تاکہ اُن پر عمل کا داعیہ باقی رہے اور بندگانِ خدا کی زندگی مشقت سے محفوظ رہ سکے۔ مثال کے طور پر جو شخص کسی وجہ سے پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو یا پانی ناپید ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز ہے۔ ارشاد باری ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى

اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔ (النساء۔۴۳)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ،جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو ۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ غسل نہ کرلو، اِلّا یہ کہ راستہ سے گزرتے ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو ، یا سفر میں ہو ،یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے ، یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو ، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو ، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے"۔

اسی طرح قرآنِ کریم میں نص جلی کے ساتھ مردار کھانے کی حرمت وارد ہوئی ہے لیکن آگے چل کر حالتِ اضطرار میں اس کے استعمال کی رخصت بھی دی گئی ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (البقرہ۔۱۷۳)

"اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو ،اور کوئی ایسی چیز نہ کھائو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو ، یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے ، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

مذکورہ بالا دونوں مثالوں جیسی بے شمار مثالیں ہیں جو اسلامی شریعت میں رخصتوں کے ضمن میں آتی ہیں۔ بندگان خدا کے لیے سہولتوں کی فراہمی کا اہتمام اور رُخصتوں کی مشروعیت ایک ایسا اسلامی اُصول ہے جس کی تائید قرآن و سنت کی لا تعداد نصوص کی واضح دلالت سے ہوتی ہے۔

ۣ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ
(البقرہ۔۱۸۵)

"اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا"۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔ (الحج۔۷۸)

"اُس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

علیکم برخصة الله التي رخص لکم۔**(مسلم حدیث ۱۱۱۵، سنن نسائی حدیث ۲۲۵۸ مع تصحیح البانی)**

"تم لوگ اللہ کی عطا کردہ رخصتوں پر عمل پیرا ہونے کو لازم پکڑو"۔

قرآن و سنت میں وارد اس قسم کی آیات و احادیث کی روشنی میں علمائے دین نے ایسے متعدد شرعی قواعد کا استنباط کیا ہے۔ جو اسلام کی کشادگی اور عدل پروری کی جیتی جاگتی دلیل ہیں۔ گو کہ ان قواعد کی حیثیت قانون کی نہیں ہے۔ تاہم وہ علماء اہل قضا اور وکلا حضرات کو قانون کی تہہ اور تطبیق کے سلسلے میں کافی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ متعدد اہل علم نے ان شرعی قاعدوں کو مختلف تاریخی ادوار میں مستقل تصانیف کا موضوع بنایا ہے۔ زیر بحث موضوع سے تعلق رکھنے والے چند شرعی قواعد کا یہاں ہم طوالت کے خوف سے مختصراً ذکر کیے دیتے ہیں :

اَلاُمُورُ بِمَقاصِدِھَا۔ اُمور مقاصد کے مطابق ہیں۔

المشقۃ تجلب التیسیر۔ مشقت کا وجود آسانی لاتا ہے۔

الحرج مرفوع۔ حرج کا ازالہ ضروری ہے۔

اذا ضاق الامر اتسع۔ جب کسی کام میں تنگی پیدا ہو جائے تو اس میں رخصت دی جائے گی۔

الضرورات تبع المحظورات۔ ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتی ہیں۔

الحاجۃُ تنزِلُ منزلۃ الضرورۃِ عامۃ او خاصۃ۔

حاجت عام ہو یا خاص ضرورت کی قائم مقام بن جاتی ہے۔

ما اُبیح للضرورۃ یقدر بقدرھا۔

جو چیز ضرورت کی بنا پر جائز کی گئی ہو اُس کا جواز ضرورت کی مقدار کے مطابق ہی رہے گا۔

ان تکون الضرورۃ قائمۃ لا مقدرۃ۔

وہ ضرورت (جس کی بنا پر استثناء حاصل کیا جا رہا ہے) وہ فی الوقت موجود ہو۔(یہ نہ ہو کہ اُس کے وجود کی محض توقع ہو)۔

الاضطرار لا یبطل حق الغیر۔

کسی ایک انسان کے اضطرار کی وجہ سے دوسرے انسان کا حق باطل نہیں ہو سکتا۔
لا ضرر ولا ضرار۔ نہ نقصان اُٹھایا جائے اور نہ کسی کو پہنچایا جائے۔
الضرر یزال۔ متعدی ضرر کا ازالہ کیا جائے گا۔
الفسد لا یزال بالضرر۔ ضرر کو اُسی طرح کے ضرر سے دور نہیں کیاجائے گا۔
الضرر یُدفَعُ بقدرِ الامکان۔ ضرر کو بقدر امکان دور کیا جائے گا۔
درو المفاسد اولی من جلب المنافع۔ مفاسد کو دور کرنا حصولِ منفعت پر مقدم ہے۔

مذکورہ بالا آیات، احادیث اور معتبر شرعی قواعد سے ایک طرف جہاں اسلامی شریعت کے عمومی مزاج کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاملاتِ زندگی میں مشقتوں پر سہولتوں کی ترجیح اور رُخصتوں کی فراہمی کا پہلو کسی بھی انسانی نظام حیات کے لیے ناگزیر ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ دین فطرت اسلام نے اس پہلو کی کماحقہ، رعایت کی ہے۔(رفع الحرج فی الشریعہ الاسلامیہ، ضوابط و تطبیقات ڈاکٹر صالح بن حمید صفحہ ۹۳ بحوالہ فقہی رخصتوں پر عمل وسیع المشربی یا بے دینی؟ ذکی الرحمان غازی ترجمان القرآن لاہور جنوری ۲۰۱۲)

رخصت کی اقسام:

۱۔حرام فعل ضرورت کے وقت جائز کرنا:

جیسے شدید بھوک میں مردار کا گوشت کھانا اور شدید پیاس میں شراب پینا۔
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ **(البقرہ۔۱۷۳)**
"ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو ، یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے ، تو اس پر کچھ گناہ نہیں"۔
ارشاد ہے:
وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۔ (سورہ الانعام آیت نمبر۱۱۸)

"حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے اُن کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ جبر اور حالتِ اضطرار میں ان چیزوں کی حرمت باقی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سخت بھوک کی حالت میں صبر کرے یہاں تک کہ وہ بھوک کی شدت سے مر جائے۔ تو یہ گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بچانا زیادہ ضروری ہے ۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ڔ وَاَحْسِنُوْا ڔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔

(البقرہ۔۱۹۵)

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے"۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۣاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔

(النسآء۔۲۹)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ، آپس میں ایک دُوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ ،لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضا مندی سے۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اُوپر مہربان ہے"۔

یا اگر کسی شخص کو کفر کے کلمات کہنے پر مجبور کیا جائے۔ اور نہ کہنے پر قتل کی دھمکی دی جائے تو اگر اُس کا دل ایمان پر قائم ہو تو اُس وقت کفر کے کلمات کہنا اُس کے لیے جائز ہے۔ ارشاد ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل آیت ۱۰۶)

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضا مندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

۲۔ <u>کسی فرض کو ترک کرنے کی اجازت</u>:

جیسے رمضان میں مسافر اور مریض کو مشقت دور کرنے کی غرض سے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے ۔ ارشاد ہے :

وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَ يَّامٍ اُخَرَ۔ **(سورہ البقرہ ۔۱۸۴)**

" اگر تم میں سے کوئی بیما ر ہو ، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے"۔

۳۔لوگوں کی عام ضرورت کی بنا پر:

ایسے معاملات کی اجازت جن کی لوگوں کو ضرورت پیش آئے۔ حالانکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے شریعت کے عام قواعد سے ہٹ کر ہوں۔ جیسے بیع سلم یعنی مشتری (خریدار)کسی چیز کی قیمت پہلے ادا کرے اور ایک مدت کے بعد وہ اس چیز کو لینے کا بائع (بیچنے والا) سے معاہدہ کرے۔ شارع نے اس کی اجازت دی ہے۔ حالانکہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم کی بیع باطل ہے۔ لیکن شارع نے لوگوں کی آسانی اور سہولت کے پیش نظر خرید و فروخت کے عام قواعد سے اس کو مستثنٰی کر دیا۔ اور اس کی اجازت دے دی۔ اس طرح آرڈر پر کوئی چیز بنوانا (عقد استضاع)۔ لوگوں کی ضرورت کی بنا پر شارع نے اس کی اجازت دی ہے۔ حالانکہ یہ ایک معدوم کی بیع ہے۔ اگر اُن کو اس سے منع کیا جاتا تو اس میں تنگی اور حرج ہوتا۔

احکام کے اعتبار سے رخصت کی قسمیں:

احکام کے اعتبار سے رُخصت کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔رخصتِ واجب:

یہ کہ رُخصت پر عمل کرنا واجب ہو۔ اگر وہ رخصت سے فائدہ نہ اُٹھائے تو گناہ گار ہوگا۔ جیسے حالتِ اضطرار میں خنزیر وغیرہ کے کھانے کی اجازت۔ اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

۲۔رخصت اختیاری:

وہ رخصت ہے کہ جس میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے جیسے کسی شخص کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور قتل کرنے کی دھمکی دی جائے اگر اُس کا دل ایمان پر قائم ہو تو اُس کو کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔

۳۔خلاف اُولیٰ رخصت:

وہ رخصت جس میں رخصت سے فائدہ اُٹھانا مستحب اور اولیٰ طریقہ کے خلاف ہو جیسے مسافر کیلیے رمضان میں افطار کی اجازت۔

۴۔مستحب رخصت:

وہ رخصت جس سے فائدہ اُٹھانا مستحب اور بہتر ہے مثلاً جس شخص کو سفر کی وجہ سے روزہ میں مشقت ہو رہی ہے اس کے لیے روزہ افطار کر لینا۔

رخصت و تخفیف کی سات صورتیں:

رخصت کا بنیادی مقصد احکام میں تخفیف اور سہولت پہنچانا ہے۔ اس تخفیف اور سہولت کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ پس ان نوعیتوں کے لحاظ سے اس کی سات صورتیں ہیں۔

۱۔ تخفیف اسقاط:
کوئی حکم بالکل ہی ساقط اور معاف کر دیا جائے۔ جیسے بیماری کی وجہ سے جماعت اور جمعہ کے وجوب کا ختم ہو جانا۔
۲۔ تخفیف تنقیص:
واجب کی مقدار میں کمی کر دی جائے جیسے چار رکعت نماز سفر میں دو رکعت ہو جاتی ہے ۔
۳۔ تخفیف ابدال:
ایک حکم کی جگہ دوسرا آسان حکم دے دیا جائے جیسے وضو اور غسل کی جگہ تیمم۔مریض کے لیے نماز میں قیام کی جگہ بیٹھنے کی اجازت۔
۴۔ تخفیف تقدیم:
آسانی کے لیے کسی عمل کو مقررہ وقت سے پہلے جائز کر دیا جائے جیسے سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت اور عرفات میں ظہر کے وقت نماز عصر کی ادائیگی۔
۵۔ تخفیف تاخیر:
کسی کام کو مقررہ وقت کے بعد کرنے کی اجازت دے دی جائے جیسے مزدلفہ میں مغرب کی نماز کی عشاء کے وقت ادائیگی۔ مریض اور مسافر کے لیے رمضان کے بعد روزوں کی قضا کرنے کی اجازت۔
۶۔ تخفیف ترخیص:
مانعت کا سبب موجود ہونے کے باوجود سہولت کی خاطر ممانعت کا حکم نہ لگایا جائے جیسے نجاست کی تھوڑی سی مقدار سے درگزر اور اس کے باوجود نماز کا صحیح ہونا۔
۷۔ اصل حکم کو باقی رکھتے ہوئے کیفیت میں تبدیلی پیدا کر دی جائے جیسے خوف کی حالت میں نماز پڑھی جائے گی لیکن کیفیت بدل جائے گی۔

رخصت کے اسباب:

رخصت و سہولت کے اسباب کیا ہیں۔ ان کو قطعی طور پر متعین کرنا دشوار ہے۔ البتہ عام طور پر مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔ جو رخصت کا باعث بنتے ہیں۔
۱۔ بیماری۔ ۲۔سفر۔ ۳۔اکراہ یا جبر۔ ۴۔نسیان اور خطا۔ ۵۔ عُسر۔ ۶۔عموم بلویٰ۔۷۔نقص یاخامی۔

۱۔بیماری
اس سبب کے تحت کئی احکام آتے ہیں۔ اگر بیماری ایسی ہو کہ پانی کو ہاتھ لگانے سے جان کا خوف ہو تو وضو کے بجائے تیمم کر لینا جائز ہے۔ فرض نماز بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہے۔ رمضان کے روزے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ حج کے لیے کسی دوسرے شخص کو نائب بنایا جا سکتا ہے جب کہ وہ شرطیں پوری ہوتی ہوں جن کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔ احرام حج کے دوران ممنوع کام فدیہ ادا کر دینے کے بعد مباح ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر کے لیے مرد اور عورت کے پوشیدہ حصوں کو بقدر ضرورت دیکھنا جائز ہوتا ہے۔ اور ایک قول کی رُو سے نجس چیزوں اور شراب کو دوا میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۲۔سفر:
اس سے متعلق بھی متعدد احکام وارد ہیں۔ چنانچہ حالتِ سفر میں چار رکعتوں کی نماز میں قصر کیا جاتا ہے۔ رمضان میں روزے ترک کیے جا سکتے ہیں۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں چھوڑی جا سکتی ہیں۔

۳۔اکراہ:(Coercion)
اگر انسان کسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں ہو تو اس کی وجہ سے بھی بعض احکامِ شرعیہ میں تحفیف ہو جاتی ہے۔جبر و اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر کہنے کی اجازت کی مثال ہم پہلے دے چکے ہیں۔

۴۔نسیان اور خطا:
حقوق اللہ کے معاملے میں قابل لحاظ عذر ہے۔ چنانچہ نسیان کی وجہ سے گناہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس طرح حکم کے فراموش ہو جانے کا محرک موجود ہو تو حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ جیسا کسی روزے دار کا بھول چوک کے ساتھ کھانا کھا لینا یا جانور کو ذبح کرتے ہوئے تسمیہ بھول جانا۔ لیکن اگر یاد دلانے والا پاس موجود ہو اور ترکِ حکم کا محرک بھی نہ ہو تو پھر حکم ساقط نہیں ہوگا۔ جیسے نمازی کا حالتِ نماز میں کوئی چیز کھا لینا۔ لیکن حقوق العباد میں نسیان کا عذر معتبر نہیں ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص بھول کر کسی شخص کا مال تلف کردے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ تمام فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ چند ایسے مسائل ہیں جن میں نسیان کی وجہ سے معافی نہیں ہوگی مثلاً محدث (بے وضو) اگر بعض اعضا کو دھونا بھول جائے تو وضو قابل اعتبار نہ ہوگا۔ یا قاضی نصِ شرعی کو بھول جائے اور قیاس کی بنا پر کوئی فیصلہ کردے۔ تو اس کا یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا۔ خطا کے سلسلے میں مثال یہ ہے کہ قتل خطا کی جو سزا رکھی گئی ہے اُس میں قتل عمد کی نسبت بڑی تخفیف موجود ہے۔

۵۔**عُسر**: (Difficulty)

اس کی مثالیں یہ ہیں:۔قابل معافی نجاست کے ساتھ نماز کا صحیح ہونا۔ اور حائضہ عورتوں کے لیے نمازوں کی قضا کا واجب نہ ہونا کیونکہ اسے باربار ان ایام سے سابقہ پیش آتا ہے مگر روزوں کے بارے میں یہ اجازت نہیں ہے (کیونکہ وہ سال میں ایک بار آتے ہیں) سال بھرمیں صرف ایک مہینے میں روزے فرض ہیں۔ حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ اور زکواۃ مال کا صرف چالیسواں حصہ ہے۔ان تمام اُمور میں تنگی کو رفع کیا گیا ہے۔ اور سہولت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ گواہ اور طبیب کو عورت پر نظر ڈالنے کی اجازت ہے۔ نیز منگنی (خطبہ) کے وقت مرد کے لیے عورت کو دیکھ لینا مباح ہے۔

مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے اور صرف ایک بیوی پر اکتفا لازم نہیں کیا گیا ہے۔ اس حکم میں ایک طرف مرد کے لیے تیسر کا اُصول ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور دوسری طرف خود اُمت کی اس مصلحت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اگر حالات افزائش نسل کا تقاضہ کرتے ہوں تو اس حکم سے استفادہ کیا جائے۔ نیز اگر معاشرے کے اندر عورتوں کی کثرت ہو تو خود عورتوں کے لیے بھی سہولت اس میں ہے کہ تعدد ازدواج کا راستہ کھلا رہے۔ مگر ہر حالت میں مرد کو چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اس میں مرد کے لیے عدل و انصاف اور تقسیم اموال وغیرہ میں غیر معمولی مشقت پائیٔ جاتی ہے۔

اس اصول کی ایک مثال یہ ہے کہ قسم کے کفارہ میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا اُنہیں کپڑا پہنایا جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے۔ یہ اختیار اس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ قسم کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔اور اس کا کفارہ بھی ہر بار لازم آتا ہے۔مگر دوسرے کفاروں میں یہ اجازت نہیں ہے۔ کہ وہ بہت نادرالوقوع ہوتے ہیں۔

۶۔**عموم بلویٰ (عام آزمائش):**

اس کے اندر تیسر کی مثال یہ ہے کہ مجتہدین کے لیے اجتہادی غلطی کا گناہ ساقط کر دیا گیا ہے۔اور اُن سے صرف ظن کی بنا پر رائے قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر اُنہیں یقین کے ساتھ حکم لگانے کا پابند کیا جاتا۔ تو ان کے لیے امر یقین تک پہنچنا دشوار ہوتا۔

(شریعت اسلامی کے بنیادی ضابطے از احمد حسن مصری ترجمان القرآن لاہورجولائی ۱۹۷۰)

۷۔نقص یا خامی کا وجود:
کسی انسان کے اندرفطری نقص پایا جانا بجائے خود مشقت کی ایک قسم ہے مثلاً بچپن۔وہ تمام اُمور جو ایک نابالغ سے ساقط ہونے کا احتمال رکھتے ہوں، بچے سے ساقط ہونگے۔
دیوانگی: اس سے تمام عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔
نیند:
انسان نیند کی حالت میں قدرت عمل سے عاجز ہوتا ہے اس لیے وہ کسی شرعی حکم کا پابند نہیں ہے۔ البتہ اس حکم کا وجوب قائم رہتا ہے۔
بے ہوشی:
اس کا بھی یہی حکم ہے اگر یہ حالت طویل ہو جائے تو بعض فرائض کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے۔(قواعد کلیہ حصہ اول ڈاکٹر محموداحمد غازی صفحہ ۵۲)

فقہا کے ہاں ان اسباب کے تحت پیدا ہونے والی رخصتوں کے سلسلہ میں بے شمار جزئیات موجود ہیں۔ اور یہ سب شریعت کے اس بنیادی مزاج پر مبنی ہے کہ وہ انسان کے لیے ناقابل برداشت اور تکلیف و حرج پر مبنی احکام نہیں دیتی۔
۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔ (الحج:۷۸)
"اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی "۔
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔ (البقرہ۔۱۸۵)
"اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے ، سختی کرنا نہیں چاہتا"۔

آسانی (سہولت) اور عدم حرج میں فرق ہے:
مثال کے طور پر آسانی(سہولت) ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے سال میں صرف ایک ماہ (رمضان) کے روزے فرض کیے ہیں۔ عدم حرج یہ ہے کہ اگر رمضان کے مہینے میں بھی کوئی بیمار ہے یا مسافر ہو تو اُسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے بعد میں جب چاہے اپنے چھوٹے ہوے روزوں کی قضا کرے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے :
اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَ يَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔
(البقرہ۔۱۸۴)

"چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیما ر ہو ، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے ، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو ، تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو"۔

<u>گویا پہلے سے کسی حکم میں جو آسانی رکھی گئی ہے وہ سہولت ہے اور اس پہلے حکم پر عمل کے وقت کوئی دشواری یا تنگی پیش آگئی تو مزید رخصت دے دی گئی اور یہی عدم حرج ہے</u> اور یہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

<u>دین میں حرج نہیں ہے:</u>

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَحَبُّ اَلادیانِ اِلیَ اللہِ الحنیفیۃُ السَّمحَۃُ۔ (بخاری)

"اللہ کے ہاں بہترین دین وہ ہے جس میں حنیفیت اور آسانی ہو "۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب بھی دو اُمور کے بارے میں اختیار دیا جاتا تھا تو آپ ﷺ اُن میں سےآسان پہلو کو چُن لیتے تھے ماسوائے اس کے کہ وہ کوئی گناہ کا معاملہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے۔ (احمد۔ابن حبان، بیہقی)

آپ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ افطاری میں جلدی کی جائے اور سحری میں تاخیر کی جائے۔ اس کا مقصد بھی روزہ دار کے لیے آسانی پیدا کرنا ہی ہے۔

آپ نے مسجد کے اماموں کو حکم دیا تھا کہ وہ مقتدیوں کے لیے آسانی پیدا کریں کیونکہ اُن میں کمزور بھی ہوتے ہیں۔بزرگ بھی اور اصحاب حاجت بھی۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابی ابن کعب کو لوگوں کی شکایت پر نماز میں لوگوں کے مختلف حالات کا لحاظ کیے بغیر لمبی قرأت پر نکیر فرمائی تھی۔باوجود یہ کہ آپ ان دونوں سے بہت محبت کرتے تھے۔

آپ کے خادم اور ساتھی حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔‘‘آپ ﷺ اگر (نماز کے دوران) بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر کر دیتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے (متفق علیہ)

یہ اور اس طرح کی دوسری متعدد روایات کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ آسان راہ اُن اُمور میں اختیار فرماتے جو ذاتی، اختیاری اور ثواب میں برابر ہوتے تھے۔
آپ کو اختیار دیا گیا کہ رات کی تہجد کی نماز میں آپ اپنی سہولت کے مطابق رات کے جتنے حصے میں جتنی تلاوت فرمانا چاہیں۔ آپ اپنے لیے اختیار کر سکتے ہیں۔
۔آپ رمضان کے علاوہ بھی نفلی روزوں کا اہتمام فرماتے تھے۔اور آپ اپنے اختیار سے پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے۔مہینے کے درمیان میں روزہ رکھتے۔
آپ نے سفر کے دوران میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھا کہ وہ ایک آدمی پر جھکے ہوئے تھے آپ نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس نے روزہ رکھا ہے تو آپ نے فرمایا:
"سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے "۔
(متفق علیہ)
مراد اس طرح کا پُر مشقت سفر ہے لیکن اگر سفر میں اس طرح کی مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حمزہ ابن عمر و اسلمیؓ نے بنی سے پوچھا کیا میں سفر میں روزہ رکھ سکتا ہوں۔یہ اکثر اوقات روزے رکھا کرتے تھے۔نبی نے اُس سے فرمایا:
ان شئت فصم وان شئت فافطر۔ "چاہو رکھو چاہو نہ رکھو"۔
(متفق علیہ)
(دین میں ترجیحات مولانا یوسف قرضاوی صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲٤)
روز مرہ کی ہم یہ مثال دے سکتے ہیں کہ سردیوں میں وضو کے لیے گرم پانی میسر ہے۔ اور ٹھنڈا پانی بھی۔ تو اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ کس پانی سے وضو کریں۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ صرف اپنے آپ کو اس وجہ سے صعوبت میں ڈالنا کہ شاید اس سے ثواب زیادہ ہو۔ رسول کے عمل سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے۔
مزید یہ کہ سہولت کے باوجود آپ کا تکلیف اور صعوبت پر اصرار ناشکری ہے کیونکہ انسان عاجز اور کمزور ہے اور اُسے اللہ کی دی ہوئی سہولت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔نہ کہ دین کے ساتھ مقابلہ کرے کیونکہ وہ آخر میں خود ہی مات کھا جائے گا۔
ڈاکٹر عبدالکریم زیدان مشقتوں کے سلسلے میں احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ''ایسی غیر معمولی مشقت جو نفس فعل سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ مکلف خود ایسے مشقت والے افعال اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ جن کا شریعت نے حکم نہیں دیا۔ اس قسم کے افعال جائز نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ''ایک بار آنحضرت نے ایک شخص کو دھوپ میں کھڑا ہوا دیکھا۔ آپ نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اس نے یہ نذر مانی ہے کہ وہ دھوپ میں کھڑا رہے گا نہ بیٹھے گا نہ سائے میں جائے گا۔ اور ہمیشہ روزے سے رہے گا۔ آنحضرت نے فرمایا:
"اس سے کہو کہ وہ بات کرے۔بیٹھ جائے اور ایسے روزے کو ختم کر دے"۔

(ریاض الصالحین صفحہ ۹۲)

اس طرح بعض صحابہ کرام نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ وہ رات کو جاگیں گے۔ ہمیشہ روزے سے رہیں گے کبھی افطار نہیں کریں گے۔ بعض صحابہ نے عہد کیا کہ وہ بیویوں سے الگ رہیں گے اور بعض نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ ان سب سے نبیؐ نے فرمایامیں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں۔ اور چھوڑتا بھی ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے بے رغبتی کی اُس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

ان سب باتوں میں حکمت یہ ہے کہ جسم کو تکلیف پہنچانا اور بغیر کسی جائز مقصد و مصلحت کے جسم کو مشقتوں میں ڈالنا عبث ہے۔ شارع جسم کو تکلیف دینے میں کوئی مصلحت نہیں سمجھتا۔۔۔لیکن کسی مصلحت یا اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یا جائز غرض کو پورا کرنے کے لیے مشقت والے افعال کو اختیار کرنا مکلف کے لیے مباح، مستحب اور بعض اوقات واجب ہوتا ہے۔ جیسے ایثار و قربانی ایک قابل ستائش فعل ہے۔ یا آدمی ضرورت مندوں کی ضرورت پورا کرنے کے لیے اُن کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ اور خود تکلیف اُٹھائے۔ (جامع الأُصول از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۹۹)

اس سیاق و سباق میں یہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ آپ کا آسان عمل کا انتخاب اُن امور اور مواقع پر ہوتا تھا جہاں معاملہ منکرات کے سدِ باب، دشمنوں کے مقابلے میں تیاری، یا دشمن تہذیب کے جراثیم اور اس کے اثرات سے بچاؤ کا نہ ہوتا تھا۔

جہاں تک دعوت اور جہاد کا تعلق ہے تو اس میں رسول اللہ اور دیگر انبیاء کرام نے ہمیشہ عزیمت کا راستہ اختیار کیا۔اور اس کی امت کو علمی و عملی تربیت بھی دی۔جب کفار کا وفد ابوطالب کے پاس اس مقصد کے لیے آیا۔کہ آپؐ کو دعوتِ حق سے روک دیں اور طرح طرح کی ترغیبات بھی پیش کیں۔تو اُس وقت آپ نے عزیمت کی عظیم الشان

مثال قائم کی۔ جب آپ نے فرمایا کہ اگر یہ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھدیں تب بھی اس دعوت سے باز نہیں آؤنگا۔
حضرت نوح،ابراہیم، موسیٰ علیھم السلام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اُنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق اور دعوتِ حق کے لیے کتنی صعوبتیں برداشت کیں۔اور حق کے معاملے میں کوئی مصالحت نہیں کی۔
رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ کرام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت بیان فرمائی۔ کہ اُنہوں نے بادشاہ کی طرف سے رہائی کا پروانہ ملنے کے باوجود رہا ہونے سے اُس وقت تک انکار کیا جب تک کہ وہ اس بات کو صاف نہ کردیں کہ زلیخا کے بارے میں اُنہوں نے کوئی خیانت نہیں کی تھی۔ یہ اس لیے کہ پیغمبر کے کردار پر کوئی دھبہ باقی نہ رہے۔

<u>حالات کا رخصت اور عزیمت پر عمل کو متعین کرنا:</u>

رخصت میں اصل (بنیادی حکم) اباحت ہے یعنی اس میں حکم لازمی نہیں رہتا۔ بلکہ مکلف کو اس کے چھوڑنے یا کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ رمضان میں مریض اور مسافر کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ دونوں کے لیے روزہ چھوڑنا رخصت پر عمل ہے۔اگر اُن کو روزے سے کوئی نقصان نہ ہو تو روزہ رکھنا عزیمت پر عمل ہے۔
۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جبر و اکراہ یا قتل وغیرہ کی دھمکی کی صورت میں کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔اگر اُس کا دل ایمان پر قائم ہو۔ آیت قرآنی ہے:
مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (النحل۔۱۰۶)
"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو
(تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضا مندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے"۔
علماء کا کہنا یہ ہے کہ گو کہ حالتِ اکراہ میں کفریہ کلمہ کہنے کی اجازت ہے لیکن یہا ں بھی اگر عزیمت اختیار کی جائے تو بہتر ہے۔ان علماء کی دلیل وہ روایت ہے جس میں ذکر ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسیلمہ کذاب کے آدمیوں نے دو مسلمانوں کو پکڑ لیا۔ اور اُن کو اس کے پاس لے گئے۔ اُس نے ان میں سے ایک سے پوچھا ''محمد کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' اُس نے جواب دیا ''وہ اللہ کے رسول ہیں'' اُس نے پھر پوچھا ''تم میرے بارے میں کیا کہتے

ہو'' اُس نے جواب دیا ''تم بھی'' اُس نے اُس کو چھوڑ دیا اور کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر دوسرے سے رسول اللہ کے بارے میں دریافت کیا اُس نے جواب دیا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں پھر پوچھا تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو۔اُس نے کہا میں بہرہ ہوں سُنتا نہیں ہوں۔اُس نے تین بار اُس سے یہی سوال کیا اور تینوں دفعہ اُس نے یہی جواب دیا۔ اس لیے اُس نے اُس کو قتل کر دیا۔ جب رسول اللہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا''پہلے نے اللہ کی طرف سے دی ہوئی رخصت پر عمل کیا دوسرے نے کھل کر حق بات کہی۔اُس کو مبارک ہو۔(جامع الاصول از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۷۱)

سورہ النحل کی مندرجہ بالا آیت میں ان مسلمانوں کے معاملے سے بحث کی گئی ہے جن پر اس وقت سخت مظالم توڑے جارہے تھے اور ناقابل برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر محض جان بچانے کے لیے کلمہ ٔ کفر زبان سے ادا کردو، اور دل تمہارا عقیدہ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کردیا جائے گا۔ لیکن اگر دل سے تم نے کفر قبول کرلیا تو دنیا میں چاہے جان بچا لو، خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبورا ایسا کہہ دے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقام عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم تکا بوٹی کر ڈالا جائے بہرحال وہ کلمہ حق ہی کا اعلان کرتا رہے۔ دونوں قسم کی نظیریں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف خبابؓ بن ارت ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلنے سے آگ بجھ گئی، مگر وہ سختی کے ساتھ اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلالؓ حبشی ہیں جن کو لوہے کی زرہ پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کردیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا مگر وہ احد احد ہی کہتے رہے۔ حبیب بن زیدؓ بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عضو مسیلمہ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مسیلمہ کو نبی مان لیں،مگر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انہوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف عمار بن یاسرؓ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دے دے کر شہید کردیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابل برداشت اذیت دی گئی کہ آخر انہوں نے جان بچانے کے لیے ہو سب کچھ کہہ دیا جو کفار ان

سے کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے روتے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مَا تُرِکْتُ حَتّٰی سَبَبْتُکَ وَذَکَرْتُ اٰ لِھَتَھُمْ بِخَیْرٍ۔ '' یا رسول اللہ، مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا ''۔ حضور نے پوچھا کَیْفَ تَجِدُ قَلْبَکَ۔ '' اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو''؟ عرض کیا مُطْمَئِنًا بالْاِیْمَانِ۔'' ایمان پر پوری طرح مطمئن''۔ اس پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان عادُوْا فَعُدْ۔ '' اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر یہی باتیں کہہ دینا''۔(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۷۵)

<u>۔اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جبکہ قتل کا اندیشہ ہو عزیمت ہے اور یہی افضل و اولیٰ ہے</u>۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا۔ "شہدا کے سردار حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ہیں اور دوسرا وہ شخص ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق کی بات کہے اور وہ اُس کو قتل کردے"اس لیے ظالم حاکم کے سامنے کوئی حق بات کہنا اور بُرائی سے اُسے روکنا جبکہ اس کی گرفت کا اندیشہ ہو۔ سکوت سے افضل ہے۔اس لیے کہ نبی ﷺنے ایسے شخص کی شہادت کو حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے بلند درجۂ شہادت کے برابر رکھا ہے۔ (جامع الاصول از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۷۱)

<u>اُمت کا اجتماعی عمل:</u>

البتہ یہاں یہ بات قابل غور ہے۔ کہ نقصان پہنچنے کے اندیشے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑنا رُخصت ہے۔ جیسے کوئی حاکم ظالم ہو اور وہ نصیحت کرنے والے کو یا منع کرنے والے کو قتل کر دیتا ہو۔ لیکن جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ ایسے موقعوں پر بھی عزیمت کو اختیار کرنا افضل و اولیٰ ہے۔ کیونکہ رخصت کا یہ حکم جز کے بارے میں ہے کل کے بارے میں نہیں۔ یعنی فرد کے ساتھ مخصوص ہے اُمت کیلیے نہیں ہے۔ اس لیے جائز نہیں ہے کہ پوری اُمت ایک ظالم بادشاہ کے خوف سے ڈرکر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کر دے۔ کیونکہ یہ ایک فرضِ کفایہ ہے اس لیے اُمت میں اس کا وجود ضروری ہے۔ اگرچہ جان کَا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے جہاد فرضِ کفایہ ہے اور اس فریضے کی ادائیگی ضروری ہے چاہے اس میں کتنی ہی جانیں تلف ہوں۔

<u>احکام رخصت و عزیمت کی شرائط:</u>

اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کن حالات میں کن شرائط کے تحت شریعت کے احکام رُخصت و عزیمت پر عمل کیا جائے۔ اہل علم نے ان شرائط کو یوں بیان کیا ہے۔

١۔ رخصت پر عمل کرنے کے لیے کسی شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔
٢۔ عزیمت پر عمل کرنے سے کوئی عذر شرعی مانع ہو۔
مشہور عالم یوسف حامد العالم کے نزدیک رخصت کسی مشقت کی وجہ سے اصلی حکم میں استثنا کی صورت ہے۔ اور صرف ضرورت تک محدود ہوتی ہے۔ مشقت سے متعلق ہونا اسے عزیمت کے حکم سے ممیز کرتا ہے۔ اگر کوئی حکم مشقت سے وابستہ نہیں بلکہ محض لوگوں کی ضرورت اور حاجت کے پیش نظر اصلی حکم کے برعکس مقرر کیا گیا ہے۔تو وہ رخصت نہیں ہے۔ مثلاً بیع سلم (جو ضرورت کی بنا پر مشروع ہے) علماء اصول کے نزدیک رخصت نہیں ہے۔ رخصت کے استثنائی حکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصلی کلی حکم موجود رہتا ہے۔ اور صرف رخصت کی صورتیں اس سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ لوگوں کی ضرورتوں اور حوائج کے پیش نظر اصلی کلی حکم کے برعکس حکم دینا اور مشقت کے پیش نظر استثنائی حکم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ استثنائی حکم ابتدائی حکم نہیں ہے۔ نیز رخصت ضرورت تک محدود رہتی ہے۔ جب کہ عام ضرورت کے پیش نظر احکام ہر حالت میں برقرار رہتے ہیں۔ مثلاً بیع سلم اور قرض کے معاملات۔ پس عزیمت کا تعلق ابتدائی اصلی اور کلی حکم سے ہے اور رخصت اصلی کلی اور ابتدائی حکم سے ایک جزوی استثنا ہے۔
(اسلامی شریعت، مقاصد اور مصالح ۔یوسف حامد العالم صفحہ ٣٤)۔

ضرورت اور حاجت میں فرق:

چونکہ آگے انسانی زندگی کی امکانی حالات کی تین صورتیں (عمومی حالات، حاجات کے حالات اور ضرورت کے حالات)کے تحت رخصتوں کا بیان ہوگا۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ یہاں ہم رخصتوں کے ضمن میں حاجت اور ضرورت کے درمیان جو فرق ہے اُس کی وضاحت کر دیں تاکہ مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

ضرورت اور حاجت دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ ضرورت سے مراد نہایت شدید ضرورت (Dire need)ہے جب کہ حاجت کا درجہ اس سے کم ہے۔ حاجت سے مراد وہ ضرورت ہے جسے پورا نہ کرنے سے تنگی، مشکل اور دِقّت تو پیدا ہو لیکن شریعت کے پانچ مقاصد میں سے کوئی مقصد کلی طور پر ضائع نہ ہو۔ اس کے برعکس ضرورت پورا نہ کرنے کی صورت میں جان و مال کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ضرورت اور حاجت میں بعض فرق بہت اہم ہیں:-

-ضرورت کے تحت جب حرام چیز حلال ہوتی ہے تو اس میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ضرورت کی یہ کیفیت ایک فرد کو لاحق ہے یا بہت سے افراد کو۔ جس کو بھی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس کے لیے حرام چیز حلال ہو جاتی ہے۔لیکن حاجت کے لیے یہ کافی نہیں ہے جس حاجت کو ضرورت کا قائم مقام قرار دے کر سہولت و تخفیف حاصل کی جائے۔ وہ وہی ہے جو بہت سے افراد کی جماعت کو پیش آئے۔ اگر وہ حاجت ایک آدھ شخص یا معمولی تعداد کو پیش آرہی ہو تو نہ اُس کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے۔ اور نہ اس کی بنیاد پر کسی استثنائی سہولت و تخفیف کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضرورت ایک تو بہت شاذ و نادر پیش آتی ہے اور دوسرے اس کی وجہ سے لوگوں کوجان و مال کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جسے روکنے کے لیے شریعت آئی ہے۔ اس کے برعکس حاجت ہر شخص کو روز پیش آتی رہتی ہے۔ چونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص کے لیے ہر وقت الگ الگ قانونی گنجائش رکھی جائے۔ اس لیے حاجت صرف وہی معتبر ہے۔ جو لوگوں کی بڑی تعداد کو درپیش ہو۔

-ضرورت کے پیش نظر جو تسہیلی (آسان) اور تخفیفی (خفیف)حکم آتا ہے وہ استثنائی ہوتا ہے۔ اس لیے بہت تھوڑے وقفے کے لیے ہوتا ہے۔جونہی ضرورت ختم ہو جاتی ہے وہ استثنائی حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس حاجت کی نوعیت عمومی اور دائمی قسم کی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ تھوڑے وقفے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ طویل عرصے کے لیے ہوتی ہے۔

-ضرورت کی وجہ سے ملنے والی سہولت اور رخصت صرف اضطرار کے شکار شخص کو ملتی ہے اور دوسرا شخص اس سہولت اور رخصت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ حاجت کی وجہ سے ملنے والی سہولت سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے چاہے وہ حاجت مند ہو یا نہ ہو۔

(علم اصول فقہ ایک تعارف از ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلّوں حصہ اول صفحہ ۴۰۸ تا ۴۰۹)

رخصت کے ضمن میں انسان کی تین حالتیں ہیں:

۱۔ انسان آسانی اور کشائش کے حالات میں ہوتا ہے۔یا
۲۔ تنگی، حرج اور مشکل حالات میں یا
۳۔ شدید ترین مجبوری کی حالت میں۔

ہر حالت کے لیے شارع نے الگ الگ احکام اور قواعد و ضوابط مقرر کیے ہیں۔ تاکہ انسان کو مفادات حاصل ہوں اور وہ واقعی یا متوقع

نقصان سے بچ سکے۔ نیز جب حالات کا تقاضا ہو تو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو سکے۔
معمول کی حالت آسانی، کشائش اور وسعت و کمال کی ہوتی ہے۔ جس میں شریعت کے عام قوانین منطبق اور نافذ ہوتے ہیں۔
اس کے بعد تنگی، حرج اور مشکل حالات کا مرحلہ ہے۔ جو شدید مجبوری سے کم تر درجہ ہے لیکن حاجت کا درجہ ہے انسان جان اور جسمانی اعضاء کو خطرات سے بچانے کے لیے پہلی حالت سے اس حالت میں منتقل ہو سکتا ہے (یعنی ان حالات کے لیے شریعت نے جو مخصوص احکام دئیے ہیں اُن پر عمل کر سکتا ہے)
اس کے بعد شدید مجبوری کی حالت ہے جو انتہائی تنگی، حرج اور شدت کا درجہ ہے۔ انسانی جان کی سلامتی کی خاطر نیز خطرے اور ضرر سے بچنے کیلیے دوسری حالت سے اس حالت میں منتقل ہو سکتا ہے (یعنی اس حالت کے مخصوص احکام پر عمل کرے گا)
ان تینوں صورتوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی صورت۔عام حالات:

اس حالت میں انسان معمول کے مطابق زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور اُس کو آسانی اور کشائش مہیا ہوتی ہے۔ اس لیے اُسے اُن اشیاء اور افعال پر اکتفا کرنا ہوگا جو مباح ہیں اور جو اُمور واجب ہیں اُن کی پابندی کرنا ہوگی۔ اور حدود سے تجاوز کی اجازت نہ ہوگی۔ جس کسی نے حدود سے تجاوز کیا اُس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ ارشاد ربانی ہے:
وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (سورہ الطلاق آیت نمبر ۱)
"جس نے اللہ کی حدودسے تجاوز کیا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا "۔
اس صورت میں انسان سے مطلوب ہے کہ وہ عبادات کے تمام واجبات ادا کرے۔ جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے اُنہیں حرام سمجھے۔ اس حالت میں انسان کو حلال اور حرام کے درمیان جو مشتبہ اُمور ہیں اُن میں واقع ہونے سے خبردار کیا گیا ہے۔ایسی چیزیں جو قطعی طور پر حلال یا حرام نہیں ہیں اُن کے بارے میں محتاط رہنے کا حکم ہے۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
‘‘فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ، فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَلِعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ، كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ۔
"جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ حرام میں مبتلا ہو سکتا ہے جیسے وہ چرواہا جو اپنا ریوڑ چراگاہ کے آس پاس چراتا

ہے اس کے جانور کسی بھی وقت چراگاہ میں منہ مار سکتے ہیں) ایسے تمام حالات میں لوگوں پر شریعت کے عام قوانین نافذ ہوتے ہیں"۔

دوسری حالت: بوقتِ حاجت:

انسان تنگی، حرج اور مشکل میں مبتلا ہو لیکن شدید مجبوری کی حالت نہ ہو بلکہ حاجت کے مرحلے میں ہو۔ جیسے ایک شخص بھوکا ہے لیکن اتنا بھوکا نہیں کہ کھانا نہ ملنے سے مرجائے گا۔ البتہ کھانا نہ ملنے سے اُسے تکلیف اور پریشانی ہوگی۔

(السیوطی۔الاشباہ و النظائر۔85)

اس حالت میں اللہ نے بعض رخصتیں دی ہیں۔ رخصتیں مشقت ختم کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ مشقتوں کی دو قسمیں ہیں:

۱۔وہ مشقتیں جو ہر عبادت میں لازمی طور پر پائی جاتی ہیں۔

مثلاً :سخت سردی میں وضو اور غسل کی مشقت۔ سردی اور گرمی میں نماز کی مشقت بالخصوص صبح کی نماز اور ظہر کی نماز۔ گرمی اور طویل دنوں میں روزے کی مشقت۔ جہاد فی سبیل اللہ کی مشقت۔ بدکاروں پر رجم کی مشقت۔ یہ بہت بڑی مشقت کی بات ہے لیکن شارع کی نظر میں اس مشقت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔(اُن پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔(سورہ النور آیت نمبر ۲)

یہ اس نوع کی مشقتیں ہیں جن کی وجہ سے نہ عبادات معاف ہوتی ہیں نہ سزائیں، اور نہ ان میں کوئی تخفیف ہوتی ہے۔ اگر ان مشقتوں کو موثر مان لیا جائے تو تمام اوقات میں یا اکثر اوقات میں عبادات کی مصالح بالکل ختم ہو جائیں اور سزاؤں کی شرعی حکمت بھی ختم ہو جائے۔

۲۔ دوسری قسم کی مشقت وہ ہے جو بالعموم عبادات میں نہیں ہوتی۔ اس کی کئی قسمیں ہیں:

(أ) کوئی ایسی سخت مشقت جس کے نتیجے میں جان یا کوئی عضو بدن ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا کوئی عضو ناکارہ ہونے کا خطرہ ہو۔ اس نوع کی مشقت باعث تخفیف اور موجب رخصت ہوتی ہے۔

(ب) جسم کے کسی ایک عضو مثلاً انگلی میں درد، سر درد یا طبیعت کی خرابی۔ یہ ایسی مشقت ہے کہ اسے اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ نہ تو تخفیف کا موجب ہے نہ عبادت کی معافی کا۔

(ت) وہ مشقتیں جو ان دونوں مشقتوں کے درمیان ہوں اور شدت یا نرمی کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ جو مشقتیں پہلی قسم کے قریب ہوں اُن میں تخفیف ہوگی اور جو دوسری قسم کے قریب ہوں گی اُن

میں تخفیف نہیں ہوگی۔ مشقت کی اس تقسیم کی روشنی میں تخفیف دو قسموں میں منقسم ہو جائے گی۔
ایک وہ تخفیف جو حاجت کے درجے میں ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ جو ضرورت کے درجے میں ہوتی ہے۔

عبادات میں حاجت کے درجے میں تخفیف کی مثالیں:

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر تخفیف کرتے ہوئے مختلف عذروں کی وجہ سے جمعہ، حج، عمرہ اور جہاد معاف کر د ہیں۔ عذرکے باعث وضو اور غسل کو تیمم میں بد ل دیا ہے۔نماز میں قیام کو بیٹھ کر، لیٹ کر، اور اشاروں سے نماز ادا کرنے میں تبدیل کر دیا ہے۔روزے میں تخفیف کرکے اسے فدیئے کے طور پر کھانا کھلانے میں بدل دیا ہے۔ اور دو نمازوں کو مقدم و موخر کرکے جمع کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ وہ سب اُمور ہیں جن میں اللہ نے مکلف سے مشقت اور حرج دور کرنے کے لیے تخفیف کر دی ہے۔ لیکن یہ مشقت اس درجے کی نہیں تھی۔ جس میں جان یا اعضا کے تلف ہونے یا کسی عضو کے ناکارہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ ورنہ تخفیف حاجت کے دائرے میں نہیں رہتی بلکہ ضرورت کے درجے میں داخل ہو جاتی ہے۔
معاملات کے بارے میں فقہا ء نے کہا ہے کہ اگر بندوں پر حلال رزق کے دروازے بند ہو جائیں اور جب اُنہیں خالص حلال نہ ملے تو اُن کے لیے جائز ہے کہ مشتبہ کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔اور اپنی حاجت پوری کرلیں۔ مشتبہ اُمور اللہ کے حکم کی مخالفت کے اعتبار سے کم درجے پر ہیں۔ اور قطعی حرام کی بہ نسبت اُن کا نقصان کم ہے۔ (سیوطی: الاشباہ والنظائر۔۸۳)

تیسری حالت: ضرورت:

ضرورت کی فقہاء نے کئی تعریفیں کی ہیں۔ جو مفہوم میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔
جصاص نے مخمصہ (بھوک کی شدت) پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے ''مخمصہ کھانا چھوڑنے کی وجہ سے ضرر یا ہلاکت یا بعض اعضا کے ناکارہ ہو جانے کے خوف کو کہتے ہیں۔ بزدوی نےمخمصہ کی حالت میں ضرورت کا معنیٰ یوں بیان کیا ہے ''اگر کچھ نہ کھایا تو جان جاتی رہے گئ، یا کوئی عضو ناکارہ ہو جائے گا۔ حنابلہ کے نزدیک ''جس ضرورت کے تحت حرام مباح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر نہیں کھائے گا تو جان ضائع ہونے کا خوف ہے۔ ''زرکشی اور سیوطی کے نزدیک ضرورت کی تعریف یوں ہے۔ '' اس حدکو پہنچ جانا کہ اگر کوئی ممنوع چیز استعمال نہ کی تو ہلاکت کا خوف خواہ

یقینی ہو یا ہلاکت کا غالب گمان ہو۔ یا موت کا خوف ہو اس میں ضروری نہیں کہ صبر کرے تا آنکہ نزع کا عالم شروع ہو جائے بلکہ ہلاکت کا خوف ہی کافی ہے خواہ ظن غالب کی بنا پر ہو۔''

جناب اُستاد زرقا نے ضرورت کی تعریف یوں کی ہے۔

''ضرورت حاجت سے شدید تر ہوتی ہے۔ ضرورت وہ کیفیت ہے کہ اگر اس کے تقاضے پر عمل نہ کیا جائے تو خطرہ ہوتا ہے جیسے ایسی زبردستی جس میں جان کا خطرہ ہو، یا بھوک کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہو۔''

مندرجہ بالا تعریف اور اسی طرح دوسرے فقہا کی تعریف صرف غذائی ضرورت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے تقریباً نا مکمل ہیں اور ضرورت کے کامل مفہوم پر مشتمل نہیں ہیں۔ یہ تعریفیں ضرورت کی اس عام بنیاد کا تعین نہیں کرتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان معمول کی حالت سے ہنگامی حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اصل حکم کے بجائے ہنگامی حکم کے تحت کوئی کام کرتا یا چھوڑتا ہے۔ تاکہ اُن خطرات اور نقصانات سے بچ سکے جو اس کی زندگی یا اعضاء کو درپیش ہیں۔

ضرورت اپنے جامع مفہوم میں یہ ہے کہ

''انسان کو خطرے یا شدید مشقت کی ایسی حالت پیش آجائے جس سے جان کو ،اعضاء کو، اعضاء کے منافع کو، یا عزت کو شدید ضرر یا اذیت کا خوف لاحق ہو۔ اس صورت حال میں یہ متعین ہو جاتا ہے کہ انسان پہلی اور دوسری حالت سے تیسری حالت میں منتقل ہوتا ہے۔ اس میں حرام کا ارتکاب یا واجب کا ترک، یا واجب کا اپنے وقت سے مؤخر کرنا مباح ہو جاتا ہے۔ تاکہ شرعی قواعد و ضوابط کے حوالے سے جس ضرر کا اندیشہ ہے اُسے دور کیا جا سکے۔

(الرخل الفقهی۔۱۰۳)

ضرورت کی یہ تعریف غذا اور دوا کو بھی شامل ہے۔ دوسرے کے مال سے نفع اُٹھانے کو اور کسی کے خوف کے باعث، یا مجبور کرنے پر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کو، اپنی جان کے دفاع کو اور مقررہ شرعی واجبات کے ترک کو، یا اُنہیں اپنے وقت سے مؤخر کرنے کو، غرضیکہ سب صورتوں کو شامل ہے اور ضرورت کا یہی عام معنیٰ ہے۔

ضرورت کا سبب یا تو انسانی جان ہوتی ہے جیسے بھوک، پیاس یا جسم کو دوا وغیرہ کی حاجت ہو۔ اس حالت میں ضروری ہے کہ ضرر واقعتاً ہو یا ضرر متوقع ہو،اور کم تر نقصان کے شرعی، عقلی اور فطری قاعدے پر عمل کرتے ہوئے اس سے بچنا ضروری ہو۔ کبھی

ضرورت کا سبب زندگی کا خوف نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی طاقت ور آدمی کسی کمزور کو ایسا کام کرنے پر مجبور کرے جو نقصان دہ ہو یا کوئی زوآور کسی کو ملانا چاہتا ہو (وھبہ الزحیلی نظریہ الضرورتہ الشرعیہ۔٦٥)

اضطرار کی حالت اور مضطر:

چونکہ ضرورت کے تقریباً تمام مسائل کا تعلق حالتِ اضطرار کے ساتھ ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ پہلے مضطر اور حالتِ اضطرار کی وضاحت ہو جائے اس سلسلے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہم پہلے درج کر چکے ہیں میرے خیال میں حالتِ اضطرار کی سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو مولانا مودودی نے رسائل و مسائل میں ایک سائل کے استفسار کے جواب میں کہی ہے ۔فرماتے ہیں ۔اضطرار یہ ہے کہ آدمی کو شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے کسی حد پر قائم رہنے میں ناقابلِ برداشت نقصان یا تکلیف لاحق ہو۔اس معاملہ میں آدمی اور آدمی کی قوتِ برداشت کے درمیان بھی فرق ہے۔ اور حالات اور ماحول کے لحاظ سے بھی بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس کا فیصلہ کرنا کہ کون شخص کن حالات میں مضطر ہے خود اُس شخص کا کام ہے جو اس حالت میں مبتلا ہو۔ اُسے خود ہی اللہ تعالیٰ سےڈرتے ہوئے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرنی چاہئے۔ کہ آیا وہ واقعی اس درجہ مجبور ہو گیا ہے کہ خدا کی کوئی حد توڑے۔''

(رسائل و مسائل حصہ دوم مولانا مودودی صفحہ ١٧٩ و ١٨٠)

علامہ یوسف القرضاوی اپنی کتاب حلال و حرام میں''فرد کی مجبوری اس صورت میں باقی نہیں رہتی جبکہ معاشرہ میں اسکی ضرورت کو پورا کرنے کا سامان موجود ہو'' کے تحت امام ابن حزم کے حوالے سے ایک بہت اہم نکتہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آدمی کے پاس اگر ذاتی طور سے خورد ونوش کی اشیاء موجود نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر طرح مجبور ہو گیا ہے۔ جبکہ معاشرہ کے دیگر افراد کے پاس خواہ وہ مسلم ہوں یا ذمی، کھانے پینے کی چیزیں فاضل مقدار میں موجود ہوں۔ ایسی صورت میں اُس مجبور شخص کی ضرورت ان فاضل چیزوں سے پوری کی جا سکتی ہے۔ اور اُسے حرام چیزیں کھانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تکمیل درحقیقت ایک دوسرے سے مل کر ہوتی ہے۔ اور وہ باہم ایک دوسرے کے کفیل ہوتے ہیں۔ گویا اسلامی معاشرہ کے افراد جسدِ واحد کے اجزا

ہیں یا یوں کہیئے کہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں جن کے اجزا ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔
اجتماعی کفالت کے بارے میں امام ابن حزم کی یہ گراں قدر رائے فقہائے اسلام کے لیے مشعل راہ ہے۔ ''ایک مسلمان کے لیے حالتِ اضطرار میں مردار یا سور کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے جب کہ اُس کے مسلم یا ذمی ساتھی کے پاس خورد و نوش کی فاضل اشیاء موجود ہوں کیونکہ جس کے پاس فاضل چیزیں موجود ہوں اس پر بھوکے کو کھلانا فرض ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضطر (لاچار) شخص مردار یا خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور نہیں ہے۔اس کو اپنے ساتھی سے کھانے پینے کی فاضل چیزیں حاصل کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اس غرض کے لیے اگر اُسے لڑنا پڑے اور اس میں وہ مارا جائے تو قاتل کے ذمہ قصاص ہوگا اور اگر مجبوراً روکنے والے شخص کو قتل کرنا پڑا تو اس مقتول پر اللہ کی لعنت ہے۔ کیونکہ اس مقتول نے ایک مجبور شخص کو اپنا حق حاصل کرنے سے روکا۔ بنابریں اُس کا شمار باغی گروہ میں ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم دیا ہے (سورہ حجرات آیت نمبر ۹)
دراصل اپنے بھائی کو روکنے والا شخص باغی ہے اس بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہا دکیا تھا''۔(المحلی لابن حزم جلد ٦ صفحہ ١٥٩ بحوالہ حلال و حرام از یوسف القرضاوی صفحہ ٦٢ تا ٦٣)

ضرورت کے ضوابط:

ضرورت کے چند اہم ضوابط مندرجہ ذیل ہیں۔
١۔ ضرورت واقعتہً موجود ہو اور ضرورت کا محض اندیشہ نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ واقعہ میں ہلاکت، جان کے ضیاع، اعضا کے اتلاف یا ناکارہ ہونے کا خوف ہو۔ اور نقصان کے بارے میں تجربات کی بنا پر غلبۂ ظن ہو۔ اگر ضرورت اس درجے کی نہ ہو تو مکلف کیلیے جائز نہیں کہ وہ ضرورت کی حالت کی طرف منتقل ہو جائے۔
٢۔مضطر کے پاس حرام چیز کے استعمال کے علاوہ کوئی ذریعہ نہ ہو۔ جس سے وہ ضرر دور کر سکے۔
٣۔ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لیے جس قدر ضرورت ہے اُسی قدر مباح ہے۔
٤۔ مضطر شخص اس حرام کو خواہش پوری کرنے اور لذت کے حصول کے لیے نہ کھائے۔

(غیرَ باغٍ وَّ لا عادٍ)

۵۔ مضطر کو اس امر کی اجازت نہیں کہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے دوران میں اسلامی شریعت کے قوانین کی خلاف ورزی کرے۔ کیونکہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا بھی شارع کی اجازت سے ہے۔ لہٰذا اپنی جان بچانے کیلیے دوسرے کو قتل کرنا ، یا بدکاری کرنا، یا کفر کا ارتکاب جائز نہیں۔ البتہ اگر دل ایمان پر مطمئن ہو۔ صرف زبان سے کفر یہ کلمات ادا کرنا پڑیں تو آیت قرآنی کی رو سے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مذکورہ بالا تمام افعال خود مفاسد ہیں۔

٦۔اگر دوا کے طور پر کسی حرام چیز کے استعمال کی ضرورت ہو تو عادل، دین دار اور علم میں قابل اعتماد ڈاکٹر یا طبیب کے نسخے پر اعتماد کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس حرام شے کے علاوہ کوئی ایسی دوا موجود نہ ہو جس سے علاج ہو سکے۔

مفتی محمد شفیع علامہ حموی کی ''شرح اشباہ'' کے حوالے سے اضطرار کے صحیح درجے کے تعین کے بارے میں پانچ درجوں ''ضرورت (اضطرار)، حاجت، منفعت، زینت اور فضول'' کا ذکر کرنے کے بعد ضرورت کے عمومی ضوابط بیان کرتے ہیں۔ جن کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ غیر اضطراری حالت میں علاج کی شرعی سہولت'' کے حوالے سے وہ بھی ہمارے ضابطہ نمبر ٦کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اگر اضطرار کی حالت تو نہ ہو (جس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے) مگر بیماری اور تکلیف کی شدت سے مریض بے چین ہے۔ (اسی حالت کو اُوپر حاجت سے تعبیر کیا گیا) تو اس صورت میں حرام اور نجس دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ اس کا حکم قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں ہے اس لیے فقہائے اُمت کا اس میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک جائز نہیں۔ اور جمہور فقہا مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ یعنی کسی معتمد یا ڈاکٹر یا حکیم کی رائے میں اس کے علاوہ کوئی علاج نہ ہو۔اور اس حرام چیز سے شفا حاصل ہونے کا پورا وثوق ہو۔'' (جواہر الفقہ جلد ہفتم از مفتی محمد شفیع صاحب)

مسلمانوں کو عزیمت کی ہدایت:

اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار مسلمانوں کو عزیمت اور دین پر ثابت قدمی کی ہدایت کرتا ہے۔اور وہ مصائب جو اللہ کی راہ میں اُس کا کلمہ بلند کرنے کیلیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے۔ تو وہ محض کوتاہیوں کا کفارہ نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہاں ترقی درجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔
اور آیت قرآنی :

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔
(حٰم السجدہ:30)
میں بھی اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو خوشخبری دیتا ہے۔ جو اللہ کو رب تسلیم کر لینے کے بعد اور یہ عقیدہ اختیار کرنے کے بعد اُس پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور کبھی بھی اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش نہیں کرتے اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدہ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے:
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ؕ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ۔
(سورہ البقرہ۔۲۱۴)
"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے ، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں ، مصیبتیں آئیں ، ہلا مارے گئے ، حتی کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔(اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے"۔
انبیاء جب کبھی بھی دُنیا میں آئے، اُنہیں اور اُن پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا۔ اور اُنہوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلہ میں دین حق کو قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا۔ کہ آمنَّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس آمنَّا کا قدرتی تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے اُسے قائم کرنے کی کوشش کرے اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو اُس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔بلکہ عزیمت کے سلسلے میں اسلام تو اس حد تک گیا ہے کہ جہاد کے دوران اگر کوئی لڑائی چھوڑ کر جہاد سے بھاگ کھڑا ہو۔ تو اسے گناہ کبیرہ اور مہلک ترین گناہ کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کسی صورت یہ برداشت نہیں کرتا۔ کہ حق کا سپاہی لڑائی میں پیٹھ دکھائے وہ اُس سے اُولوالعزمی اور ثابت قدمی کا تقاضا کرتا ہے۔
ارشادِ ربانی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ-وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۔
(الانفال۔۱۵، ۱۶)

"اےلوگو جو ایمان لائےہو ، جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو۔جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، الاّ یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دُوسری فوج سے جا ملنے کےلیے۔ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔ اُس کا ٹھکانہ جہنّم ہو گا، اور وہ بہت بُری جائے بازگشت ہے"۔

دشمن کے شدید دباؤ پر مرتب پسپائی (Orderly retreat)ناجائز نہیں ہے۔ جبکہ اس کا مقصود اپنے عقبی مرکز کی طرف پلٹنا یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصے سے جا ملنا ہو۔ البتہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ بھگدر (Rout)ہے۔ جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی و شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور اس لیے ہوا کرتی ہے کہ بھگوڑے آدمی کو اپنے مقصد کی بہ نسبت جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ اُن کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ ایک شرک، دوسرے والدین کی حق تلفی، تیسرے میدان قتال فی سبیل اللہ سے فرار۔ اس طرح ایک اور حدیث میں آپ نے سات بڑے گناہوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کیلیے تباہ کن اور اُس کے انجام اُخروی کے لیے غارت گر ہیں۔ ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی جنگ میں کفار کے آگے پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس فعل کو اتنا بڑا گناہ قرار دینے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا بھگوڑا پن بسا اوقات ایک پوری پلٹن کو اور ایک پلٹن کا بھگوڑا پن ایک پوری فوج کو بدحواس کرکے بھگا دیتا ہے۔ اور پھر جب ایک دفعہ کسی فوج میں بھگوڑا پن پڑ جائے تو کہا نہیں جا سکتا کہ تباہی کس حد پر جاکر ٹھہرے گی۔ اس طرح کی بھگدڑ صرف فوج کے لیے تباہ کن نہیں ہے بلکہ اس ملک کے لیے بھی تباہ کن ہے جس کی فوج ایسی شکست کھائے۔

(تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ صفحہ ۱۳۴ و ۱۳۵)

اسلام ہم سے عزیمت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور جہاں جہاں اللہ تعالیٰ اور سنت رسول نے معذوروں کو رخصت دی ہے۔اُس کے علاوہ ہم کہیں

بھی عزیمت کے علاوہ اور کچھ نہین پاتے۔ دین اسلام مسلمان سے دو بنیادی اور اہم مطالبات کرتا ہے۔
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ
(البقرہ۔۲۰۸)
"اے ایمان لانے والو ! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔
ایک یہ کہ بغیر کسی استثناء اور تحفظ کے اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ اور شیطان کے راستے پر نہ چلو۔ اور دوسرے یہ کہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی، قانونی اور سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کیلیے جان لڑا دو۔ کیونکہ یہ دین مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی گزارنے کا کوئی پروگرام نہیں دیتا۔
(مزید تفصیل کیلیے دیکھیں مبادیات اُصولِ فقہ از عبداللطیف خان گنڈاپور و محمد خان منہاس صفحہ ۱۵ تا ۱۷)۔
اللہ تعالی نے انسان کو بہت سی اعلی صلاحیتوں سے نوازا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان صلاحیتوں کو بروے کار لایاجاے اور ان کو نکھارا جاے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ عزم وہمت کامظاہرہ کرتا رہے؛ انسان جوں جوں عزیمت کے راستے پر چلتا رہے گا اتنی ہی اس کی صلاحیتں نکھرتی چلی جائیں گی لہذا مشکل حالات کا سامنا کرتے وقت پہلے ہی مرحلے میں ہمت ہار جانایا راستہ بدل دینا اور مصنوعی شرکاءکا سہارا لینا دراصل عزم کی کمی اورصبر کی قوت کو بروے کار نہ لانے کا نام ہے جو اللہ تعالی نے انسان میں ودیعت کی ہے۔

اصل مطلوب عزیمت ہی ہے:

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام میں اصل مطلوب عزیمت ہی ہے اور قرونِ سابقہ کے مسلمان اور مسلم قیادتیں اس کی عملی مثال ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔اور ہمیں اس سلسلے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ ہم اہل عزیمت کو پہچان سکیں۔ قرآن جگہ جگہ اہل عزیمت کی نشان دہی میں ہماری مدد فرماتا ہے۔ارشاد ہے:
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۔ (سورہ العمران۔۱۹۵)

" جواب میں ان کے رب نے فرمایا : '' میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں ۔ خواہ مرد ہو یا عورت ، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کر دوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں ، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے"۔

عزیمت کے سلسلے میں یہ بات بھی شدید اہمیت کی حامل ہے کہ آزمائش کیلیے دعا نہیں کرنی چاہیے لیکن جب آزمائش اللہ کی طرف سے آجائے تو اُس میں استقامت ہی عزیمت کا دوسرا نام ہے۔

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

عبدُ الله بن أبِي أوفَى " أنَّ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) في بعض أيَّامِهِ الَّتي لقيَ فيها العَدُو ، انتظر حتَّى مالتِ الشَّمْسُ ، ثمَّ قام في النَّاس ، فقال : " يا أيُّهَا النَّاسُ لا تَتمنوا لقاء العدُوّ ، وأسْألُوا اللَّهَ العَافيةَ فإذا لقِيتُمُوهم فاصْبِرُوا ، واعلَمُوا أنَّ الجنَّة تحتَ ظلالِ السُّيُوفِ " ثم قال : " اللَّهُمَّ مُنزلَ الكتابِ ، ومُجْرِي السَّحابِ ، وهازِمَ الأحْزابِ ، اهزمْهُمْ ، وانْصُرْنا عليْهِمْ ۔

(مسلم کتاب الجهاد والسير بحوالہ زادِ راہ صفحہ ۸۴ تا ۸۵)

"عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کسی جہاد میں انتظار کرتے رہے (حملے میں پہل نہیں کی) یہاں تک کہ سورج ڈوبنے کے قریب ہوا تو آپؐ اُٹھے اور مجاہدین کو خطاب کیا اور فرمایا اے لوگو! دشمن سے لڑائی کی تمنا نہ کرو۔ اس بات کی دُعا کرو کہ اللہ اپنی عافیت میں رکھے لیکن جب دشمن سے بھڑ جاؤ تو صبر و استقامت دکھاؤ اور اس بات کا یقین کرو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے دُعا فرمائی۔ اے اللہ! کتاب کے نازل کرنے والے، بادلوں کو چلانے والے اور دشمن ٹولوں کو شکست دینے والے، تو ان لوگوں کو شکست دے اور ہمیں اپنی مدد سے اُن پر غالب فرما۔(چنانچہ اس کے بعد حملہ ہوا مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور دشمن شکست کھا گیا)"۔

باب دوم

عزیمت کے تقاضے

اقوال و افعال میں اخلاصِ نیت

انسان کے تمام اعمال کا دارومدارا خلاصِ نیت پر ہے اخلاص ِ نیت سے عاری کوئی بھی عمل اللہ تعالی کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے ۔ارشاد رسول ہے:

عن ابی ہریرہ قال قال رسول اللہ اِنمَّا یبُعَثُ الناسُ عَلیٰ نِیاَّبِہِم۔
(ابن ماجہ بحوالہ زاد راہ صفحہ ۱)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا لوگ قیامت کے دن صرف اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے"۔

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں انسان کے انجام کا فیصلہ کرنے کے لیے اُس کا ظاہر نہیں دیکھا جائے گا بلکہ صرف یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے جو نیک کام کیے ہیں اُن کے بارے میں اُس کے دل کا رخ اور ارادہ کیا تھا۔ اس لحاظ سے اُس کے عمل کو قبول یا ردّ کیا جائے گا۔

نیت تمام اعمال کی روح ہے جس طرح بغیر روح کے جسم کی کوئی قدروقیمت نہیں اسی طرح بغیر نیت کے اعمال کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔بغیر نیت کے عمل مشقت ہے اور نیت بغیر اخلاص کے ریا اور اخلاص بغیر تحقیق کےغبار۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ہَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۔
(الفرقان۔۲۳)

"اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے۔ اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے"۔

علامہ جوزی کہتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ جو نیت کی حقیقت کو نہیں جانتا اُس کی نیت کیسے درست ہو سکتی ہے۔اور اگر وہ اخلاص کی حقیقت نہیں جانتا تو اُس کی نیت میں اخلاص کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔اور اگر اُسے صدق کے معنیٰ کا علم نہیں تو مخلص اپنے نفس سے صدق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے۔

ہربندے کا جو اللہ کی اطاعت کا ارادہ کرے پہلا کام یہ ہے کہ وہ نیت کو جانے تاکہ اسے معرفت حاصل ہو اور صدق اور اخلاص کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد اپنے عمل کو اس کے مطابق درست کرے کیونکہ بندے کیلیے یہی نجات کا وسیلہ ہیں۔

(منہاج القاصدین از امام عبدالرحمان ابن جوزی صفحہ ۴۵۰ مزید تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو صفحہ ۴۵۰ سے ۴۶۱ تک)

لہٰذا انسان کے لیے ضروری کہ اس کا د ل ر یاءسے پاک ہو اوراُس کی بندگی میں اخلاص ہو۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ
(الزمر:۱۱)
"(اے نبی) ان سے کہو ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دِین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں "۔
ایک اور مقام پر اللہ تعالی نے تمام مومنین کواخلاص نیت کا حکم دیتے ہوے فرمایا:
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ
ۭ(البینہ:۵)
"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں ، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر ، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے"۔
آپ نے فرمایا :
عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه ، قال : سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى ، فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله ، فهجرته إلى الله ورسوله ، ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها أو امرأة ينكحها ، فهجرته إلى ما هاجر إليه . **(رواه البخاري ومسلم)**
"اعمال کے نتائج نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہوئی تو اُس کی ہجرت اللہ اور اُس کے رسول کے حساب ہی میں شمار ہوگی اور جس کی ہجرت دُنیا کے حصول کے لیے ہوئی تاکہ دُنیا حاصل کرے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی تو اُس کی ہجرت اُس چیز کے لیے شمار ہوگی جس کیلیے اُس نے ہجرت کی"۔
یعنی جو کام کریں اُس میں اپنی کوئی غرض نہ ہو بلکہ وہ خالصتاً اللہ کے لیے کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب خرابیاں اخلاص کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔اسی طرح اعمال میں جو وزن پیدا ہوتا ہے وہ اخلاص کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں خلافت کا وعدہ بھی اخلاص کے ساتھ مشروط کیا ہے۔
جہاں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (سورہ نور آیت ۵۵)۔

"وہ اُنہیں زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا)کا وعدہ ہے وہاں یہ شرط بھی ہے "۔
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ
"یعنی صرف میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں"۔
صرف اس صورت میں وہ اُن کو زمین میں خلافت اور غلبۂ دین عطا کرے گا۔ اور خوف کو امن سے بدل دے گا۔ یہ اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کا نتیجہ ہے۔
در اصل اللہ کے ساتھ تعلق اور اخلاص جسے للّٰہیت کہتے ہیں۔ اس کے بغیر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا اور اللہ کے ہاں قبول بھی نہیں ہو سکتا۔ مشہور حدیث « إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّات ۔ کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔یہاں نیت سے مراد وہ نیت ہے جو ہر قسم کی ذاتی اور دنیوی رغبتوں سے خالی ہو اور اللہ کے لیے خالص ہو۔ ارشاد رسول ہے:
إن الله لا يقبل من العمل إلا ما كان له خالصا وابتغي به وجهه۔ (نسائی)
اللہ تعالیٰ کسی عمل کو قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ خالص نہ ہو اور اس کا مقصد اللہ کی رضا نہ ہو۔(دین میں ترجیحات از علامہ یوسف القرضاوی صفحہ ۱۶۳) شہدا کی شہادت،مال داروں کا انفاق، قرآن کے عالموں کا درس، ان میں سے کوئی چیز بھی فائدہ نہیں دے گی اگر اس کے ساتھ للّٰہیت اور اخلاص نہ ہو۔
(ترجمان القرآن جون ۲۰۰۶ صفحہ ۳۵)
نیت کی درستی اور عمل کے اخلاص کو اسلامی شریعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے جس طرح صحت عمل کا مدار نیت پر ہے۔ اس طرح نیت کی قبولیت کا انحصار بھی خلوص پر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نیت بھی صاف ہو اور عمل بھی مبنی بر اخلاص ہو۔چونکہ اسلام میں اخلاص کو بھی عبادت کادرجہ حاصل ہے۔ اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دُنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے۔۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں کا مدار اخلاص پر نہیں ہے اس لیے ان میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ اُنکی حیثیت عبادت کی ہوگی۔
بہرحال اللہ کے ہاں کسی بھی عمل کا دارومدار نیت پر ہوگا۔ اور دلوں کا حال اللہ جانتا ہے۔
حدیث نبوی ہے :

إِنَّ اللَّهَ لا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ۔ (صحیح مسلم)
"بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے"۔
اگر عمل صحیح اور نیک ہے اور دل میں اُس کے لیے محرک اور جذبہ ہے وہ بھی صحیح ہے تو ایسا عمل اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔
آپ نے فرمایا:
من صلى يرائي فقد أشرك ومن صام يرائي فقد أشرك ومن تصدق يرائي فقد أشرك۔

(مسند احمد)
"جس نےدکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا۔ اور جس نے ریاکاری کے لیے صدقہ و خیرات کیا اُس نے بھی شرک کیا"۔
یعنی یہ تینوں بڑے نیکی کے کام ہیں لیکن اس کے باوجود اگر یہ کام رضائے الٰہی کے بجائے ریاکاری یا کسی اور مقصد کے لیے ہیں تو شرک کے زمرے میں آئیں گے۔ اور شرک سے بڑا اور گھناؤنا گناہ اور کوئی نہیں ہے۔
اسلام میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ہر شخص پر واضح ہے۔ اسلام کی ترقی اور توسیع کا یہ سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ذریعہ ہے۔ اس فریضے کی اہمیت کا انحصار نیت اور عمل کے اخلاص پر ہے۔ نبی کی حدیث کے مطابق قیامت کے دن شہید، عالم اور سخی شخص سے سوال کیے جائیں گے اور اُن کی ریا اور نمود و نمائش کی وجہ سے اُن کی شہادت، علم اور سخاوت قبول نہیں کی جائے گی اور اُنہیں اوندھے منہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔
اگر کوئی مسلمان حاجت مند کی امداداس لیے کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کام اس کی نیکی میں شمار نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کی بنا اخلاص پر نہیں تھی۔
سورہ شورٰی میں ارشاد ہے:
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔
(سورہ شوریٰ ایت نمبر ۲۰)
"جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں ، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے:
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔(سورہ بقرہ ایت نمبر ٢٦٤)
"اے ایمان لانے والو ! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے ، نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے ، جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کامینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اورصاف چٹان کی چٹان رہ گئی ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں ، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا ، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے"۔
منافقوں کا حال معلوم ہے وہ رسولؐ کی خدمت میں آکر رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے لیکن وہ اقرار مبنی بر اخلاص نہ تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۔
(المنافقون:1)
"اے نبی ، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ’’ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقینا اللہ کے رسول ہیں۔‘‘ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ہو ، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔
یہ تو نیت کامعاملہ ہوا۔ اسی طرح عمل کی سچائی اور اس کا اخلاص یہ ہے کہ وہ نیک عمل ہو۔ ضمیر کے مطابق ہو۔ اور اخلاص و بے لوثی پر مبنی ہو۔ اس سلسلے میں رسول اللہ کی دعوت اور تربیت سے صحابہ کرام میں جس حد تک باریک بینی آگئی تھی۔ اُس کا حضرت علیؓ کے ایک واقعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
ایک موقع پر عین حالتِ جنگ میں حضرت علیؓ کا ایک شخص سے دو بدو مقابلہ ہوا۔اور حضرت علیؓ نے اس کافر کو زیر کر لیا۔ اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اب اسے خنجر گھونپنے والے تھے کہ اُس نے نیچے پڑے ہوئے بھی آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ نے اس کی اس حرکت کے بعد اُسے چھوڑ دیا۔ اور فوراً اُس کے سینے سے نیچے اُتر آئے۔ وہ بہت حیران ہوا۔ کہ اُنہوں نے مجھے کیوں

چھوڑ دیا ہے۔ جب کہ میں نے اُن کی توہین بھی کی ہے۔ اس کے استفسار پر حضرت علیؓ فرمانے لگے۔دیکھو! میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر قتل کر رہا تھا لیکن اب اگر میں تمہیں قتل کرتا جبکہ تم نے میری توہین کی ہے تو میری نیت میں میرے نفس کا انتقام بھی شامل ہو جاتا''۔ ذرا غور کیجئے کہ جنگ جذبات کی انتہائی گرمی کا وقت ہوتا ہے۔ مرو یا مارو کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس حالت میں بھی انسان کی نگاہ دل اور نیت پر ہو۔ یہ رسول اللہ کی تربیت کا کمال تھا''۔ (اربعین نووی کی احادیث۔خطاباتِ جمعہ از ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ۲۷ تا ۳۱)

اخلاص نیت کے ثمرات

خدا کی مدد کا مستحق:

عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ قَالَ كَتَبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رضى الله عنها أَنِ اكْتُبِى إِلَىَّ كِتَابًا تُوصِينِى فِيهِ وَلاَ تُكْثِرِى عَلَىَّ. فَكَتَبَتْ عَائِشَةُ رضى الله عنها إِلَى مُعَاوِيَةَ سَلاَمٌ عَلَيْكَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّى سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- يَقُولُ « مَنِ الْتَمَسَ رِضَاءَ اللَّهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللَّهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَاءَ النَّاسِ بِسَخَطِ اللَّهِ وَكَلَهُ اللَّهُ إِلَى النَّاسِ ». وَالسَّلاَمُ عَلَيْكَ.

(ترغیب و ترہیب بحوالہ ترمذی)

"مدینہ کے باشندوں میں سے ایک آدمی کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں خط بھیجا۔ جس میں انھوں نے درخواست کی کہ آپ مجھے جامع اور مختصر الفاظ میں وصیت لکھ بھیجیں۔حضرت عائشہؓ نے جواب میں درج ذیل خط لکھا: تم پر سلامتی ہو۔ امابعد! میں نے رسول اللہ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو لوگ خدا کی خوشنودی کے طالب ہوں اور اس سلسلے میں لوگوں کی ناراضی کی پروا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی پوری مدد فرماتا ہے اور انسانوں کی ناراضی سے ان کو نقصان نہیں پہنچنے دیتا اور جو لوگ اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی خوشنودی چاہتے ہیں تو اللہ اپنی مدد کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کو انسانوں کے حوالے کر دیتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نصرت سے بھی محروم رہتے ہیں اور جن کی خوشی کے لیے اللہ کو ناراض کیا تھا ان کی مدد بھی نہیں ملتی۔ والسلام علیک"۔

آخرت طلبی کا صلہ:

زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وسَلَّمَ ، يَقُولُ : مَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ ، فَرَّقَ اللَّهُ عَلَيْهِ أَمْرَهُ ، وَجَعَلَ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ ، وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلاَّ مَا كُتِبَ لَهُ ، وَمَنْ كَانَتِ الآخِرَةُ نِيَّتَهُ ، جَمَعَ اللَّهُ لَهُ أَمْرَهُ ، وَجَعَلَ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ ، وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ.

(ترغیب و ترہیب کتاب التوبۃ والزھد)

"زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو ارشاد فرماتے سنا:۔۔ جو شخص دنیا کو اپنا نصب العین بنائے گا، اللہ اس کے دل کا اطمینان و سکون چھین لے گا اور ہر وقت مال جمع کرنے کی حرص اور احتیاج کا شکار ہوگا، لیکن دنیا کا اتنا ہی حصہ اسے ملے گا جتنا اللہ نے اس کے لیے مقدر کیا ہوگا اور جن لوگوں کا نصب العین آخرت ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کو قلبی سکون و اطمینان نصیب فرمائے گا اور مال کی حرص سے ان کے قلب کو محفوظ رکھے گا اور دنیا کا جتنا حصہ ان کے مقدر میں ہوگا وہ لازماً ملے گا (اور وہ گھٹنے ٹیکتا ہوا ان کے پاس آئے گا)

اخلاص نیت اور اجر آخرت

عَنْ أَنَسٍ بن مالك ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، قَالَ رجعنا من غزوة تبوك مع النبي صلي الله عليه وسلم فقال ان اقواماخَلْفَنَا مَا سَلَكْنَا شِعْبًا ، وَلاَ وَادِيًا إِلاَّ وَهُمْ مَعَنَا فِيهِ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ.

(بخاری کتاب الجہاد، ابوداؤد کتاب الجہاد)

"انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم سے فارغ ہو کر ہم لوگ حضور کے ساتھ واپس ہوئے تو (دوران سفر) آپؐ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ہمارے پیچھے مدینہ میں مقیم ہیں لیکن وہ اس سفر میں فی الواقع ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ ہم لوگ جس گھاٹی میں چلے اور جو وادی ہم نے طے کی ہر جگہ وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ ان کو عذر نے انھیں روک دیا تھا"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے کوئی نیک عمل کرنے کی نیت کی اور کسی عذر سے وہ نہ کر سکا تو اللہ کے یہاں آخرت میں اس عمل کے اجر و انعام سے وہ محروم نہیں رہے گا۔

اخلاص نیت اور انعام الٰہی:

عن أبي الدرداء يبلغ به النبي صلى الله عليه و سلم قال : من أتى فراشه وهو ينوي أن يقوم يصلي من الليل فغلبته عيناه حتى أصبح كتب له ما نوى وكان نومه صدقة عليه من ربه۔ (نسائی کتاب قیام الیل باب من اتی فراشہ وھو ینوی ج نمبر۱۱، ابن ماجہ)

"حضرت ابودرداؓ نبی سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جو شخص اپنے بستر پر اس نیت اور ارادے کے ساتھ لیٹا کہ وہ تہجد کے لیے اٹھے گا لیکن اس کو گہری نیند آگئی وہ اٹھ نہیں سکا، یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی تو ایسے شخص کے نامہ اعمال میں اس رات کی نماز تہجد لکھ دی جائے گی۔اور یہ نیند اس کے لیے اس کے رب کی طرف سے بطور انعام شمار ہوگی"۔

اخلاص کا بے بہا ثمرہ:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ : يَا رَسُولَ اللهِ أَوْصِنِي ، قَالَ : أَخْلِصْ دِينَكَ يَكْفِكَ الْعَمَلُ الْقَلِيلُ.

(الحاکم، الترغیب والترہیب، باب الاخلاص)

"حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم جس وقت مجھے یمن میں بھیج رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنی نیت کو ہر کھوٹ سے پاک رکھو۔ جو عمل کرو صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کرو، تو تھوڑا عمل بھی تمہاری نجات کے لیے کافی ہوگا"۔

تقویٰ

عربی زبان میں وقی یقٰی کے معنی ہیں کسی شے کی ضرر سے اپنے آپ کو بچانا۔ اسی سے اتقاء ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ اور رسول کی تعلیمات کے مطابق تقویٰ اللہ کے حدود کو توڑنے، اُس کی امانتوں میں خیانت کرنے اور اس کے عہد کی بے حرمتی کرنے سے، اس کے

برے نتائج اور خدا کے غضب کے اندیشے کی بنا پر بچنا۔ قرآن میں جہاں کہیں مفعول کے بغیر یہ لفظ آتا ہے تو بالعموم یہ جامع معنی مراد ہوتے ہیں۔
اس معنی کے لحاظ سے متقی وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی تعظیم اور اُس کے غضب کا اندیشہ ہو اور وہ خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنے، اُس کے عہد و میثاق کی خلاف ورزی کرنے اور اُس کی امانتوں میں خیانت کرنے سے ڈرتا ہو۔ (حقیقتِ دین ،امین احسن اصلاحی،صفحہ314)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں

"تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور قرآن پر عمل کیا جائے ،قیامت کی تیاری کی جائے اور دنیا میں متاعِ قلیل (فقر)پر بخوشی گزارہ کیا جائے"۔
مفتی محمد شفیع معارف القرآن میں سورہ ال عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ‘‘لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔اس کاترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنےہی کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یا کہ اُن سے عذاب الٰہی کا خطرہ ہے’’۔
اُن کے نزدیک ‘‘تقویٰ کے کئی درجات ہیں۔ ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے۔ اگر چہ گناہوں میں مبتلا ہو۔اس معنی کے لیے قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اُس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موجود ہیں۔
تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے۔ جو انبیا علیہم السلام کو نصیب ہوتا ہے کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اُس کی رضاجوئی سے معمور رکھنا۔مذکورہ آیت میں اتقواللہ کے بعد حَقَ تقُاتہِ کا کلمہ بڑھایا گیا ہے۔ کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔(معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۷)
اس حقِ تقویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔‘‘اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع بن قتادہ اور حسن بصری ؓ نے یہ فرمائی ہے۔ جو مرفوعاً خود رسول اللہ سے بھی منقول ہے:۔

حق تقاتہ ہو ان یطاعفلا یعصی و یزکر فلا ینسٰی و یشکر فلا یکفر۔ (بحر معیط)
حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے کوئی کام طاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکریہ ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔
اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں جو اتقواللہ ما استطعتم یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت میں ہے تو حضرت ابن عباسؓ اور طاوس نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حق تقاتہ کی ہی تفسیر و تشریح ہے اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دے تو حق تقویٰ ادا ہو گیا۔
(ایضاً صفحہ ۱۲۷ ، ۱۲۸)
حضرت ابی ابن کعبؓ سے جب حضر ت عمرؓ نے تقویٰ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حضرتِ عمرؓ سے کہا:"جب تم کسی جھاڑی دار جگہ سے گزرو گے تو کیا کرو گے ؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ، میں اپنے کپڑے سمیٹوں گا الجھنے سے بچنے کی کوشش کروں گا ، اس پر ابی ابن کعبؓ نے فرمایا: یہی تو تقویٰ ہے"۔
(شعوری بیداری)

ارشاد ربانی ہے:
تَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔(المائدہ:2)
"ادائے حق اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں تعاون نہ کرو"۔
اس آیت میں بر، اثم، تقویٰ اور عدوان کا تقابل ہے۔ اور کسی لفظ کا مقابل اپنے مقابل کے صحیح مفہوم کی تعیین میں سب سے زیادہ مدد کرتا ہے۔ عدوان کے معنی حد سے تجاوز کے ہیں۔ اس وجہ سے تقویٰ کے معنی اللہ کی حدود کی حفاظت کے ہوں گے۔ یعنی اللہ نے جو حقوق واجب کر دئیے ہیں، جو حدود متعین کر دئیے ہیں۔ جو حلال و حرام ٹھہرالیے ہیں۔ پورے خوفِ خدا کے ساتھ اُن کی نگہداشت کی جائے۔
ایک دوسری آیت میں ہے:
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ۔
(التوبہ۔۱۰۸)
اور اس آیت سے اوپر والی آیت میں مسجد ضرار کا ذکر ہے۔ جس کا مقصد ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ بیان کیا گیا ہے۔یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا خدا کی

ناشکری کرنا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا، اور اللہ اور رسول کے مخالفوں کے لیے ایک اڈا مہیا کرنا۔ اس کے بعد اس مسجد کا ذکر کیا گیا ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ جو باتیں ان باتوں کی ضد ہیں یعنی مسلمانوں کی خیر خواہی، اللہ کی شکر گزاری، مسلمانوں میں اتحاد اور تالیف قلب پیدا کرنے کی کوشش اور اللہ اور اُسکے رسول کے مخالفین سے بیزاری، یہ سب تقویٰ کی باتیں ہیں۔ (حقیقت ِدین ،امین احسن اصلاحی،صفحہ325)

تقویٰ کا مرکز۔۔قلب:

تقویٰ کے ضمن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نفس اور ذہن اور روح کے مرکز پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جس کا شریعت میں اصطلاحی نام قلب ہے۔ فساد جب اس سرچشمہ میں آتا ہے۔ تو پھر سارے کردار میں پھیل جاتا ہے۔ اور اصلاح بھی جب اس سرچشمہ کی ہوتی ہے۔تو ساری سیرت سنور جاتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہی اصلی مربی اور مزکی ہے۔یہی بہترین مفتی اور جج ہے۔ یہی چاق و چوبند پاسبان اور سنتری ہے۔ یہ بگڑ جائے تو پھر باہر کی کوئی امداد ہمیں سنوار نہیں سکتی۔

حدیث:

إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ.۔

"بے شک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست اور اگر وہ خراب ہے تو سارا جسم خراب۔ خبردار وہ قلب ہے"۔

نبی ﷺ نے ایک اور حدیث میں بھی یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قلب ہی اللہ کی نظر کا مرکز ہے اور اسی کا عمل معتبر ہے۔آپؐ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لاَ يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلاَ إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ۔ (مسلم)

"اللہ تمہارے جسموں اور تمہاری شکلوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے"۔ (دین میں ترجیحات از علامہ یوسف القرضاوی صفحہ ۱۶۴)

اللہ کا تقویٰ جو اللہ کی طرف سے اولین اور آخرین سب انسانوں کیلیے ایک وصیت (تاکیدی حکم) اور وہ فضائل اور بھلائیوں اور دُنیا و آخرت کی کمائی کی بنیاد ہے۔ درحقیقت امرِ قلبی ہے۔ اس وجہ سے نبی ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا۔ التقویٰ ہٰہنا (تقوی یہاں ہے)اس دوران آپؐ نے تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا یعنی آپؐ نے

اس کلمے کو تین بار دہرایا اور ہاتھ سے بھی اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا تاکہ یہ بات لوگوں کی عقلوں اور اُن کے دلوں میں بیٹھ جائے۔
قرآن کریم نے بھی تقویٰ کو دلوں کی طرف منسوب کرکے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے:
وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔
(الحج۔۳۲)
"اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے"۔
رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی یہ ہے کہ بگاڑ جب آتا ہے تو اسی قلب میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس مرکز پر نہ ہو اور وہ اس سیاہ نقطے کو فوراً نہ دھو ڈالے تو یہ نقطہ پھیلنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کی سیاہی سارے قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ اپنے نفس پر نگاہ رکھنا اور اپنی کمزوریوں کو جاننا اور دفع کرنا ہی ایک متقی شخص کا کام ہے۔
یہ تقویٰ جس کا مرکز دل ہو، جو انسان کی زندگی کے تمام اطراف کو روشن کرے۔ جو ہر شعبۂ زندگی میں اُس کو اللہ کے حدود کا پابند بنائے۔ جس میں کامل توافق ہو۔کامل اعتدال ہو، پوری ہمہ گیری ہو،جو نہ ایک قدم اللہ کی حد سے آگے بڑھنے پائے، نہ ایک قدم اس سے پیچھے ہٹنے پر راضی ہو، جو دل کو مجبور کرے کہ وہی سوچے جو سوچنا چاہئے،آنکھوں کو مجبور کرے کہ وہی دیکھیں جو دیکھنا چاہئے، کانوں کی نگرانی کرے کہ وہی سنیں جو سننا چاہیے۔ زبان کی حفاظت کرے کہ وہی بولے جو حق ہے، اور ہاتھ پاؤں کی دیکھ بھال کرے کہ اسی کام کے لیے اور اسی راہ میں اُٹھیں جو اللہ نے انسان کے لیے کھولی ہیں۔بطن و فرج پر پہرہ بٹھا دے کہ یہ کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہ کر لیں۔جو خدا کی صحیح معرفت، آخرت کے سچے خوف، احکام الٰہی کے سچے جذبۂ احترام کے ساتھ ہو۔ جو انسان کے ظاہر میں ہو اور اُس کے باطن میں بھی ہو۔ خلوت میں بھی ہو اور جلوت میں بھی ہو۔
یہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم نبی ﷺ نے دی ہے یہی تقویٰ ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کو رونق و جمال بخشتا ہے۔ (اُوصِیکَ بِتَقوَی اللہ فَانَّہ ازین لامرکَ کلّہ) یہی تقویٰ ہے جس کو قرآن میں لباس سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس طرح لباس زندگی کو سردی و گرمی سے اور میدانِ جنگ میں خطرات سے بچاتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو مادی اور روحانی مہالک سے بچاتا ہے۔ جس طرح لباس انسان کی ستر

پوشی کرتا ہے۔ اس طرح یہ بھی انسان کو معاصی سے بچاکر اُس کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اور پھر جس طرح لباس انسان کو زینت و جمال بخشتا ہے اسی طرح تقویٰ بھی انسان کی ساری زندگی کو سنوار دیتا ہے۔ یہی وہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم دینے کیلیے نبی حضرت ابوذرؓ کو برابر چھ روز تک متنبہ کرتے رہے کہ غور سے سننا کچھ باتیں کہنی ہیں اور چھٹے روز کے بعد زبان حق ترجمان جو گویا ہوئی تو پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ اُوصِیکَ بِتَقوَی اللہ فی سرامرک و علانیہ (اشارات از امین احسن اصلاحی ترجمان القرآن ستمبر اکتوبر 1945صفحہ ۱۰ تا ۱۱ اخذ کردہ از ترجمان القرآن ستمبر ۲۰۰۵)

<u>قرآن نے سب سے اہم عبادت حج کے لیے زادِ راہ کی تلقین کی اور فرمایا :</u>

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔
(سورہ بقرہ ۔۱۹۷)

"سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے۔ پس اے ہوشمندو ! میری نافرمانی سے پرہیز کرو"۔

قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم اگر ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اسے تقویٰ کہہ سکتے ہیں۔قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اس تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن میں سورہ البقرہ کا موضوع ہی تقویٰ ہے۔اس نے سورت کے آغاز میں اعلان کیا ہے کہ قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط ہی تقویٰ ہے۔'' هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ''۔

<u>تقویٰ کے تقاضے</u>

<u>تقویٰ کا ایک بڑا تقاضا یہ ہے</u> کہ انسان انتہائی احتیاط کے ساتھ گناہوں سے بچتا ہوا، خوفِ خدا کو دل میں سمائے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۷ میں روزہ کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ آخر میں فرماتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُاللّٰهِ فَلَاتَقْرَبُوْهَاۭكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ
(البقرہ۔۱۸۷)

"یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ، ان کے قریب نہ پھٹکنا اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے ، توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے"۔

"تقویٰ کا تقاضا ہے کہ نہ صرف آدمی گناہوں سے بچے بلکہ جہاں سے گناہوں یا معصیت کی سرحد شروع ہوتی ہے اُس کے قریب بھی نہ پھٹکے"۔
مولانا مودودی نے آیت کے اس حصے کی بہت خوبصورت تفسیر فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں ‘‘یہ نہیں فرمایا کہ ان حدوں سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے، عین اسی مقام کے آخری کناروں پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اس میں ہے کہ آدمی سرحد سے دور ہی رہے تاکہ بھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اس حدیث میں بیان ہوا ہے، جس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ لکل ملکٍ حمیٰ و ان حمی اللہ محار مہ، فمن رتع حول الحمی، یوشک ان یقع فیہ۔ عربی زبان میں حمیٰ اس چراگاہ کو کہتے ہیں، جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کردیتا ہے۔ اس استعارے کو استعمال کرتے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ’’ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ ہوتی ہے اور اللہ کی حمیٰ اس کی وہ حدیں ہیں، جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ جو جانور حمیٰ کے گرد ہی چرتا رہے گا، ہوسکتا ہے کہ ایک روز وہ حمیٰ کے اندر داخل ہوجائے۔‘‘ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی روح سے ناواقف ہیں، ہمیشہ اجازت کی آخری حدوں تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علما و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انہیں بتایا کرتے ہیں، تاکہ وہ اس باریک خط امتیاز ہی پر گھومتے رہیں، جہاں اطاعت اور معصیت کے درمیان محض بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بکثرت لوگ معصیت اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہو رہے ہیں، کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور ان کے کنارے پہنچ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۴۷)

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ ہر جگہ اور ہر لمحہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان بہت سی برائیوں سے رُک جائے گا۔

تقویٰ کا بڑا تقاضا یہ ہے کہ جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ہر حال میں انجام دینے چاہئیں اور جن سے روکا گیا ہے اُن سے قطعی طور پر منہ موڑ لیا جائے۔

<u>تقویٰ کا اہم تقاضا یہ بھی ہے</u> کہ اپنے حقوق و فرائض کما حقہ ادا کریں تقویٰ کے تقاضوں کے مطابق اگر زندگی کو ڈھال لیا جائے تو دونوں جہانوں کی کامیاب زندگی میسر آئے گی۔
<u>تقویٰ کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے</u> کہ جب شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال متقین کو چھو بھی جائے تو وہ فورا چوکنے ہو جاتے ہیں۔
اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْااِذَامَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔(الاعراف۔۲۰۱)
"حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہوجاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقہ کار کیا ہو"۔
مولانا مودودی فرماتے ہیں'' اس ارشاد کا ایک عمومی محل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ برائی سے بچیں اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ برے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اُن کے دل کو چھو جاتا ہے تو اُن کو ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چبھ جانے سے یا آنکھ میں کسی ذرے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔چونکہ وہ برے خیالات بری خواہشات اور بری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے اس وجہ سے یہ چیزیں اُن کے لیے اسی طرح خلاف مزاج ہو تی ہیں جس طرح انگلی کیلیے پھانس، آنکھ کیلیے ذرہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کیلیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔پھر جب یہ کھٹک انھیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور اُن کاضمیر بیدار ہو کر اُس غبارِ شر کو اپنے اوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحۃ ۱۱۳)
پھر تقویٰ کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے :
کہ مشتبہات سے بچا جائے۔ جو شخص واقعتاً تقویٰ کا حق۔کسی بھی درجے میں، چاہے وہ درجۂ استطاعت ہی کیوں نہ ہو۔ ادا کرنا چاہتا ہے تو اُس کیلیے لازم ہے کہ وہ مشتبہات کو ترک کر دے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مشکوک چیز سے یہ سوچ کر فائدہ اٹھائے کہ اس کی حرمت ثابت نہیں ہے۔حالانکہ اگر دیکھا جائے تو قانون یہی ہے کہ اس شئے کی حرمت ثابت نہیں وہ حلال اور مباح ہے۔یعنی قانون کے دائرے کو

تو وسعت دے دی ہے لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے حلال ہونے کا ثبوت نہیں ہے آپ اُس سے بچ جائیں لہٰذا جو شبہات سے بچ جائے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت و ناموس کو بچا لے گا۔چنانچہ ارشادِ رسول ؐ ہے:

فمن اتقیٰ الشبہات فقد استبرا لدینہ و عرضہ۔

"پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا تو اُس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر دیا"۔

(اربعین نووی۔خطابات جمعہ از ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ۔۳۵۹)

اس ضمن میں ایک ارشادِ رسول ہے:

دع ما یریبک الیٰ ما لا یریبک۔

"یعنی اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے دل میں شک پیدا کرے اور اُس چیز کو اختیار کرو جو تمہارے اندر شک پیدا نہ کرے"۔

یہ حدیث اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ اس بات کی سند عطا کر رہی ہے کہ انسان کا ضمیر اور دل صحیح فتویٰ دیتا ہے ۔بسا اوقات حضورؐ سے کوئی صاحب مسئلہ پوچھتے تھے کہ میں یہ کروں یا نہ کروں تو آپؐ جواب دیتے (استفتِ قلبک) یعنی اپنے دل سے اس بارے میں فتویٰ لے لو۔ بظاہر یہ حکم عام معلوم ہوتا ہے لیکن یہ عام نہیں خاص ہے۔یہ صرف اُنہی لوگوں کیلیے ہے جن کے دلوں میں نورِ ایمان اور کامل یقین موجود ہے۔جن کے دلوں کو ''دلِ زندہ'' کہا گیا ہے۔ اور دلِ زندہ وہ ہوتا ہے جس میں روح ربانی زندہ ہے اور اُس میں حرارت موجود ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۶۰)

<u>ایک اور اہم تقاضا یہ بھی ہے:</u>

کہ انسان کے اسلام کا حسن اس میں ہے کہ وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس کا اُسے کوئی فائدہ نہ ہو۔اہل ایمان کے صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔ (مومنون۔۳) "لغویات سے دور رہتے ہیں "۔

اور لغو کام اسے کہتے ہیں جو بے فائدہ ہو پھر سورہ الفرقان میں عباد الرحمٰن کی صفات بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا گیا کہ :

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ (الفرقان۔۷۲)

"اور جب انھیں بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو باوقار انداز سے گزر جاتے ہیں"۔

یعنی خود لغو کام میں ملوث ہونا تو دور کی بات ہے اگر کہیں اتفاق سے بھی لغو کام کرتے لوگوں کے پاس سے گزر ہو جائے تو وہ متوجہ ہوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ تقویٰ دراصل حدودِ الٰہی کی نگرانی و حفاظت کا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس طرح حاصل ہو کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا اس طرح پابند ہو جائے کہ اگر کبھی جہالت سے بال برابر بھی اس کی پابندی میں فرق آجائے تو ہوش آتے ہی اُس وقت تک کے لیے اس پر کھانے اور سونے کی لذت حرام ہو جائے۔اور جب تک وہ اپنے غلط سمت میں اُٹھائے ہوئے قدم کو واپس نہ لے لے اور استغفار و توبہ کے ذریعے سے اصلاحِ مکافات نہ کر لے۔ اس سوال کا صحیح جواب دین کے خزانہ کی اصلی کلید ہے۔

دُنیا میں انبیا علیہم السلام کا گروہ وہ گروہ ہے جس کا مخصوص کام ہی تقویٰ کی دعوت اور اُس کی تعلیم ہے۔ قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نوحؑ، صالح ؑ اور لوط ؑ اور شعیب علیہم السلام موسٰی اور ہارون علیہم السلام غرض یہ کہ تقویٰ تمام انبیائے کرام کی دعوت کا بالکل ابتدائی نقطہ ہے۔فاتقواللہ وَ اطیعون (پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)پس تقویٰ کی تعلیم کا صحیح طریقہ جاننے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرات انبیاء کرام لوگوں میں کس طرح تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔

انبیاء کا طریقۂ تعلیم تقویٰ:

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ ''ہم نے جہاں تک حضرات انبیاء کے طریقۂ تعلیم تقویٰ کو قرآن مجید سے سمجھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کی فسق و فجور سے بھری دُنیا پر جب نظر ڈالتے ہیں اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہواتِ نفس کی پیروی میں آزادی اور بےقیدی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن پر یہ حقیقت واضح فرماتا ہے۔ کہ انسان کی ان تمام سرکشیوں اور تعدیوں (زیادتیوں) کی بنیاد میں تین چیزیں کام کر رہی ہیں۔

پہلی

یہ کہ لوگوں میں خدا اور اُس کی صفات کا تصور بالکل غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسری

یہ کہ لوگوں میں اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا یا تو سرے سے تصور ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اس تصور میں ایسی خرابیاں

پیدا ہو چکی ہیں کہ انسان کی عملی زندگی پر اس کی گرفت بالکل باقی نہیں رہی ہے۔

تیسری

یہ کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے حدود و محارم کا علم ہی سرے سے مٹ گیا ہے لوگ جانتے ہی نہیں کہ اُن کے نفس کی خواہشوں اور دل کی چاہتوں پر کوئی روک بھی ہے۔

اس وجہ سے حضرات انبیاء کرام اپنی ساری قوت ان تین چیزوں کی اصلاح پر صرف کرتے ہیں۔ اور جس رفتارسے وہ خدا اور اُس کی صفات، آخرت اور اس کے نتائج، احکام الٰہی اور اس کے مصالح لوگوں پر واضح کرتے جاتے ہیں۔ اُس رفتار سے لوگوں میں تقویٰ پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ اپنے کام سے فارغ ہو کر دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں۔ جو مدتوں تک اس تقویٰ کی حرارت لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

(حقیقتِ دین۔ از امین احسن اصلاحی صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۸)۔

آنحضرت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہر آدمی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ مکہ کی زندگی میں آپ نے جس طرح لوگوں کو تقویٰ کی تعلیم دی ہے۔ مکی سورتوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہر شخص ان سورتوں کو سرسری طور پر پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سر تا سر خدا، اُس کی توحید، اُس کی صفاتِ حسنیٰ اورآخرت کے دلائل و احوال سے لبریز ہیں اور اتنی قوت و شدت اور اتنی گوناگوں شکلوں میں ان سورتوں کے اندر یہ مطالب بیان ہوئے ہیں۔ کہ جن لوگوں کو اول اول یہ سورتیں سنائی گئیں اُن کے لیے اس دعوت سے بے پرواہ رہنا اور اپنی طفل تسلیوں کے فریب میں بدستور غافل پڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔اُن کے لیے صرف دوہی صورتیں ممکن رہ گئی تھیں یا تو داعی کی دعوت پر لبیک کہیں اور غفلت کے بستروں کو چھوڑ کر خدا کیطرف بھاگیں یا پھر پوری قوت سے اس پُراثر دعوت کو دبانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ان سورتوں کے نزول کے بعد پورے عرب میں ایک شخص بھی اسلامی دعوت کے بارے غیر جانبدار نہیں رہ گیا تھا۔ یا تو دل و جان سے مخالف بن کر کھڑا تھا اور یا اتنا شدید حامی بن گیا تھا کہ سب کچھ گوارا تھا لیکن اگر نہیں گوارا تھی تو یہ بات کہ کوئی قدم بھی تقویٰ کے خلاف اُٹھے۔ تقویٰ کا اس درجہ شدید احساس کہ خدا کے حکم کی تعمیل کی راہ میں ہر جوکھم آسان ہو جائے، صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں اُن کا علم صاف ہو گیا تھا اتنا صاف کہ اس کے

بعد اُن کے لیے خدا کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس ساری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں:

پہلی بات

یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم ہی آدمی کے اندر وہ بے چینی پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ جو تقویٰ کی اصل حقیقت ہے۔

دوسری بات

یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کا صحیح علم ہی وہ پاسبان ہے۔جو آدمی کے دل کے اندر بیٹھ کر اُس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے احکام و قوانین کی پوری پابندی کرے اور کسی جگہ بھی سرِمُو اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔(ایضاً صفحہ ٣٦٤ تا ٣٦٥) جو لوگ اس سلسلے میں مذکورہ دعاوی پر قرآنی دلائل کی تفصیل سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مذکورہ کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

تقویٰ کے ثمرات:

تقویٰ سے سب کام آسان ہو جائینگے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا۔(سورہ الطلاق آیت نمبر ۴)

"اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے سب کام آسان کر دیں گے"۔

تقویٰ سے مصائب سے خروج ملے گا:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ (سورہ الطلاق آیت نمبر ۲)

اللہ ایسے راستے سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا:

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (سورہ الطلاق آیت نمبر۳)

ان آیات میں تقویٰ کی دو برکتیں بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ تقویٰ اختیار کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ بچنے کا راستہ نکال دیتے ہیں۔ کسی چیز سے بچنا، اس میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے دُنیا کی سب مشکلات و مصائب کے لیے بھی اور آخرت کی سب مشکلات و مصائب کے لیے بھی اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی یعنی گناہوں سے بچنے والے آدمی کےلیے دُنیا و آخرت کی ہر مشکل و مصیبت سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں۔

اور دوسری برکت یہ ہے کہ اُس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جہاں کا اُس کو خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ رزق سے بھی اس جگہ مراد ہر ضرورت کی چیز ہے خواہ دُنیا کی ہو یا آخرت کی۔مومن متقی کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس آیت میں یہ ہے کہ ہر مشکل کو بھی آسان کر دیتا ہے اور اسُ کی ضروریات کا بھی تکفّل کرتا ہے اور ایسے راستوں سے اُسکی ضروریات مہیا کر دیتا ہے جس کا اُس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔
(کذا فی الروح بحوالہ معارف القرآن از مفتی محمد شفیع جلد دوم صفحہ ۴۸٦)

مناسبتِ مقام کی وجہ سے بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ طلاق دینے والے شوہر اور مطلقہ بیوی دونوں یا اُن میں جو بھی تقویٰ اختیار کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ اُس کو طلاق اور انقطاعِ نکاح کے بعد پیش آنے والی ہر مشکل و تکلیف سے نجات عطا فرمائیں گے اور مرد کو اُسکے مناسب بیوی اور عورت کو اُس کے مناسب شوہر عطا فرمائیں گے اور ظاہر ہے کہ آیت کا اصل مفہوم جو تمام مشکلات اور ہر قسم رزق کے لیے عام اور شامل ہے اس میں زوجین کی یہ مشکلات و ضروریات بھی شامل ہیں۔ (روح المعانی بحوالہ معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۴۸٦)

امام احمد اور حاکم بیہقی، ابونعیم وغیرہ نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے اور حاکم نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز اس آیت وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ کی تلاوت باربار فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے نیند آنے لگی پھر فرمایا کہ اے ابوذر اگر سب آدمی صرف اس آیت کو اختیار کر لیں تو سب کے لیے کافی ہے (روح المعانی) کافی ہونے کی مراد ظاہر ہے کہ تمام دینی اور دُنیوی مقاصد میں کامیابی کے لیے کافی ہے (ایضاً صفحہ ۳۸۸)

اللہ تعالیٰ آپ کو فرقان(کسوٹی) عطا کر دے گا:

جس سے برائی بھلائی میں تمیز رہتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

(انفال آیت نمبر ۲۹)

مولانا مودودی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرقان کا مفہوم اُن کے نزدیک کسوٹی کا ہے اور کسوٹی اس چیز کو کہتے ہیں جو کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کو نمایاں کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دُنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو اور تمہاری

خواہش ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو تو اللہ تمہارے اندر وہ قوتِ تمیز پیدا کردے گا جس سے قدم قدم پر تمہیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کونسا رویہ صحیح ہے اور کونسا غلط، کس رویہ میں خدا کی رضا ہے اور کس میں اُس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ ، ہر دوراہے، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہئے اور کدھر نہ اُٹھانا چاہئے۔کونسی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کونسی راہ باطل ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۴۰)

<u>جو شخص تقویٰ سے رہتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو نور سکینہ عطا فرماتے ہیں:</u>
هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ (الفتح:4)
"جس کی وجہ سے وہ ہر وقت باخدا رہتا ہے۔ ایک لمحہ کو اللہ کو نہیں بھول سکتا"۔

<u>جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کا کفارہ کر دینگے اور اُس کا اجر بڑھا دیں گے:</u>
وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَـيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا
(الطلاق۔آیت نمبر ۵)

<u>تقویٰ اور اعمال صالح کے اختیار کرنے سے زندگی پُر لطف اور اطمینان بخش ہو جاتی ہے:</u>
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ (النحل:97) "یہ اللہ کی فرمانبرداری پر اللہ کا وعدہ ہے"۔

<u>اللہ کے نزدیک معزز لوگ وہی ہیں جو تقویٰ سے رہتے ہیں:</u>
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (الحجرات:13)

<u>اللہ کے ولی متقی لوگ ہیں:</u> اِنْ اَوْلِيَاۗؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ (الانفال:34)

<u>تقوٰی سیئات اور برے اعمال کا کفارہ ہے:</u>
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ويغفرلكم ذنوبكم
(انفال آیت نمبر ۲۹)

یعنی خطائیں لغزشیں اور گناہ جھڑ جاتے ہیں اور ایسے اعمالِ صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے۔جواُس کی سب لغزشوں پر غالب آ جاتے ہیں۔اس آیت کے آخر میں یغفرلکم کے الفاظ ہیں:مطلب یہ ہے کہ آخرت میں مغفرت اور سب گناہوں کی معافی ہے۔

قیامت کے دن متقی لوگ ہی عالی مقام ہونگے:
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔
(بقرہ۔آیت نمبر ۲۱۲)
"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہےان کے لے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں ،مگر قیامت کے روز پرہیز گار لوگ انکے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے ۔ رہا دنیا کا رزق !تو اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب دے"۔
تقوی داروں کے لیےجنت، پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی رضا جیسی نعمتیں ہوں گی:
قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (ال عمران آیت نمبر ۱۵)
" کہو : میں تمہیں بتائوں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ، وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہو گی ، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سر فراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے"۔
تقوی دار لوگ اللہ کو پسند ہیں:
بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (ال عمران آیت نمبر ۷۶)
"آخر کیوں اُن سے باز پرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا"۔
اللہ متقیوں کی عبادات قبول فرماتا ہے:
قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (المائدہ۔۲۷)
"اس نے جواب دیا اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے"۔
متقین ہی اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں:
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۔
(اعراف۔۱۵۶)

"مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ اور اُسے میں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے ، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے"۔

غوروفکر

اللہ تعالی کی مخلوقات اورکائنات میں غور وفکر کرنا در حقیقت علوم ومعارف اورتمام کمالات کی کنجی ہے۔ اللہ تبارک و تعالی نے انسان پرمختف عبادتیں فرض کی ہیں ان میں سے بعض عبادتیں قولی ‘بعض فعلی ‘ بعض بدنی اور بعض مالی ہیں‘ اسی طرح بعض عبادتیں ظاہری ہیں اور بعض باطنی ‘انہی میں سے ایک اہم عبادت غور وفکر کی عبادت ہے جس کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے ‘زبان یا کسی اور عضو سے نہیں ہے اسی لیے اس کو خاموش عبادت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے‘ قران وحدیث میں اسکی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔
اللہ تعالی کا ارشاد ہے :
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ١٩١ (آل عمران: ١٩١۔١٩٠)
"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔جو اٹھتے ، بیٹھتے اور لیٹتے ، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) ”پروردگار ، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے ، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے"۔
یہاں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو عقلمند اور ہوش مند قرار دیا ہے۔جو کائنات میں اس طرح غور و فکر کرتے ہیں ۔ کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر بے اختیار بول اُٹھتے ہیں کہ یہ سارا نظام ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اور یہ بے مقصد نہیں بنایا گیا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے دوزخ کے عذاب سے بچانے کی فریاد کرتے ہیں۔اور یہ مشاہدہ اُن کو اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں وہ سراسر حق ہے۔
(تفہیم القرآن جلد اول صفح ٣١١،٣١٢)
آیت مذکورہ میں عقل والوں کی دوسری علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق و پیدائش میں تفکر کرتے ہیں۔مفتی محمد شفیع

اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ اس تفکر سے کیا مراد ہے اور اس کا کیا درجہ ہے۔
فکر اور تفکر کے لفظی معنی غور کرنے اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے اس طرح فکر بھی ایک عبادت ہے۔فرق یہ ہے کہ ذکر تو اللہ جل شانہ کی ذات و صفات کا مطلوب ہے اور فکر و تفکر اُس کی مخلوقات میں مقصود ہے۔ کیونکہ ذات و صفات الٰہیہ کی حقیقت کا ادراک انسان کی عقل سے بالاتر ہے۔ اس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر بجز حیرانی کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بعض اوقات حق جل شانہ کی ذات و صفات میں زیادہ غور و فکر انسان کی ناقص عقل کے لیے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے اکابرین معرفت کی وصیت ہے کہ تفکروافی آیاتِ اللہ ولا تتفکروا فیِ اللہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور و فکر کرو مگر خود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ وہ تمہاری رسائی سے بالاتر ہے۔ (معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۲٦۵ تا ۲٦٦)
البتہ غور و فکر اور عقل کی دوڑ دھوپ کا میدان مخلوقات الٰہیہ ہیں۔ جن میں صحیح غور و فکر کا لازمی نتیجہ ان کے خالق جل شانہ کی معرفت ہے۔۔۔تو یہ غور و فکر معرفت الٰہیہ کا سبب ہونے کی وجہ سے بہت بڑی عبادت ہے۔ اس لیے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا تفکر ساعۃٍ خیر من قیامِ لیلۃ (ابن کثیر)یعنی ایک گھڑی آیات قدرت میں غور و فکر کرنا پوری رات کی عبادت سے بہتر اور زیادہ مفید ہے''۔اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس غور و فکر کو افضل عبادت فرمایا ہے۔(ابن کثیر) حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ جو شخص کثرت سے غور و فکر کرےگا وہ حقیقت سمجھ لے گا اور جو سمجھ لے گا اُس کو علمِ صحیح حاصل ہو جائے گا۔ اور جن کو علم صحیح حاصل ہوگیا وہ ضرور عمل بھی کرے گا (ایضاً صفحہ ۲٦٦ تا ۲٦۷) (ابن کثیر)

عبرت حاصل کرنے کا سامان:

حضرت ابو سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نگاہ پڑتی ہے میں کھلی آنکھوں دیکھتا ہوں کہ اس میں میرے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس کے وجود میں میرے لیے عبرت حاصل کرنے کا سامان موجود ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے قلب کی اصلاح و نگرانی کے لیے شہر سے باہر کسی ویرانہ کی طرف نکل جاتے تھے۔اور وہاں پہنچ کر

کہتے اَینَ اَھلَکَ یعنی تیرے بسنے والے کہاں گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے کل شی ھالک الا وجھہ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے (ابن کثیر) اس طرح تفکر کے ذریعے آخرت کی یاد اپنے قلب میں مستحضر کرتے تھے----

بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائنات عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اُس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے۔ آج کی سائنٹفک اور حیرت انگیز ایجادات اور اُن میں الجھ کر رہ جانے والے موجدین کی خداتعالیٰ اور اپنے انجام کار سے غفلت حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہے۔ کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں خداتعالیٰ کی کمال صفت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں اتنا ہی وہ خدا شناسی اور حقیقت آگاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ۔(یوسف۔۱۰۵)

"یعنی آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں۔اُن کی حقیقت و صفت اور اُن کی صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات میں غور و فکر کرکے اس کی عظمت و قدرت کا استحضار ایک اعلیٰ عبادت ہے ۔ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کرنا سخت نادانی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۶۷ تا ۲۶۸)

سب سے اعلیٰ، اجل، اور نافع ترین غور و فکر وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لیے ہو۔ جو فکر اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے۔ حافظ ابن قیم کے نزدیک اُس کی چند اقسام یہ ہیں:۔

اوّل:اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آیتوں پر غور و تدبر کیا جائے:

آیتوں کی مراد پوری عقل و بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ فہم و ادراک سے کام لیا جائے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اس لیے اُتارا ہے کہ اس پر غور و تدبر کیا جائے۔ اسے سمجھا جائے۔ یہ محض تلاوت کے لیے نہیں اُتارا گیا بلکہ تلاوت اس لیے لازم کی گئی ہے کہ یہ فہم و ادراک کا ذریعہ ہے۔ بعض سلف صالحین کا قول ہے:

انزل القرآن لِیعَمل بہ فَاتَّخِذوا تِلاَوَتَہ عَمَلاً۔
"قرآن اس لیے اُتارا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا تم عمل کے لیے تلاوت کرو"۔
دوم:روزمرہ مشاہدے سے گزرنے والی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور و تدبر کیا جائے:
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی نشانیوں اور علامتوں پر غور و تدبر کا حکم دیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کا امر فرمایا ہے اور اس سے غفلت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے۔
سوم:خدا کی بخششوں اور اس کے احسانات پر غور و فکر کیا جائے:
کہ اُس نے اپنے بندوں پر کیسے کیسے احسانات و انعامات کیے ہیں۔ اس کی مغفرت و رحمت، اور حلم و بردباری کس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے۔
غور و فکر اور فکر و تامل کی یہ تین قسمیں ایسی ہیں جو قلب انسانی کو معرفتِ الٰہی،محبت خداوندی خوف و رجاء اور اُمید و بیم سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ دائمی غور و تدبر کے ساتھ اگر ذکر خداوندی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے تو قلب انسان معرفت الٰہی اور محبت خداوندی کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاتا ہے۔
چہارم: عیوب نفس، آفاتِ نفس، اور عیوب عمل پر غور و تدبر کیا جائے:
یہ غور و تدبر نہایت نفع بخش ہے۔ دُنیا و آخرت کی بڑی بڑی بھلائیاں اس سے وابستہ ہیں۔ یہ غور و تدبر ہمہ قسم کی خیر و فلاح کا دروازہ ہے۔یہ نفس امارہ کی قوتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اس سے نفس امارہ اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ بُرائیوں کے حکم سے اسے رک جانا پڑتا ہے۔نفس امارہ جو ٹوٹ گیا تو پھر نفس مطمئنہ اطمینان اور خوش عیشی سے اپنا وقت گزارتا ہے اور ہر طرح کے ثمرات سے مستفیذ ہوتا ہے۔ حکم و فرمانروائی بھی اسی کی جاری رہتی ہے۔۔۔۔
پنجم:وقت کے واجبات اور ضروریات اور وظیفۂ اعمال پر غور و تدبر کیا جائے اور عزم و ہمت کی تمام تر توجہات انہی چیزوں کی طرف موڑ دی جائیں۔ چنانچہ عارف انسان وقت کا بیٹا ہوتا ہے:
انسان اگر وقت کی قدر نہ کرے اور اُسے ضائع کردے۔ تو وہ گزرے ہوئے وقت کا کبھی تدارک نہیں کر سکتا۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت

کا نام عمر ہے۔ نعیم مقیم، جنت کی دائمی زندگی کا اصل مادہ اور مواد بھی وقت ہے۔ پس انسان کا وہ وقت جو صرف اللہ کے لیے ہو۔ وہی اُس کی زندگی اور اُس کی عمر کا حقیقی مواد ہے۔ اس کے سوا دوسرا وقت زندگی میں محبوب ہی نہیں ہو سکتا۔ انسان خواہ کتنی ہی طویل زندگی پالے اُس کی یہ زندگی چوپایوں اور جانوروں کی زندگی ہوگی۔ جس انسان کا وقت غفلت، شہوت رانی، باطل تمنّاؤں اور فاسد آرزؤں میں بسر ہو رہا ہو۔ اُس کا سونا اُس کے جاگنے سے بہتر ہے۔اُس کا دُنیا میں جینا ہی بے کار ہے۔ اُس کے حق میں زندگی سے موت بہتر ہے۔ نماز کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ بندہ نماز پڑھتا ہے تو نماز میں اُس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا وہ سمجھتا ہے۔ حقیقتاً ایک انسان کی عمر وہی ہے جو اللہ کے لیے اور صرف اللہ کے لیے بسر ہوتی ہے۔ ان خیالات و افکار کے سوا جس قدر بھی افکار ہیں۔ وہ شیطانی وساوس، باطل تمنائیں اور محض فریب ہیں۔

(دوائے شافی حافظ ابن قیم صفحہ ۳۷۴ تا ۳۷۷)

ذکر

امام راغب کے حوالہ سے الذکر کے یہ معانی سامنے آتے ہیں:
- علم کو محفوظ رکھنا۔
- دل اور زبان پر کسی چیز کا حاضر ہونا
- بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا
- اور پھر ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ (المفردات جلد1،از امام راغب اصفہانی:ص387)

المنجد میں اس مادہ (ذک ر) کے ذیل میں آنے والے الفاظ کے معانی میں تسبیح و تمجید کرنا۔ دل میں یاد کرنا۔ کسی کا ذکر کرنا، کسی کام کو اچھی طرح سمجھنا۔ اللہ کا نام لینا، یاد دلانا، وعظ و نصیحت کرنا۔ کسی کام میں باہم مشغول ہونا۔ حفظ کرنا۔ شرف و بزرگی۔ نماز و دعا۔ یاد آوری وغیرہ۔
(قرآن کے کثیر المعانی الفاظ حصہ اول ،از صابر شاہ فاروقی:ص376)
قرآن کریم کے دوسرے ناموں کے علاوہ ایک نام الذکر بھی ہے اسی طرح رسولوں کو مذکّر کہا گیا ہے۔یعنی قرآنِ کریم اور رسول لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُس کے ساتھ کیے گئے میثاق الست کی یاددہانی کراتے ہیں اور وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔
حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکراللہ کی تفسیر ہی اطاعت و فرمان برداری سے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:فمن لم یطعہ لم یذکرہ وان کثرۃ صلٰوتہ و تسبیحہ۔یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی اُس نے اللہ کو یاد نہیں کیا۔ اگر چہ ظاہر میں اُس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔
قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویز منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی، یعنی اُس کے احکام حلال و حرام کا اتباع کیا اُس نے اللہ کو یاد کیا۔ اگر چہ اُس کی نفل نماز روزہ وغیرہ کم ہوں۔اور جس نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اُس نے اللہ کو بُھلا دیا اگرچہ بظاہر اُس کی نماز روزہ تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔ اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اُس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکراللہ کے برابر نہیں۔ اور ایک حدیث قدسی بروایت ابوہریرہ میں ہے۔ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور

میرے ذکرسے اُس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔
(معارف القرآن از مفتی محمد شفیع صفحہ ۲۹۲ تا ۲۹۳)

قرآن و حدیث میں کثرتِ ذکر کی ہدایت کی گئی ہے:

یہ امر قابل غور ہے کہ شریعت میں ذکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن ذکر کے متعلق ارشاد ہے:وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (الجمعہ:10)

وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر کے سوا سب عبادات کے لیے کچھ شرائط اور قواعد ہیں۔جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں۔بخلاف ذکر کے کہ اس کو انسان کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے، باوضو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت انجام دے سکتا ہے۔ (معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۲۶۵)

بلکہ کثرت ذکر کی اہمیت کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے کہ :

عن أبي سعيد عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذكروا الله حتى يقولوا مجنون۔

(مسند احمد۳/۶۸،۷۱)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ''اللہ کو خوب یاد کرو یہاں تک کہ لوگ کہیں یہ مجنون شخص ہے۔

یعنی خدا کی یاد میں اور اس کے تقاضےپورے کرنے میں، اس طرح یکسوئی کے ساتھ مشغول ہو رہو کہ لوگ مجنون کہنے لگیں۔ ظاہر بات ہے کہ دین کے کام میں جب آدمی ہمہ تن مشغول ہوگا خدا کے دین کے مطابق اُس کی سرگرمیاں ہونگی اور حلال و حرام کی تمیز کے ساتھ زندگی بسر کرے گا تو مادی نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ اُسے پاگل ہی سمجھیں گے۔ (زادِ راہ از مولانا جلیل احسن ندوی صفحہ ۱۸۴)

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُـوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (الاحزاب:41،42)

"اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو ، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۱۹۱ (ال عمران:۱۹۱)

"جو اٹھتے ، بیٹھتے اور لیٹتے ، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیا ر

بول اٹھتے ہیں) ”پروردگار ، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے ، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اےرب ، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے"۔
وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب:۳۵)
"اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں ، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیاکر رکھا ہے"۔
اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا ہے۔ یہ کیفیت اُس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک کہ اُس کے دل میں خدا کا خیال رچ بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اُس کے تحت الشعور اور لا شعور تک میں جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اُس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا۔اُس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا، فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا۔ سوئے گا تو اللہ کو یاد کرکے سوئے گا اُٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے بات چیت میں بار بار اُس کی زبان سے بسم اللہ، الحمد للہ، ان شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اسی طرح کے دوسرے کلمات نکلتے رہیں گے۔اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا۔ ہر نعمت ملنے پر شکر ادا کرے گا۔ ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلبگار ہوگا۔ ہر مشکل میں اُس سے رجوع کرے گا۔ہر برائی کا موقع سامنے آنے پر اُس سے ڈرے گا۔ ہر قصور سرذد ہونے پر اُس سے معافی چاہے گا۔ ہر حاجت پیش آنے پر اُس سے دُعا مانگے گا۔ غرض اُٹھتے بیٹھتے اور دُنیا کے سارے کام کاج کرتے ہوئے اُس کا وظیفہ خدا کا ذکر ہوگا۔یہ چیز در حقیقت اسلامی زندگی کی جان ہے۔ دوسری جتنی بھی عبادات ہیں اُن کے لیے بہر حال کوئی وقت ہوتا ہے جب وہ ادا کی جاتی ہیں لیکن یہ وہ عبادت ہے جو ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اور یہی انسان کی زندگی کا مستقل رشتہ اللہ اور اُس کی بندگی کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ خود عبادات اور تمام دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض اُن خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب اور اُس کی زبان دائماً اُس کے ذکر سے تر رہے۔
رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
عن سهل بن معاذ عن أبيه عن رسول الله صلى الله عليه و سلم : أن رجلا سأله فقال أي الجهاد أعظم أجرا قال أكثرهم لله تبارك

وتعالى ذكرا قال فأي الصائمين أعظم أجرا قال أكثرهم لله تبارك وتعالى ذكرا ثم ذكر لنا الصلاة والزكاة والحج والصدقة كل ذلك رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول أكثرهم لله تبارك وتعالى ذكرا۔

"معاذ بن انس جهنی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے فرمایا جو اُن میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔ اُس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا جو اُن میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ پھر اُس شخص نے اس طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا۔ حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا۔کہ جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو"۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۹۶ تا ۹۷)

<u>ذکر کی قسمیں:</u>

مولانا گوہر رحمان کے نزدیک ''ذکر الٰہی کی تین قسمیں ہیں۔ ذکر بالقلب، ذکر باللسان اور ذکر بالعمل۔ اور ان کے درمیان جب یک رنگی اور ہم آہنگی ہوگی۔ تو اس صورت میں ذکر الٰہی تزکیۂ النفوس اور اصلاحِ قلوب کے لیے شفا اور کیمیا ثابت ہوگا''۔

<u>ذکر قلبی</u>

یہ ہے کہ دل میں اللہ کی معرفت و خشیت، خوف ورجا اور عظمت و محبت حضور و شعور کے ساتھ موجود ہو۔ قلب سلیم کی یہی صفات و ملکات ذکر الٰہی کا منبع اور سرچشمہ ہیں''۔

<u>ذکر باللسان:</u>

زبان جب اللہ کے اسماء حسنٰی، اس کی حمد و تسبیح اور تکبیر و تحصیل کے کلمات سے ترو تازہ رہے تو اس کے اسماء و صفات کا ذکر قبولیت دُعا کا وسیلہ بھی ہے اور نزولِ رحمت و سکینت کا ذریعہ بھی ہے۔ عبداللہ بن امرؓ کی حدیث میں ہے کہ بہترین عمل یہ ہے کہ :

''ان تفارق الدنیا و لسانک رطب من ذکر اللہ۔ (ترمذی)

''تم دنیا کو اس حال میں چھوڑو کہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔''

<u>ذکر بالعمل:-</u>

جس طرح ذکر بالقلب کے بغیر ذکر باللسان موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا اس طرح عمل کے بغیر صرف زبانی ذکراصلاحِ نفس کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔جب زبان پر اللہ کا نام ہو اور عمل اللہ کے

احکام کے خلاف ہو تو قول و عمل کا یہ تضاد باعث رحمت نہیں ہو سکتا۔ ارشاد ربانی ہے:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ (الصف:3)

"اللہ کے نزدیک یہ بڑی بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق عمل نہ کرو"۔

عمل سے اللہ کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے۔ اور غیر اللہ کی عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ اس کی شریعت کی اطاعت کی جائے۔ اور غیر شرعی قوانین سے بغاوت کی جائے۔

قرآن کی ذیل آیت میں ذکر الٰہی سے مراد ذکر بالعمل ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔
(البقرہ۔۱۵۲)

"لہٰذا تم مجھے یاد رکھو ، میں تمہیں یاد رکھوں گا ، اور میرا شکر ادا کرو ، کفرانِ نعمت نہ کرو"۔

واشکرولی فاذکرونی کی تفسیر ہے اس لیے کہ شکر صرف زبان سے "شکر الحمد للہ" کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقی شکر یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔ اور اُس کی عطا کردہ نعمتوں کو اُسی کی رضا کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔ امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں:

"سعید بن جبیر تابعی نے فرمایا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو میں تم کو اجر اور مغفرت کے ساتھ یاد کرونگا۔ ذکر اللہ کی اطاعت کو کہتے ہیں پس جو شخص اُس کی اطاعت نہیں کرتا وہ اُس کا ذکر نہیں کرتا اگرچہ اُس کی تسبیح و تحلیل اور قرأت قرآن زیادہ ہو"۔

امام نووی فرماتے ہیں:

حضرت عطاء بن ابی رباح نے کہا ہے کہ مجالس ذکر سے مراد وہ مجالس ہیں جن میں حرام و حلال، خرید و فروخت، نماز، روزے، نکاح و طلاق اور حج وغیرہ کے احکام بیان کیے جاتے ہوں (یعنی مجالس تعلیم و تعلم) ۔۔عطاء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس نے پانچ نمازیں اُن کے پورے حقوق کے ساتھ پڑھنے کی عادت بنالی ہو وہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والوں میں شامل ہے۔"

صحابہ کے تربیت یافتہ ان دو تابعین کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ نمازیں پڑھنا اور دوسرے اعمالِ صالحہ ادا کرنا بھی ذکر الٰہی ہے۔ اور دینی علوم کی مجالس بھی ذکر کی مجالس ہیں۔اس طرح دعوت و تبلیغ،تربیت و تعلیم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اجتماعات

بھی مجالس ذکر ہیں۔ بشرطیکہ ہدف اور مقصد اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اسلام کی اشاعت و اقامت ہو ۔
(تفہیم المسائل حصہ پنجم از مولانا گوہر رحمان صفحہ ۵۳۳ تا ۵۵۵)

ذکر اللہ، اس کے طریقے اور آداب:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَــهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۔
(الاعراف۔۲۰۵)

"اے نبی ، اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ ۔ تم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ صرف ذکر قلبی یعنی معانئی قرآن اور معانئی ذکر کے تصور اور تفکر پر اکتفا کرے۔ زبان کو بالکل حرکت نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت دے مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں۔یہ دونوں طریقے ذکر کے، ارشادِ ربانی وَاذکُر فِی نَفسِکَ میں داخل ہیں۔

اور **تیسرا طریقہ** یہ ہے کہ استحضار قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی۔ مگر اس طریق کے لیے ادب یہ ہے کہ آواز کو زیادہ بلند نہ کرے۔ متوسط حد سے آگے نہ بڑھائے۔ یہ طریقہ ارشادِ قرآنی وَ دُونَ الجھرِ مِن القَولِ میں تلقین فرمایا گیا ہے۔قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مذید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے۔

وَلَا تَجْــهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا،
(بنی اسرائیل:110)

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اپنی قرأت میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفاء بلکہ جہر اور اخفاء کے درمیانی کیفیت رکھا کریں ۔

نماز میں قرأت قرآن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کو یہی ہدایت فرمائی ۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر رات میں گھر سے نکلے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کررہے تھے، پھر حضر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مکان

پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے، جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے صدیق اکبر سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے، صدیق نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے، اسی طرح فاروق اعظم سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کررہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ قرأت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ صدیق اکبر کو یہ ہدایت کی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور فاروق اعظم کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں ۔
(ابوداؤد)

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہراً کرتے تھے یا سِرًّا ؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہراً کبھی سراً دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔

رات کی نفل نماز میں اور خارج نماز تلاوت میں بعض حضرات نے جہر پسند کیا بعض نے آہستہ کو، اسی لیے امام اعظم ابو حنیفہ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے تلاوت کرے، البتہ آواز سے تلاوت کرنے میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں، اول یہ کہ اس میں نام و نمود اور ریاء کا اندیشہ نہ ہو، دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کا حرج یا تکلیف نہ ہو، کسی دوسرے شخص کی نماز و تلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو، اور جہاں نام و نمود اور ریاء کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

اور جو حکم تلاوت قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار و تسبیح کا ہے کہ آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع و خضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو ۔

اور اس کا فیصلہ کہ سراً اور جہراً میں سے افضل کیا ہے، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے، بعض لوگوں کے لیے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کے لیے آہستہ، نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سراً۔ (تفسیر مظہری و روح البیان وغیرہ)

<u>دوسرا ادب تلاوت اور ذکر کا یہ ہے</u> کہ عاجزی اور تضرع کے ساتھ ذکر کیا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالی کی

عظمت و جلال مستحضر ہو اور جو ذکر کررہا ہے اس کے معنی و مفہوم پر نظر ہو ۔

تیسرا ادب اسی آیت میں لفظ خیفہ سے یہ بتلایا گیا کہ ذکر و تلاوت کے وقت انسان پر ہیبت اور خوف کی کیفیت ہونا چاہئے، خوف اس کا کہ ہم اللہ تعالی کی عبادت اور عظمت کا حق ادا نہیں کرسکتے، ممکن ہے کہ ہم سے کوئی بے ادبی ہوجائے، نیز اپنے گناہوں کے استحضار سے عذاب الٰہی کا خوف نیز انجام اور خاتمہ کا خوف کہ معلوم نہیں ہمارا خاتمہ کس حال پر ہونا ہے، بہرحال ذکر و تلاوت اس طرح کیا جائے جیسے کوئی ہیبت زدہ ڈرنے والا کیا کرتا ہے۔

یہی آداب دعا اسی سورہ اعراف کے شروع میں بھی ایک آیت میں اس طرح آئے ہیں (آیت) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، (الاعراف:55)اس میں خیفۃ کے بجائے خفیۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے ہیں، گویا ذکر و تلاوت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آہستہ پست آواز سے کیا جائے، لیکن اس آیت نے اس کے معنی بھی واضح کردیئے کہ اگرچہ آواز سے ذکر کرنا بھی ممنوع نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند کرے، نیز اتنی بلند نہ کرے جس میں خشوع خضوع اور عاجزی و تضرع کی کیفیت جاتی رہے۔

آخر آیت میں ذکر و تلاوت کے اوقات بتلائے کہ صبح و شام ہونا چاہئے اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ کم از کم دن میں دو مرتبہ صبح اور شام ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح شام بول کر مراد تمام لیل و نہار کے اوقات ہوں جیسے مشرق مغرب بول کر سارا عالم مراد لیا جاتا ہے، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ انسان پر لازم ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں ذکر و تلاوت کا پابند رہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ (معارف القرآن جلد چہارم صفحہ نمبر۱۶۶ تا ۱۶۹)

اس بارے میں ابن کثیر فرماتے ہیں:۔اللہ حکم دیتے ہیں کہ اُسے دن کے شروع میں یاد کیا جائے۔ دن کے آخر میں یاد کیا جائے اور بڑی کثرت سے یاد کیا جائے۔ اور سید قطب شہید فی ظلال القرآن صفحہ ۱۶۸ میں فرماتے ہیں کہ تضرعاً و خیفۃً کے معنی یہ ہیں کہ ’’اللہ کودل میں نہایت عاجزی اور خوف و رجا کی حالت میں یاد کرو زبان سے بھی ذکر الٰہی کرو مگر جہراً نہ کرو بلکہ ہلکی ہلکی آواز میں۔ ذکر الٰہی کامستحب طریقہ یہی ہے کہ یہ چیخ و پکار کی صورت میں نہ ہو۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت موجود ہے کہتے

ہیں کہ سفرونمیں سے کسی سفر میں لوگوں نے بلند آواز میں اللہ تعالیٰ کو پکارنا شروع کر دیا۔اُن سے حضورؐ نے فرمایا ‘‘اے لوگو!ذرا اپنی آواز کو پست اور محدود رکھو تم نہ کسی غائب ذات کو پکار رہے ہو۔ اور نہ کسی گونگی بہری ذات کو۔ جسے تم پکار رہے ہو وہ سمیع بھی ہے قریب بھی ہے اور وہ تم میں سے ہر شخص کی سواری کی گردن سے زیادہ قریب ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ان نصوص میں جس ذکر کے بارے میں کہا گیا ہے۔ وہ صرف زبانی ذکر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد قلبی ذکر ہے۔ اس لیے کہ جس ذکرمیں سے مومن اور ذاکر کا دل مرتعش نہ ہو جس سے آدمی کا وجدان اور شور متاثر نہ ہو۔ جس ذکر کا اثر انسان کی ذات اور اعمال پر نہ ہو۔اور وہ ذکر عاجزی، تضرع اور خوف کے ساتھ نہ کیا جائے۔تو اُسے ذکر نہ سمجھا جائے گا۔ بلکہ بعض حالات میں تو وہ اللہ کی شان میں گستاخی تصور ہوگا۔ ذکر کا مفہوم تو یہ ہے کہ انسان نہایت عاجزی، ادب، اور نہایت ہی خوف و رجا کی حالت میں اللہ کو یاد کرے اور اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اللہ کی عظمت اور جلالتِ شان کا تصور بھی کیا جائے۔ اور دُعا کی جائے کہ انسان اللہ کے غضب سے محفوظ ہوں۔ صرف اس ذکر سے انسان کو روحانی جلا نصیب ہو سکتی ہے۔

(فی ظلال القرآن از سید قطب شہید صفحہ ۱۶۸ تا ۱۶۹)

قرآن مجید کی تلاوت بہترین ذکر الٰہی ہے:

قرآن کریم کا ایک نام ‘‘الذکر’’ہے (جس کی تفصیل ہم عزیمت کے ذرائع باب سوم میں بیان کریں گے) اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں اپنے بندوں کو اُن کی آخرت یاد دلائی ہے اور اُن کو اپنے احکام و فرائض یاد دلائے ہیں اور سمجھائے ہیں تاکہ وہ زندگی کے مقصد کو بھول نہ جائیں۔ اس نام اور اس کی مذکورہ وجۂ تسمیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کی تلاوت بہترین ذکر الٰہی ہے۔بشرطیکہ یہ تلاوت اخلاص اور شعور وحضور کے ساتھ کی جائے۔ کیونکہ دل کی صفائی اور رقت و سوز کا مؤثر ترین ذریعہ تلاوتِ قرآن ہے۔ جیسا کہ رسولؐ نے فرمایا ہے:

"دلوں پر زنگ پڑ جاتا ہے جس طرح کہ پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ اس زنگ کے دور کرنے کا کیا ذریعہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت کرنا"۔ (شعب الایمان للبیہقی)

اللہ تعالیٰ کسی دوسرے ذکر سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا قرآن کی تلاوت سے خوش ہوتا ہے۔ حدیث قدسی ہے۔ ‘‘اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

جس شخص کو قرآن کے پڑھنے پڑھانےنے میرا ذکر کرنے اور مجھ سے سوال و دُعا کرنے سے مشغول کر لیا ہو تو میں اُسے اس سے زیادہ دوں گا جو مانگنے والوں کو دیتا ہوں۔ اور اللہ کے کلام کی عظمت باقی کلاموں پر اتنی زیادہ ہے جتنی اللہ کی عظمت اُس کی محلوق پر ہے۔ (ترمذی) (تفہیم المسائل حصہ پنجم از مولانا گوہر رحمان صفحہ ۵۴۸، ۵۴۹)

اللہ کا ذکر ہی اکبر ہے:

ولذکراللہ اکبر (سورہ عنکبوت آیت نمبر۴۴)

اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ **ایک یہ کہ** اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اس سے بزرگ تر ہے۔ اس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر اُبھارنے والی اور سبقت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز ہے۔ **دوسرا مطلب یہ ہے** کہ اللہ کی یاد بجائے خود بڑی چیز ہے۔ خیر الاعمال ہے۔ انسان کا کوئی عمل بھی اس سے افضل نہیں ہے۔ **تیسرا مطلب یہ ہے** کہ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے اُس کو یاد کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:فاذکرونی اذکرکم (البقرہ آیت ۱۵۲) تم مجھے یادکرو میں تمہیں یاد کرونگا''

پس جب بندہ اللہ کو یاد کرے تو لامحالہ اللہ بھی اُس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے اس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔

ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے جسے حضرت ابوالدرداؓ کی اہلیہ محترمہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے یا زکوٰۃ دیتا ہے یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لامحالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے۔ تبھی تو وہ نیک عمل اُس سے صادر ہوتا ہے۔ اس طرح جب آدمی کسی برائی کے مواقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی یاد کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یاد الٰہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ (تفہیم القرآن جلد نمبر۳ صفحہ ۷۰۷ و ۷۰۸)

اللہ تعالیٰ کی انسان کو تنبیہ کہ وہ غفلت میں نہ پڑے:

سورہ الاعراف کی آیت نمبر205کے آخر میں فرمایا گیا۔ کہ "اللہ کی یاد کو چھوڑ کر غفلت والوں میں شامل نہ ہو جانا"۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں''یہ آخری نصیحت ہے جو خطبہ کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمہارا حال کہیں

غافلوں کا سا نہ ہوجائے۔ دُنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اُس کا رب ہے۔ اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دُنیا میں اس کو آزمائش کے لیے اور دُنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اُسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ پس جو شخص راہِ راست پر چلنا اور دُنیا کو چلانا چاہتا ہو۔ اُس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے۔کہ یہ بھول کہیں خود اُس کو لاحق نہ ہو جائے۔ اس لیے نماز اور ذکر الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے
(تفہیم القرآن جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۱۵)

اللہ کے ذکر سے غافل شخص کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے:

ارشاد ہے وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف:۲۸)
"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریقِ کار اِفراط و تفریط پر مبنی ہے"۔
ذکر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُس شخص کی بات نہ مانو۔ اُس کے آگے نہ جھکو، اُس کا منشا پورا نہ کرو اور اُس کے کہے پر نہ چلو جس کے دل کو ہم نے اپنی یادسے غافل کر دیا ہے۔ اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔ ایسا شخص خدا کو بھول کر نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ اُس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حق کو چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑکر بگٹٹ چلنے والا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے اب ظاہر ہے جو آدمی اطاعت کرے گا وہ خود بھی اس کی طرح گمراہی میں پڑ جائے گا۔
(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۔۲۳)

ذکر کے فضائل اور ثمرات

ذکر کرنے والوں کو اللہ یاد کرتا ہے:

ذکر کے فضائل بے شمار ہیں۔ اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے۔ کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں۔سورہ بقرہ میں ارشاد ہے فاذکرونی اذکرکم آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعتِ احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا۔ ابو عثمان نہدیؒ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ

آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ فرمایا اس لیے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُسے یاد کرتے ہیں۔اس لیے یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہونگے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔
(معارف القرآن جلد اول صفحہ ۳۹۲)

اللہ کا ذکر شیطان سے بچاتا ہے:

ارشاد رسولؐ ہے :

قال رسول اللہ امرکم بذکر اللہ کثیرا و مثل ذالک کمثل رجل طلبہ العدو سراعاً حتیٰ اتٰی حصاً فاحرز نفسہ و کذلک العبد لا ینجو من الشیطان الا بذکر اللہ۔

(ترمذی ۔ترغیب کتاب الذکر)

"رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ کہ اللہ کو زیادہ یاد کرو اور ذکر کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی آدمی کا اُس کے دشمن نہایت تیزی کے ساتھ پیچھا کر رہے ہوں یہاں تک کہ اُس آدمی نے بھاگ کر ایک مضبوط قلعے میں پناہ لی۔اور دشمنوں سے بچ گیا۔ اسی طرح بندہ شیطان سے نجات نہں پا سکتا مگر اللہ کی یاد کے سہارے"۔

اللہ کی یاد سے مراد ہے کہ انسان اُس کی ذات و صفات ، اُس کی عظمت و جبروت، اُس کا رحم و کرم، اُس کا بطش و انتقام غرض جملہ صفاتِ الٰہی کا پورا شعور رکھتا ہو۔ اور یہ شعور زندہ اور طاقتور ہو تو انسان اپنے نہ دکھائی دینے والے دشمن ابلیس کے حملوں سے بچ سکتا ہے۔اور اس کی عملی تدبیر یہ ہے کہ آدمی ٹھیک سے فرض ادا کرے۔نوافل بالخصوص تہجد کا اہتمام کرے۔ جو دُعائیں حضورؐ نے دن رات کے مختلف اوقات کے لیے سکھائی ہیں۔ اُنہیں یاد کرلے۔ اُن کے معنی و مفہوم کو جانے اور ان کو بار بار پڑھے۔ یہی وہ مضبوط قلعہ ہے جس میں وہ پناہ لے کر شیطان کے حملوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔
(زادِ راہ ازمولانا جلیل احسن ندوی صفحہ ۱۸۳)

ذاکر اور غیر ذاکر کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے:

آپ نے فرمایا :

مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لاَ يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَىِّ وَالْمَيِّتِ

(بخاری)

"جو شخص اپنے رب کاذکر تا ہے اورجو نہیں کرتا ہے ان کی مثال مردہ اور زندہ جیسی ہے"۔

ذاکر۔۔۔خدا کی نظرمیں:

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يقول الله عز وجل: أنا عند ظن عبدي بي، وأنا معه حين يذكرني، إن ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملأ ذكرته في ملأ خير منهم، وإن تقرب مني شبرا تقربت إليه ذراعا، وإن تقرب إلي ذراعا تقربت منه باعا، وإن أتاني يمشي أتيته هرولة۔

(بخاری۔مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرا بندہ مجھ سے جو توقع رکھتا ہے اور جیسا گمان اس نے میرے متعلق قائم کر رکھا ہے وہ ویسا ہی مجھے پائے گا۔ جب وہ مجھے یاد کرتاہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔اگر وہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی جماعت کے ساتھ بیٹھ کر یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر جماعت میں اس کو یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف بالشت بھر بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھ جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف آہستہ آہستہ آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں"۔

اس حدیث میں بندے سے مراد بندہ مومن ہے اور بندہ مومن کا اعتقاد خدا کے بارے میں یہ ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے وہ مغفرت فرمانے والا ہے۔ غرض یہ کہ تمام صفات پر یقین رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ جیسا میرے بارے میں اعتقاد رکھتا ہے ویسا ہی مجھے پائے گا۔ میں اس پر رحمت نازل کروں گا۔ اس کو اپنے رحم و کرم کی چادر میں چھپالوں گا۔اس کی دنیا اور آخرت میں دستگیری کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد کے جملے اس کی بہترین شرح کرتےہیں۔

(زاد راہ از مولانا جلیل احسن ندوی صفحہ ١٨٦ و ١٨٧)

ذکر سے اطمینان قلب میسر آتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَـطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (رعد۔٢٨)

"اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"۔

اہل ایمان کے دلوں میں اللہ کے ذکر سے جو اطمینان پیدا ہوتا ہے اُس کا صحیح علم صرف اُن لوگوں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں ایمان کی بشاشت اور مٹھاس پیدا ہو جائے اور اُن کو اللہ کا فضل حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس ایمانی بشاشت اور طمانیت کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کی کیا کیفیات ہوتی ہیں۔ اُن کو الفاظ کے ذریعے دوسرے لوگوں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ایسے لوگوں تک جن کو یہ معرفت حاصل نہ ہو کیونکہ یہ حقائق و الفاظ کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ اطمینان دلوں میں سرایت کرتا ہے۔ اُن کو سکون اور فرحت دیتا ہے۔ ہمت دیتا ہے۔ وہ امن و سلامتی کا شور پاتے ہیں ایسے اہل معرفت محسوس کرتے ہیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ اُن کو ایک پورا ماحول اپنا دوست اور یار نظر آتا ہے---

ان لوگوں سے بڑا بدبخت اس روئے زمین پر کوئی نہیں ہے جو تعلق باللہ کی وجہ سے اور ذکر الٰہی کی وجہ سے پیدا ہونے والے اُنس و محبت سے بے خبر ہوں۔اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں ہے کہ وہ اس کرۂ ارض کے اُوپر چلے اور اُسے اپنے کائناتی ماحول سے کوئی اُنس و محبت نہ ہو۔اُس سے بڑا کوئی بدبخت نہ ہوگا جو اس دُنیا میں چلےپھرے اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ کیوں آیا ہے اور کدھر جا رہا ہے؟اور اس کے اوپر زندگی کا یہ بوجھ کیوں ڈالا گیا ہے؟ اور اس سے بدبخت اور کون ہوگا جو اس کرۂ ارض پر چلتا پھرتا ہو اور وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے اس لیے بدکتا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کے اور ہر چیز کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف تعلق ہے؟اس سے بدبخت اور کون ہوگا جو سفر حیات طے کر رہا ہے لیکن اکیلا ہے۔ راندہ ہے، گم کردہ راہ ہے۔ اور پہاڑوں اور صحراؤں میں اکیلا پھر رہا ہے۔اور زندگی کا یہ کٹھن سفر وہ اکیلا بغیر گائیڈ کے، بغیر انیس سفر کے اور بغیر ہادی و مددگار کے طے کر رہا ہے۔ اور اسے نشان منزل تک معلوم نہیں۔(فی ظلالِ القرآن سورہ رعد صفحہ ۱۱۱)

ثابت قدمی اور ذکر الٰہی سے دشمن کے مقابلے میں کامیابی نصیب ہوتی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(انفال۔۴۵)

"اےلوگو جو ایمان لائےہو ، جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو گی"۔
دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی اور ذکر الٰہی ہی فتح و نصرت کے حقیقی اسباب ہیں۔ جنگ میں ذکر الٰہی تو ایک دائمی زاد راہ ہے اور مومنین کو اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اور اہل ایمان مجاہدین نے ہمیشہ ذکر الٰہی کو زبان اور دل میں زندہ رکھا۔ اور قرآنِ کریم نے اہل ایمان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔
(فی ظلال القرآن سورہ انفال صفحہ ۲۲۷)

ہجرکی زندگی (مرغوباتِ نفس سے ترکِ وطن تک)

ہجرت کا لفظ عربی زبان میں تین مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ ہجرت کا ایک مفہوم ہے کسی چیز کو ترک کر دینا یا کسی چیز سے لاتعلق ہو جانا۔

قرآن پاک میں یہ لفظ اس مفہوم کے لیے متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے:
وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (المزمل آیت نمبر ۱۰)
"اُن سے اس طرح خوبصورتی اور اچھے طریقے سے لا تعلق ہو جاؤ کہ تمہارا راستہ اُن سے الگ ہو جائے"۔

قرآن پاک سے لوگوں کی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ قیامت کے روز پیغمبر خدائے بزرگ و برتر کے دربار میں شکایت کریں گے اور عرض کریں گے:
وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (الفرقان:22)
"اور رسول □ کہے گا کہ ''اے میرے ربّ ، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنا لیا تھا"۔
ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۔ (المدثر:5) "اور گندگی سے دور رہو"۔
ان سب آیات میں ہجر اور ہجرت کا لفظ ترک کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ہجرت کے دوسرے معنی بدگوئی کے بھی ہیں:

کوئی شخص اگر بدگوئی کرتا ہے تو اُس کی گفتگو کے لیے عربی زبان میں ہاجرات، ہجر اور مہَاجر (بفتح المیم) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کسی چیز کو اس کی برائی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دینے کا مفہوم نکلتا ہے۔

۳۔اس طرح ہجر کے معنی شہر کے بھی ہیں:

اور اس مفہوم میں بھی جدائی کا تصور موجود ہے۔ ایک شخص صحرائی زندگی کی آزادی اور بدویت کو چھوڑ کر شہر میں آبستا ہے۔ اس عمل کے لیے ''ہجر'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔
ان تمام معانی سے ایک مفہوم جو مشترکہ طور پر ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ
"کسی جگہ، کسی مقام یا کسی نظریے یا کچھ لوگوں سے اس طرح جدا ہو جانا کہ اُن سے بالکل علیحدگی ہو جائے۔ ہجرت کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن پاک کی بعض آیات میں ہجرت کا لفظ اسی جامع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ پہلے دی گئی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے"۔

لیکن بعض احادیث میں ایک روحانی اور فکری لاتعلقی کے لیے بھی ہجرت کا لفظ استعمال ہوا ہے:

مشہور حدیث ہے:المهاجر من هجر ما نهى الله عنه۔
(بخاری، سنن ابی داؤد، مسند امام احمد، بیہقی)
"مہاجر وہ ہے جو ہر اُس چیز سے روحانی اور فکری تعلق توڑے جس سے خدا نے منع فرمایا ہے"۔

یہ بات آپ نے اس لیے فرمائی کہ جب مدینہ ہجرت کی گئی تو آپ نے محسوس فرمایا کہ شاید بعض لوگ محض انتقالِ آبادی کو ہجرت سمجھنے لگیں اور ہجرت کا داخلی مفہوم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔اس مفہوم کو لوگوں کے ذہن نشین رکھنے کے لیے آپؐ نے فرمایا کہ ہجرت دراصل ایک اندرونی رویّے اور داخلی طور پر ایک قلبی عمل کا نام ہے۔(اسلام کا قانونِ بین الممالک۔ڈاکٹر محمود احمد غازی صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸)

<u>علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک ہجرت کے تین معانی ہیں:</u>

<u>جسمانی ہجرت:</u>

جسمانی طور پر ان چیزوں، علاقوں،افراد و نظریات سے لاتعلقی اختیار کر لینا جو اللہ اور رسول کے دشمن اور اس کے نظام سے باغی اور اسلامی ریاست کے دشمن ہوں۔

<u>قلبی ہجرت:</u>

انسان دِلی طور پر ان تصورات و نظریات کو ناپسند کرتا ہو جو اسلام کی تعلیم سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

<u>فکری ہجرت:</u>

اس کے مطابق ایک شخص مسلسل فکری سفر اختیار کرتا ہے اور اس فکر کے تحت ہر اُس بات کو قبول کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ جو اسلام اور حق کے منافی ہو۔ اس لحاظ سے ہجرت ایک ایسی فکر اور سوچ کا نام ہے جو ایک مسلمان کو ہر ایسی فکر یا تصور سے لاتعلق کر دے جو مبنی برحق نہ ہو بلکہ مبنی بر باطل ہو۔(ایضاً صفحہ ۲۳۹۔المفردات القرآن جلد دوم از راغب الاصفہانی صفحہ ۵۸۶ تا ۵۸۸)

اس لحاظ سے یہ ایک رویہ اور طرزِ عمل کا نام ہے جو زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اختتام پذیر نہ ہوگا۔اس فکری اور ذہنی ہجرت میں ایسے مواقع بھی آتے رہیں گے۔ جہاں اس کو ان چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے لیے بڑی جرأت، پختگیٔ کردار اور اصابت رائے کی ضرورت پیش آئے گی۔ مسلسل اس طرز عمل کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فکری اور ذہنی عدم آہنگی کے خلاف جہاد ایک مسلمان کو اس جذبۂ ہجرت کے تحت باطل کے خلاف سینہ سپر بھی کر دے گا۔

<u>اس مفہوم کے لحاظ سے بعض شارحین حدیث نے ہجرت کی دو اقسام قرار دی ہیں۔ ایک ظاہری ہجرت اور ایک باطنی ہجرت:</u>

<u>ظاہری ہجرت</u> میں اُن تمام چیزوں کا ترک شامل ہےجو مادی طور پر انسان کو مقاصدِ عالیہ سے غافل کرتی ہیں۔ مادیات سے بالاتر رہنے کی اس جہد مسلسل میں بعض اوقات انسان اپنا سب کچھ حتیٰ کہ گھر بار تک بھی چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے جو ہجرت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔کسی دُنیاوی مفاد کی خاطرنہیں بلکہ اصول کی خاطر، ایک نظریے کی خاطر اور انسانیت کے فلاح و بہود کی خاطر۔ یہ ظاہری ہجرت کی مختلف صورتیں ہیں۔

<u>باطنی ہجرت</u>:یہ انسان کے اندرونی جذبے اور نظریے سے متعلق ہوتی ہے اس ہجرت کا بیان رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے جس کی مثالیں ابھی عرض کی گئیں۔ ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ :

"ایک بار چند صحابہؓ گفتگو کر رہے تھے۔ اور ہجرت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہو رہا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: <u>المهاجر من هجر الخطايا والذنوب''</u>۔(سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مسند احمد، نسائی)

"یعنی مہاجر تو وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں کو چھوڑ دے"۔

اس طرح ایک اور موقع پر فرمایا :

<u>المهاجر من هجر ما نهى الله عنہ</u>

(بخاری، سنن ابی داؤد، مسند امام احمد، بیہقی)

"یعنی مہاجر وہ ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں(منہیات یا نواہی) کو چھوڑنے کے لیے تیار رہے"

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:<u>المهاجر من هجر السوء</u>

(مستدرک حاکم۔مسند امام احمد)

"مہاجر وہ ہے جو ہر قسم کی برائی چھوڑ دے"۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۰)

مفتی محمد شفیع معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

"لغت میں ہجرت۔ہجران اور ہجر کا معنی ہے کسی چیز سے بے زار ہو کر اسے چھوڑ دینا۔اور محاوراتِ عامہ میں ہجرت کا لفظ ترکِ وطن کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں دارلکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں "۔

(روح المعانی)

اور ملا علی قاری نے شرح مشکواۃ میں فرمایا :

کہ کسی وطن کو دینی وجوہ کی بنا پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے (مرقاہ جلد نمبر ۱ صفحہ۔۳۹)

سورہ حشرکی آیت:
الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔
(حشر۔۸)
"جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں"۔ (جو مہاجرین صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو اُن کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہیں۔
(معارف القرآن۔جلد دوئم صفحہ ۵۲۶)
ہجرت کا ادنی درجہ یہ ہے کہ انسان مرغوباتِ نفس اور من چاہی زندگی کو ترک کر کے اللہ تعالی اور اس کے رسول کے بتاے ہوے طریقے پر گامزن ہواور ہر قسم کے گناہوں کو چھوڑ کرفرمان برداری کی روش اختیار کرے یہاں تک کہ اللہ کے لیے اپنوں سے علیحدگی اوراپنے وطن سے نکل جانے سے بھی دریغ نہ کرے یہی ہجرت کا اعلی وارفع مقام ہے۔اللہ تعالی کا فرمان ہے:
وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔
(النساء۔۱۰۰)
"جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا ، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا ، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے ، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے ، اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا ، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے"۔
یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لیے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ اس دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام

ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دار الاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دار الاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کرسکتا ہو اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۸۷ و ۳۸۸)

اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہجرت کرنے والے کیلیے اجر کی ذمہ داری لیتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہ صرف گھر سے ہجرت کے ارادے ہی سے نکلا ہو۔ اور راستے میں اسے موت آلے۔یعنی ابھی اس کی ہجرت مکمل نہیں ہوئی تھی صرف اس ارادے سے گھر سے نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کا اجر اپنے ذمے واجب کر لیا۔

اس سے پہلے آیت نمبر۹۷ میں فرشتوں کا اُن لوگوں سے موت کے وقت کا مکالمہ دیا گیا ہے جو اپنے آپ کو مستضعفین کہ کر بیٹھ رہے اور اپنے اوپر ظلم کیا اور ہجرت نہ کی بغیر کسی مجبوری اور عذرکے۔ وہ فرشتے انہیں کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اُس میں ہجرت کر جاتے۔یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانون الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی۔

(ایضا صفحہ ۳۸۷)

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (الزمر۔۱۰)

"(اے نبی) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو ، اپنے رب سے ڈرو ۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک روّیہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے ۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے ۔ صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

یعنی صرف مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی اختیار کرو:

اور اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے تنگ ہو گیا ہے۔ تو دوسری جگہ چلے جاؤ۔ جہاں یہ مشکلات نہ ہوں۔ یعنی اصل چیز جس پر ثابت قدمی چاہئے۔ وہ اللہ کے دین پر عزیمت کے ساتھ عمل کرنا ہے اور اس میں مشکلات کی پرواہ نہیں کرنی

چاہیے۔۔ بلکہ اللہ پر توکل اختیار کرنا چاہیے۔
(تفہیم القرآن جلدچہارم صفحہ نمبر۳۶۳)

ہجرت کے تقاضے

قربانی:

ہجرت کا یہ رویہ اور طرزِ عمل انسان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اُس میں قربانی کا جذبہ موجزن ہو۔ اور قربانی کا جذبہ اُس وقت موجزن ہو سکتا ہے جب انسان کو مادی مفادات اور دیگر دُنیوی علائق کے مقابلے میں اصول و نظریات زیادہ عزیز ہوں۔ اور اُصول و نظریات کی خاطر مادی علائق کو قربان کر دینے کا جذبہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا اللہ پر ایمان اور آخرت پر یقین مضبوط ترین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں والذین امنو و ہاجروا کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں یعنی ‘‘جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت اختیار کی۔’’ ایک صحابی مدینہ تشریف لائے حضورؐ نے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ جواب دیا ‘‘ ترکتُ اہلی و مالی مھاجراً الی اللہ۔(صحیح مسلم) کہ میں اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کو چھوڑ کر اللہ کی طرف ہجرت کرکے آیا ہوں’’۔ یہ چیز اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب ایمان و یقین انسان کی روح میں سرایت کر چکا ہو۔اس کے بغیر ظاہری اور جسمانی ہجرت تو ہو سکتی ہے مگر داخلی اور روحانی ہجرت نہیں ہو سکتی۔

اخلاص و تزکیہ:

مشہور حدیث ہے ‘‘انما الاعمال باالنیات’’ انسان کے اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور ایک شخص اپنے کردار اور طرزِ عمل کی پشت پر جو اندرونی محرک رکھتا ہے اُسی کے مطابق اُس کو اپنے اعمال کی جزا ملتی ہے اور اسی پر آخرت کے ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی انسان نے ہجرت کرتے وقت اللہ اور اُس کے رسول کی رضا کو پیشِ نظر رکھا ہے تو وہ اللہ اور اسکے رسول کی رضا ضرور حاصل کرے گا۔ اور اگر ہجرت کا مطلوب و مقصود مادی مفاد تھا تو اس ہجرت کا نتیجہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ ایک شخص نے ایک خاتون کی خاطر ہجرت کی جو پہلے ہی مسلمان ہو کر مکے سے مدینے ہجرت کر گئی تھی۔ وہ خاتون کی خاطر ہجرت کرکے مدینہ آگیا اور مسلمان ہو گیا لیکن اُس کو عورت کے نام سے مہاجر اُم قیس کہا جانے لگا۔اس بات کو نمایاں کرنے کے لیے رسولؐ نے اس شخص کی مثال دی:

كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا ، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ.
(صحیح بخاری، سنن ترمذی، سنن نسائی، بیہقی)
"اگر کسی نے دُنیا کی زندگی کے لیے یا بہتر معاشی وسائل کے لیے (روزگار کے لیے) ہجرت کی یا کسی خاتون کی خاطر ہجرت کی۔تو اس کی ہجرت اُسی کے لیے شمار ہوگی۔ اس میں للّٰہیت نہیں پائی جا سکتی"۔

اس طرح دیگر احادیث میں بھی ہجرت کا داخلی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ ان تمام احادیث کا خلاصہ یہ نکلا کہ بُرائی سے رکنا بھی ہجرت اور ہر بُری چیز کو نظر انداز کرنا بھی ہجرت ہے۔ یہ ایسا امر ہے جو انسان کو خود بخود تزکیۂ نفس کی طرف لے جاتا ہے۔

صبر:

ہجرت کے اس تصور کو مؤثر طور پر رُو بعمل لانے کے لیے ایک اور جذبہ جو بہت ضروری ہے۔ وہ صبر ہے۔ اور یہ ایک انسان میں دینی اور روحانی تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہ صبر ایک مثبت اور تعمیری رویے کا نام ہے۔ یہاں صبر کے معنی ہیں ایک موقف پر پختگی اور استقلال سے قائم رہنا اور اس راستے میں پیدا ہونے والی مشکلات کو برداشت کرنا۔یہ ہجرت کے تقاضوں میں سے ایک لازمی تقاضا ہے۔ صبر کا جذبہ نہ ہو تو ہجرت ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ سارے تقاضے یعنی قربانی، اخلاص، تزکیہ اور صبر ہجرت کی روح کے مترادف ہیں۔ یہ چاروں تقاضے جب پورے ہو جاتے ہیں تو انسان خود بخود اس مشق کو مکمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے ہجرت کی گئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ان عناصر اربعہ پر اسلامی تعلیمات میں بہت زور دیا گیا ہے۔ (اسلام کا قانون بین الممالک از ڈاکٹر محمود احمد غازی صفحہ ۲۴۱ تا ۲۴۳)

ہجرت، جہاد، دعوت اور توبہ:

جہاد اور ہجرت اور دعوت ان تینوں میں باہم گہرا ربط ہے۔ ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جہاد اور ہجرت ایک ہی پہلو کے دو رُخ ہیں۔ اور باہم لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن جہاد جس جدوجہد اور جس مسلسل دعوت سے عبارت ہے اُس میں تلوار کا استعمال اور جہاد بالسیف ایک مرحلہ ہے۔ اس عمل کا جس کا ایک حصہ دعوت

ہے۔ اس عمل کا ہی ایک حصہ محاذ جنگ میں توپ و تفنگ کا استعمال بھی ہے۔ اس لیے رسول اللہ نے جہاد اور ہجرت کو متعدد احادیث میں ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ ہجرت اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک جہاد جاری رہے گا۔ اور ظاہر ہے جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہجرت بھی قیامت تک جاری رہے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ جب تک دُنیا قائم ہے جہاد بھی جاری رہے گا۔ یعنی یہ زندگی دراصل حق و انصاف کو قائم کرنے کے لیے اور باطل کے مقابلے اور کفر و شرک کے خلاف جدوجہد کرنے کی غرض سے ایک مسلمان کو دی جاتی ہے۔ پس جس طرح اس جدوجہد کی کوئی انتہا یا نقطۂ تکمیل نہیں ہے۔ اسی طرح ہجرت (فکری و ذہنی) کا بھی کوئی نقطۂ انتہا یا نقطۂ تکمیل نہیں ہے یہ مفہوم قرآن پاک اور احادیث میں جا بجا بیان ہوا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہجرت اور توبہ کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

« لاَ تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتَّى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ وَلاَ تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا۔ (سنن ابی داؤد، دارمی، مسند امام احمد، ابی یعلیٰ، بیہقی)

یعنی جب تک توبہ کی گنجائش موجود ہے (یعنی موت تک) اُس وقت تک ہجرت ختم نہیں ہوتی۔اور توبہ کی گنجائش اُس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوتا (یعنی روز قیامت تک) لہٰذا جب تک توبہ ہے۔ ہجرت بھی ہے۔ یہ داخلی ہجرت ہے کہ انسان ایک غلط نظریے سے اظہار برأت اور باطل تصور سے قطع تعلق کرنے کے لیے اسی طرح تیار رہے جس طرح توبہ کے لیے بھی ہمہ وقت تیار ہے۔ توبہ کی حقیقت کیا ہے کہ انسان ہر وقت اپنی خامیوں کوتاہیوں اور اپنی کمزوریوں کو درست کرنے کے لیے تیار رہے۔ توبہ کے لفظی معنی ہیں لوٹ جانا اور واپس آ جانا۔ انسان غلط راستے پر چل کر واپس لوٹتا ہے تو یہ واپسی توبہ کہلاتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۵ و ۲۴۶)

<u>ہجرت کے فضائل:</u>

قرآن کریم میں جس طرح جہاد کے متعلق آیات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔اس طرح ہجرت کا ذکر بھی قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں متعدد مرتبہ آیا ہے۔ان سب آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

آیاتِ ہجرت میں تین قسم کے مضامین ہیں۔ اول ہجرت کے فضائل دوسرے اس کی دُنیاوی و اُخروی برکات، تیسرے باوجود قدرت کے دارالکفر سےہجرت نہ کرنے پر وعیدیں۔

پہلے مضمون ہجرت کے فضائل کی ایک آیت سورہ بقرہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(البقرہ۔۲۱۸)

"بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے ، وہ رحمتِ الٰہی کے جائز اُمیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے"۔

دوسری آیت سورہ توبہ میں ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـــًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (التوبہ۔۲۵)

"اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اُس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو)۔ اُس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا، مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے"۔

اور تیسری آیت سورہ النساء کی ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(النساء۔۱۰۰)

"جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا ، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے ، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا ، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے"۔

یہ آیت بعض روایات کے مطابق حضرت خالد بن حزام کے بارے میں ہجرت حبشہ کے زمانہ میں نازل ہوئی۔ یہ مکہ سے حبشہ کی طرف

ہجرت کی نیت سے نکلے تھے۔ راستہ میں اُن کو سانپ نے ڈس لیا۔ جس سے اُن کی موت واقع ہو گئی۔بہرحال ان تینوں آیتوں میں دارالکفر سے ہجرت کی ترغیب اور اس کے فضائل کا بیان واضح طور پر آگیا۔

ہجرت کی برکات:

برکات کے متعلق سورہ نحل کی ایک آیت میں ارشاد ہے"
وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔
(النحل۔۴۱)

"جولوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے ، اور آخرت کااجر تو بہت بڑاہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم"۔

سورہ النساء کی آیت کا بھی تقریباً یہی مضمون ہے :
وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا
(النساء۔۱۰۰)

"جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا ، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے ، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا ، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے"۔

آیت کا لفظ مراغم مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونا اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مراغمہ کہہ دیا جاتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں ہجرت کی برکات ظاہرہ و باطنہ کا بیان ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے لیے دُنیا میں راہیں کھول دیتے ہیں۔اور اس کو دُنیا میں بھی اچھا ٹھکانہ دیتے ہیں اور آخرت کے ثواب و درجات تو وہم و گمان سے بالاتر ہیں۔

اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاہد نے رزقِ حلال سے اور حسن بصری نے عمدہ مکان (ٹھکانہ) سے اوربعض دوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزت و شرف سے کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔۔۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ مہاجرین کے لیے قرآن میں فرمایا ہے اُس کو دُنیا نے پورا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ البتہ اس آیت میں شرط یہ ہے کہ ہاجروا فی اللہ کے مصداق ہوں۔ (معارف القرآن جلد دوم صفحہ ۵۲۷
تا ۵۲۹)

<u>ہجرت ماقبل گناہوں کو ختم کر دیتی ہے</u>:

ایک حدیث میں آنحضرت کا ارشاد ہے:

الهجرة تهدم ما كان قبلها۔

"یعنی ہجرت اُن سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کیے ہوں"۔

صبر

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتا ر بڑھتا چلا جائے۔ صبر بہت سے اہم ترین اخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے۔ اور حقیقت میں یہ وہ کلیہ کامیابی ہے جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قرآن کریم میں باربار مومنوں کو صبر اور نماز سے مدد کی تلقین کی گئی ہے (سورہ بقرہ آیت نمبر۴۴ و آیت نمبر۱۵۳) قرآنی آیات کا مدعا یہ ہے کہ اس اخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کیلیے نماز کی پابندی کرو۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۷۴ تا ۷۵)

صبر کی قسمیں:

ابن جوزی کے نزدیک صبر دوقسم کا ہے ایک بدنی: جیسے مشقت کا برداشت کرنا اور عبادت کے مشکل اعمال کا ادا کرنا وغیرہ۔

دوسرا نفسانی:

یہ خواہش کے تقاضے اور طبیعت کی مرغوب چیزوں سے رُک جانا ہے۔ صبر کی یہ قسم اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے متعلق ہو تو اس کا نام عفت ہے۔ اگر میدان جنگ میں صبر ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔اگر غصے کو دبانے میں ہو تو اس کا نام حلم ہے۔ اگر کسی پریشان کرنے والی مصیبت سے ہو تو اس کا نام سینے کی فراخی ہے۔ اگر کسی معاملے کو پوشیدہ رکھنے سے متعلق ہو تو اس کا نام راز کو چھپانا ہے۔ اگر زائد ضروریات سے رکنا ہو تو اس کانام زہد ہے اور اگر تھوڑی سے ضروریات پر مطمئن ہونا ہو تو اس کا نام قناعت ہے۔
دراصل ایمان کے اکثر اوصاف صبر میں داخل ہیں اگرچہ اپنے متعلقات کے اختلاف کی وجہ سے اُن کے نام مختلف ہوں
(منہاج القاصدین ابن جوزی صفحہ ۳۴۱)

بندہ کسی حال میں بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہوتا۔کیونکہ دُنیا میں جو چیز بھی انسان کو ملتی ہے۔وہ دو قسم کی ہے ایک تو وہ ہے جو اُس کے نفس کے خواہش کے موافق ہے جیسے صحت، سلامتی، مال و جاہ، برادری اور دُنیا کا سازوسامان وغیرہ۔ بندہ ان تمام چیزوں میں

صبر کا محتاج ہے۔ کہ وہ اُن کی طرف جھک نہ جائے۔ اور اُن سے لذت حاصل کرنے میں ایسا منہمک نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ ہوں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا ''تکلیفوں سے ہماری آزمائش ہوئی تو ہم نے صبر کیا لیکن جب نعمت و آسائش سے آزمائش ہوئی تو ہم صبر نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

(المنافقون آیت نمبر ۹)

"تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں"۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

(الانفال۔۲۸)

" اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کےلیے بہت کچھ ہے"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(التغابن۔۱۴)

"اے لوگوجو ایمان لائے ہو، تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں اُن سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگُزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔

نعمت میں صبر مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہاں قدرت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری قسم خواہشات کے مخالف ہے۔اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ (۱)**صبر علی الطاعات** اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر (۲) **صبر علی المعصیۃ** اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے صبر (۳)**صبر علی الابتلا** مصائب و مشکلات پر صبر۔ (ایضاً صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۳)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کی پابندی کرے۔ اس کے بارے میں اخلاص سے کام لے۔ اور اس کو شریعت کے تقاضوں کے مطابق انجام دے۔ اس میں جو چیز مددگار ثابت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور بندوں پر اس کے حقوق کو پہچان لے۔ اور اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے۔

طاعات میں بندہ ان پر صبر کرنے کا محتاج ہے کیونکہ نفس طبعی طور پر عبودیت (غلامی) سے بھاگتا ہے۔ پھر بعض عبادتیں ایسی ہیں جنہیں وہ سستی کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے جیسے نماز اور بعض وہ ہیں جنہیں وہ بخل کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے۔ جیسے زکوٰۃ اور بعض کو ان دونوں کی وجہ سے جیسے حج اور جہاد۔

<u>اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ارادہ کرنے والا تین حالات میں طاعت پر صبر کا محتاج ہے</u>

ایک حالت عبادت سے پہلے کی ہے۔ اور وہ ہے نیت کا صحیح ہونا اور ریا کے شائبے سے بھی بچنا۔

ایک حالت عین عبادت کی ہے اور وہ یہ ہے کہ عبادت کے دوران میں اللہ سے غافل نہ ہو اور آداب و سنن کی ادائیگی میں سستی نہ کرے۔ اور عمل سے فارغ ہونے تک صبر کرے کہ کوئی چیز اس میں خلل نہ ڈالے۔

تیسری حالت عمل سے فارغ ہونے کے بعد کی ہے اور وہ ہے ریا اور سمعہ کے لیے عمل کو ظاہر کرنے اور بتانے سے متعلق یعنی ہر اُس چیز سے صبر کرنا جو عمل کو باطل کر دے۔ جس نے صدقہ کرنے کے بعد احسان جتانے اور تکلیف دینے سے صبر نہ کیا اُس نے صدقے کو باطل کر دیا۔

(ایضاً صفحہ ۳۴۲)

<u>اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں سے</u> صبریہ ہے کہ بُرائیوں کو چھوڑ دیا جائے اور گناہوں سے دور رہے۔ اس کے حصول میں جو چیز معاون ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا عذاب آدمی کے دل میں ہر وقت مستحضر رہے۔ اور اس استحضار کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے حیا کرے۔ اور اس کے ساتھ محبت رکھے۔ اس کے علاوہ صبر کے ثمرات کو مستحضر رکھنا بھی اس میں ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ آدمی کا ایمان برقرار رہے گا اور اسے تقویت حاصل ہوگی۔ کیونکہ گناہ یا تو ایمان کو ناقص کر دیتے ہیں یا اُسے کمزور بنا دیتے ہیں۔

<u>مصائب و مشکلات پر صبر</u> اس طرح ہو تا ہے۔کہ مشکلات کو برداشت کیا جائے۔ اس پر ناراضی کو ترک کیا جائے اور لوگوں سے کوئی شکوہ و شکایت نہ کی جائے۔ اس لیے کہ مخلوق سے شکوہ و شکایت صبر جمیل کے منافی ہے۔ البتہ اللہ کے ہاں شکوہ صبر کے منافی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (یوسف)
"اُس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا"۔
حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:
اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۔ (سورہ ص۔۴۴)
"ہم نے اُسے صابر پایا۔بہترین بندہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا"۔
اس صبر کیلیے آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرے۔ جو بے حساب ہیں۔ اس طرح مصیبت زدہ کے لیے اُس مصیبت کو برداشت کرنا آسان ہوتا ہے اور اُس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔
صبر کی تمام قسمیں اس معنی میں اللہ کے بھروسے پر ہوتی ہیں کہ مومن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ گویا اللہ ہی اُس کو صبر دلانے والا ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔(النحل آیت ۱۲۷۔)
"اے نبی! صبر سے کام کیے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ کی توفیق سے ہے"۔
(اُصولِ دعوت از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۵۴۷)

صبر کے آداب:

نفس پر جو صبر شاق گزرتا ہے اور جس پر بہت ثواب ملتا ہے وہ مصائب کے ہجوم اور اُن کی شدت کے وقت کا صبر ہے۔ اور جب صدمے کی شدت کم ہو جاتی ہے تو ہر کوئی صبر کر لیتا ہے۔ صبر وہی معتبر ہے جو صدمے کے آغاز میں ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔انما الصبر من الصدمۃ الاولیٰ پہلے صدمہ پر صبر کرنا ہی صبر ہے۔

- صبر کے اداب میں سے یہ بھی ہے کہ مصیبت کے وقت انا للہ و انا الیہ راجعون کہے جیسا کہ مسلم میں ام سلمہ کی حدیث میں ہے۔
- آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اعضا اور زبان کو سکون میں رکھے۔ بے صبری سے چلی جانے والی چیز واپس نہیں آتی۔
- اچھا صبر یہ ہے کہ مصیبت زدہ پر مصیبت کانشان ظاہر نہ ہو۔
- جب کوئی ایسی مصیبت ہو جو چھپائی جا سکتی ہو تو چھپائی جائے۔

حضرت ابوہریرۃؓ نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا ‘‘ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی طرف دو فرشتے بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو وہ اپنے تیمارداروں سے کیا کہتا ہے پھر اگر وہ تیمارداروں کے سامنے اللہ کی تعریف کرے تو وہ جاکر بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے پھر فرماتا ہے سنو! اگر میں نے اپنے بندے کو اپنے پاس بلا لیا تو میں اُسے جنت میں داخل کرونگا۔ اور اگر میں نے اُسے شفا دی تو میں اُس کا گوشت اور خون بدل دوں گا۔ اور اس سے بہتر گوشت اور خون بدل دوں گا۔ اور اس کے گناہ معاف کر دونگا’’۔

(منہاج القاصدین از امام ابن جوزیؒ صفحہ ۳۴۵، ۳۴۶)

صبر کے مختلف پہلو:

مولانا مودودی دعوت دین اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے اُٹھنے والوں کیلیے چند ناگزیر صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ‘‘اس سلسلے میں سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے۔ صبر ہے۔ صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دُنیا کے لیے مجاہدہ کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے۔ مگر بہرحال صبر ہے ناگزیر۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے شدیداجتناب کیا جائے۔

دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ کسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئےدشواریوں اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں استقامت دکھائی جائے۔ اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو، تب بھی ہمت نہ ہاری جائے۔ اور سعی جاری رکھی جائے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات، اور خوف و طمع کے مواقع بھی اگر پیش آجائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے۔

اور یہ بھی صبر ہی کا ایک شعبہ ہےکہ اشتعال انگیز جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے۔جذبات سے مغلوب ہو کر کوی قدم نہ اُٹھائے، ہمیشہ سکون، صحت، عقل اور ٹھنڈی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔

پھر حکم صبر ہی کا نہیں مصابرت کا بھی ہے۔ یعنی مخالف طاقتیں اپنے باطل مقاصد کے لیے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں، اُسی صبر کے ساتھ آپ بھی، ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کریں۔اس لیے

اصبروا کے ساتھ وصابروا کا حکم دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن ستمبر ۲۰۰۵ صفحہ ۲۴ تا ۲۵)

صالح اہل ایمان کی پوری زندگی صبر ہے:

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ (الدھر۔۱۲)

"اور اُن کے صبر کے بدلے میں اُنہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا"۔

یہاں صبر بڑےوسیع معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری دُنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی نا جائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجا لانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا، جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہ راست پر چلنے میں پیش آئے۔ہر اُس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج و اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرناکہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دُنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے، یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے او عمر بھر کا صبر ہے۔

(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۳۴۴)

صبر قوت کا سرچشمہ ہے۔ قرآن مجید میں اگر غورکیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں صبر اور تقویٰ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ البتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تقویٰ کو اختیار کرنے کے لیے نفس کے اندر جس صلاحیت، تربیت اور استعداد کی ضرورت ہے۔اُس کانام صبر ہے۔ آدمی اُن چیزوں سے رُک جائے جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں۔ اُن تمام نفسیاتی کیفیات کے مقابلے میں ڈٹا رہے۔ جو انسان کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان ساری رکاوٹوں کے مقابلے میں بھی اللہ کی راہ پر جما رہے جو باہر سے آتی

ہیں۔ اس تقویٰ کے حصول کے لیے قوت کا خزانہ اور سرچشمہ صبر ہے۔ اس لیے تقویٰ کے ساتھ صبر کا ذکر لازماً اور بڑی کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا گیا کہ مخالفین تمہارے خلاف جو تدبیریں اور ہتھکنڈے اختیار کر رہے ہیں اُن کے مقابلے کے لیے صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (ال عمران۔۱۲۰)

"تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے"۔

یہ بھی ذہن میں رہے۔ کہ قرآن مجید میں صبر کا جو بیان ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے بسی کی خاموشی یا بے کسی کا نام صبر نہیں ہے یا قابو نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کر پانا صبر نہیں ہے۔ کچھ کرنے اور کچھ کہنے کاحوصلہ بھی ہو اس کے باوجود انسان اُس سے رُک جائے، یہ صبر ہے۔ کسی کام کے کرنے کی استعداد ہو، خواہش بھی موجود ہو۔ لیکن آدمی اس کے مقابلے پر جم جائے۔ صبر بزدلوں یا کم حوصلہ لوگوں کا کام نہیں بلکہ صبر تو بڑی ہمت، بڑی بہادری اور عزم و حوصلے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس لیے قرآن نے باربار کہا ہے کہ جو صبر کرتے ہیں۔ اور قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دیتے ہیں اور برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں کہ یہ بڑے عزم و حوصلے کا کام ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔
(شوریٰ۔۴۳)

"البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور در گزر کرے تو یہ بڑی اُولوا العزمی کے کاموں میں سے ہے"۔

مکی زندگی میں اگر ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ہاتھ اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ بلکہ وہ سب لڑنا جانتے تھے۔ اور مدینہ آکر انہی لوگوں نے دکھایا بھی کہ وہ کس جواں مردی سے لڑنا جانتے ہیں۔ لہٰذا مکے میں جو کچھ کیاگیا وہ بے بسی کا صبر نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا راستہ تھا۔ اس کی بنیادمیں بہت ساری باتیں پوشیدہ تھیں جن کی یہاں وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ صبر بے بسی، لاچاری یا بزدلی کی وجہ سے

نہیں تھا۔(رسالہ ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۶۔صبر کا جامع تصور اور نفسیاتی کیفیات از خرم مراد صفحہ ۷۴ تا ۷۷)

قرآن مجید میں صبر کا ذکر:

قرآن کریم نے ۸۰ مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ کہیں اس کا حکم دیا گیا ہے جیسے :

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ (البقره آیت نمبر ۴۵) "صبر اور نماز سے مدد لو"۔

کہیں اس کی خلاف ورزی سے منع کیا گیا ہےجیسے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔

"پس اے نبی:صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو"۔

کہیں یہ بات کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ صابر لوگوں کا ساتھی ہے جیسے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقره۔۱۵۳) "اللہ صابرین کے ساتھ ہے"۔

کہیں یہ ذکر ہے کہ ان لوگوں کو اجر عظیم سے نوازا جائے گا جیسے :

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر۔۱۰)

"صبر کرنے والوں کو تو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

کہیں یہ ذکر ہے کہ یہ جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے جیسے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ (الرعد۔۲۴)

"تم پر سلامتی ہو تم نے دُنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اُس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو"۔

اس کے علاوہ صبر و یقین کے ساتھ امامت فی الدین میسر آتی ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۛ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ

"اور جب اُنہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو اُن کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے"۔
(اُصولِ دعوت از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان صفحہ ۵۴۵)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ **(البقرہ:155تا157)**

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر ، فاقہ کشی ، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے ۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں۔اور جب کوئی مصیبت پڑے ، تو کہیں کہ '' ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے '' اُنہیں خوشخبری دے دو ۔اُن پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی ، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں"۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ (محمد:31)

"ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے (گرم سرد) حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں"۔

<u>ایک اور جگہ فرمایا:</u>

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ١٤٢

(آلِ عمران:142)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں"۔

<u>سنتِ نبوی:</u>

سنت نبوی میں بھی صبر کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ چند مندرجہ ذیل ہیں:

مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ

(بخاری)

"کسی نے کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور اس سے کشادہ عطیہ نہیں دیا"۔

عَجَبًا لأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لأَحَدٍ إِلاَّ لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ۔ (مسلم)

"مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کیلیے تو خیر ہی خیر ہے۔ یہ چیز مومن کے سوا کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اگر اُسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے یہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اُس کے لیے خیر ہے"۔

آپ نے فرمایا:

إن عظم الجزاء مع عظم البلاء ، وإن الله إذا أحب قوماً ابتلاهم فمن رضي فله الرضى ، ومن سخط فله السخط۔

(بخاری)

"آپ کا فرمان ہے : آزمائش و مصائب جتنے بڑے ہوں گے اس پر اجرو ثواب بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے ،اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اس کو آزمائش و امتحان میں مبتلا ءکرتا ہے ، پس جو اس آزمائش پر راضی ہو ا تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہو گی اور جو اس آزمائش سے ناراض ہوا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہو جائیں گے "۔

ایک دوسری جگہ آپ نے فرمایا:

مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ **(بخاری)**

"اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں "۔

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلاَءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِى الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيضِ۔

(ترمذی)

"جب قیامت کے دن اہل آزمائش و مصائب کو اجرو ثواب دیا جائے گا تو دنیا میں گوشہ آفت و سہولت میں زندگی بسر کرنے والے لوگ یہ تمنا کریں گے کہ کاش!(دنیا میں) ان کے جسموں کی جلدیں قینچیوں سے ادھیڑ دی جاتیں"۔

شکر

شکر:شکر کے اصلی معنی اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔
ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اُس کے احسان کا اعتراف کرے (قلبی شکر) زبان سے اس کا اقرار کرے (قولی شکر) او ر عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔(عملی شکر) انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔ اور اس شکر کا اقتضا یہ ہے کہ **اولاً** آدمی احسان کو اُسی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے۔ کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو۔ اور اُس کے مخالفوں سے محبت و اخلاص اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اُس کے منشا کے خلاف استعمال نہ کرے۔(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۱۲)
شکر کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیر الٰہی خواہ کتنا ہی اُونچا اُٹھالے جائے وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے۔اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے۔ اُس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو برے سے برے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں۔ اور خوشحالی و بدحالی دونوں حالتوں میں اُس کی زبان اور دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۰۶)
شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو۔تو اُس کے معنی ’اعتراف خدمت‘یا قدردانی کے ہوں گے۔اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اُس کو ‘اعتراف نعمت’ یا احسان مندی کے معنی میں لیا جائے گا۔ - (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ نمبر ۴۱۲)

شاکر اور صابر ہی اللہ کی نشانیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ
(لقمان۔۳۱)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے ؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو"۔
یعنی جن لوگوں میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ جب ان نشانیوں کو پہچان جاتے ہیں تو ہمیشہ کیلیے توحید کا سبق حاصل کرکے اُس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتے ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ وہ صبّار(صبر کرنے والے) ہوں۔ اُن کے مزاج میں ثابت قدمی ہو اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں ایک عقیدۂ صالح پر قائم رہیں اور دوسری صفت یہ کہ وہ شکور (بڑے شکر کرنے والے) ہوں۔ نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں بلکہ نعمت کی قدر پہچانتے ہوں اور نعمت دینے والے کے لیے ایک مستقل جذبۂ شکر اور سپاس اپنے دل میں جاگزیں رکھیں۔(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۵) یہی مضمون سورہ ابراہیم آیت نمبر۵ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ تاریخی واقعات میں وہ نشانیاں بھی موجود ہیں جن سے ایک آدمی باطل عقائد و نظریات پر زندگی کی عمارت اُٹھانےکے برے نتائج معلوم کر سکتا ہے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ مگر ان سے فائدہ اُٹھانا صرف اُنہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی آزمائشوں سے پامردی کے ساتھ گزرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرکے اُن کا صحیح شکریہ ادا کرنے والے ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ نمبر۴۷۲)

اللہ نے انسان کو شکر اور کفر کے راستے بتا دئیے

اور اللہ اس کو پسند کرتا ہے کہ انسان شکر کا رویہ اختیار کرے

اور اللہ کا شکر ادا کرنا خودشکر ادا کرنے والے ہی کے لیے مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ساتھ ساتھ اُس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر کا راستہ کونسا ۔ اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اُس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سورہ بلد میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَھدینٰہُ النجدین'' اور ہم نے اُسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کرکے بتا دیے۔'' اور سورہ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے وَنَفسٍ وَمَا سَوَّاھٰا فَاَلھَمَھَا فُجُورَھَا وَ تَقوَاھَا'' اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کے ساتھ) استوار کیا پھر اُس کا فجور اور تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیئے'' ان تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن

میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کیلیے دُنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں۔ اور پھر ان تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کیلیے اللہ تعالیٰ نے صریح اور واضح رہنمائی کیلیے دُنیا میں انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کفر کی راہ کونسی اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۱۹۰)

اور اس طرح اللہ تعالیٰ سورہ الزمر آیت نمبر ۷ میں وضا حت فرماتا ہے۔کہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں تمہارے کفر سے ذرہ برابر بھی کمی نہیں آسکتی۔ تم مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور نہ مانوگے تب بھی وہ خدا ہے اور رہے گا۔ اُس کی فرمانروائی اپنے زور پر چل رہی ہے۔ تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا عِبَادِى لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى افجر قَلْبِ رَجُلٍ مِنْكُمْ مَا نقص من مُلْكِى شَيْئًا ۔

"اے میرے بندو اگر تم سب کے سب، اگلے اور پچھلے انسان اور جن اپنے میں سے کسی فاجر سے فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری بادشاہی میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی"۔ (مسلم)

یعنی اللہ اپنے کسی مفاد کے خاطر نہیں بلکہ خود بندوں کے مفاد کی خاطر یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کفر کریں۔ کیونکہ کفر خود اُن ہی کے لیے نقصان دہ ہے۔(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۳۶۱)

شکر کا تقاضا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (لقمان۔۱۲)

"ہم نے لُقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اُس کا شکر اُس کے اپنے لیے مفید ہے ۔ اور جو کُفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے"۔

یعنی اللہ کی بخشی ہوئی اس حکمت و دانائی اور بصیرت و فرزانگی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے رب کے مقابلے میں شکر گزاری اور احسان مندی کا رویہ اختیار کرے نہ کہ کفرانِ نعمت اور نمک حرامی کا۔ اور اس کا یہ شکر محض زبانی جمع خرچ ہی نہ ہو۔ بلکہ فکر اور قول اور عمل تینوں صورتوں میں ہو۔ وہ اپنے قلب و ذہن کی گہرائیوں میں اس بات کا یقین و شعور بھی رکھتا ہو کہ مجھے جو کچھ بھی نصیب ہے خدا کا دیا ہوا ہے۔ اُس کی زبان اپنے خدا کے احسانات کا ہمیشہ اعتراف بھی کرتی رہے۔ اور وہ عملاً بھی خدا کی

فرمانبرداری کرکے، اُس کی معصیت سے پرہیز کرکے، اُس کی رضا کی طلب میں دوڑ دھوپ کرکے، اس کے دیئے ہوئے انعامات کو اُس کے بندوں تک پہنچا کر اور اُس کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مجاہدہ کرکے یہ ثابت کردے کہ وہ فی الواقع خدا کا احسان مند ہے۔
پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جو شخص کفر کرتا ہے۔ اُس کا کفر اُس کے اپنے لیے نقصان دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ بے نیاز ہے کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔کسی کا شکر اُس کی خدائی میں کوئی اضافہ نہیں کر دیتا۔ نہ کسی کا کفر اس امر واقعہ کو بدل سکتا ہے کہ بندوں کو جو نعمت بھی نصیب ہے اُس کی عطاکردہ ہے وہ تو آپ سے آپ محمود ہے کوئی اُس کی حمد کرے یا نہ کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے کمال و جمال اور اُس کی خلاّقی و رزاقی پر شہادت دے رہا ہے۔ اور ہر مخلوق زبانِ حال سے اُس کی حمد بجا لا رہی ہے۔(تفہیم القرآن جلد نمبر۴ صفحہ نمبر۱۳ تا ۱۴)
۔اسی طرح جوشخص نعمت دینے والے کا احسان محض زبان سے مانتا ہو۔مگر اُس کی نعمتوں کو اُس کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہو۔ اُس کا محض زبانی شکر یہ بے معنی ہے۔اللہ تعالیٰ سورہ سبا آیت نمبر۱۳میں آلِ داؤد کو فرماتا ہے کہ شکر گزار بندوں کی طرح کام کرو۔ اصل شکر گزار بندہ وہی ہے جو زبان سے بھی نعمت کا اعتراف کرے اور اُس کے ساتھ منعم کی عطا کردہ نعمتوں سے بھی وہی کام لے جو منعم کی مرضی کے مطابق ہو۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۸۹)
اللہ کی نعمت کو منعم کے سوا کسی کا عطیہ سمجھنا، اس پر کسی اور کا احسان مند ہونا اور منعم کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی اُمید رکھنا یا نعمت طلب کرنا یہ سب کفرانِ نعمت ہے۔ اس طرح یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ آدمی منعم کی دی ہوئی نعمت کو اُس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ لہٰذا ایک مشرک اور کافر اور منافق اور فاسق انسان، محض زبان سے شکر کے الفاظ ادا کرکے خدا کا شاکر بندہ قرار نہیں پا سکتا۔ کفار مکہ اس بات کے منکر نہ تھے۔ کہ جانوروں کو (جن کا ذکر سورہ یسٰین آیت نمبر ۷۱ تا ۷۳ میں آیا ہے) خدا نے پیدا کیا ہے۔اُن میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں دوسرے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ مگر یہ سب کچھ ماننے کے باوجود جب وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر اپنے معبودوں کے شکریے بجا لاتے تھے اور اُن کے آگے نذریں نیازیں پیش کرتے اور اُن سے مزید نعمتوں کی دُعائیں مانگتے اور اُن کیلیے قربانیاں کرتے تھے تو

خدا کیلیے اُن کا زبانی شکر بے معنی ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ اُن کو کافر نعمت اور احسان فراموش قرار دے رہا ہے۔
(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۷۱)

ناشکری کیا ہے؟:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ
(فاطر۔۳)

"لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ، آخر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟"۔
تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں اُنہیں یاد رکھو۔ یعنی احسان فراموش نہ بنو۔ نمک حرامی اختیار نہ کرو۔ اس حقیقت کو نہ بھول جاؤ کہ تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہے اللہ کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فقرہ اس بات پر متنبہ کر رہا ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے سوا کسی کی بندگی و پرستش کرتا ہے، یا کسی نعمت کو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کی عطا و بخشش سمجھتا ہے یا کسی نعمت کے ملنے پر اللہ کے سوا کسی اور کا شکر بجا لاتا ہے، یا کوئی نعمت مانگنے کے لیے اللہ کے سوا کسی اور سے دُعا کرتا ہے وہ بہت بڑا احسان فراموش ہے۔(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۱۹)

شرک اللہ کی ناشکری ہے:

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ ۔
(الزحرف۔۱۵)

"یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) اِن لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جُز بنا ڈالا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اِنسان کھلا اِحسان فراموش ہے "۔
جز بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے کو اُس کی اولاد قرار دیا جائے کیونکہ اولاد لامحالہ باپ کی ہم جنس اور اُس کے وجود کا ایک جزو ہوتی ہے اور کسی شخص کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنے کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ اُسے اللہ کی ذات میں شریک کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مخلوق کو اللہ کا جزو بنانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اُسے اُن صفات اور اختیارات کا حامل قرار دیا جائے جو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اسی تصور کے تحت اُس سے دُعائیں مانگی

جائیں۔ یا اُس کے آگے عبودیت کے مراسم ادا کیے جائیں یا اُس کی تحریم و تحلیل کو شریعت واجب الاتباع ٹھہرا لیا جائے کیونکہ اس صورت میں آدمی الوہیت و ربوبیت کو اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان بانٹتا ہے اور اس کا ایک جز بندوں کےحوالے کر دیتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۳۰)

کفر اللہ کی ناشکری ہے:

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۟ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۔

(الزمر۔۷)

"اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے ۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا ، اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے "۔

کفر کے مقابلے میں یہاں ایمان کی بجائے شکر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ کفر درحقیقت احسان فراموشی و نمک حرامی ہے اور ایمان فی الحقیقت شکر گزاری کا لازمی تقاضا ہے جس شخص میں اللہ جل شانہ کے احسانات کا کچھ بھی احساس ہو وہ ایمان کے سوا کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے شکر اور ایمان ایسے لازم و ملزوم ہیں۔ کہ جہاں شکر ہوگا وہاں ایمان ہوگا اور اس کے برعکس جہاں کفر ہوگا وہاں شکر کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کفر کے ساتھ شکر کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳٦۰ تا ۳٦۱)

اللہ کی نعمتیں کھا کر اللہ ہی کی بندگی سے منہ موڑنا ناشکری ہے:

سورہ یٰسین کی آیات نمبر ۳۳ تا ۳۵ میں اللہ تعالیٰ توحید کے حق میں استدلال پیش کرنے کے بعد فرماتا ہے۔اَفَلا یشکرون یعنی کیا یہ لوگ ایسے احسان فراموش اور نمک حرام ہیں۔ کہ جس خدا نے یہ سب کچھ سروسامان اُن کی زندگی کے لیے فراہم کیا ہے اس کے یہ شکر گزار نہیں ہوتے اور اُس کی نعمتیں کھا کھا کر دوسروں کے شکریے ادا کرتے ہیں۔ اُس کے آگے نہیں جھکتے اور ان جھوٹے معبودوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جنہوں نے ایک تنکا بھی پیدا نہیں کیا۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۵٦ تا ۲۵۸)

شیطان انسان کو ناشکرا بنانا چاہتا ہے:

آیت نمبر ۱۶ اور ۱۷ سورہ الاعراف میں ابلیس کے اُس چیلنج کا ذکر ہے جو اُس نے خدا کو دیا۔اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دونگا کہ انسان اُس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلہ میں اُسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھادونگا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نمک حرام اور کیسا احسان فراموش ہے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۳)

محسن کے احسان کا شکر دوسروں کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار ہے

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۔ (النحل۔۷۲)

"اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں"۔

اگرچہ مشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو اُنہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں دخیل اور حصہ دار ٹھہرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن ‘‘اللہ کے احسان کا انکار’’ قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدہ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اُصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اُس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا

فلاں کی سفارش سے یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے یہ بھی دراصل اُس کے احسان کا انکار ہی ہے۔(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۶) قرآن دوسری جگہ سورہ النحل آیت نمبر ۸۳ میں بھی یہی بات کہتا ہے۔

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکر یہ یہ ہے کہ اُن سے صحیح کام لیا جائے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(النحل۔۷۸)

"اللہ نے تم کو تمہاری مائوں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیے ، آنکھیں دیں ، اور سوچنے والے دل دیے ، اس لیے کہ تم شکر گزار بنو"۔

یعنی وہ ذرائع جن سے تمہیں دُنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دُنیا کے کام چلا سکو انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے اتنا کسی جانور کا نہیں ہوتا۔مگر یہ صرف اللہ کے دئیے ہوئےذرائع (علم و سماعت، بینائی اور تعقل و تفکر)ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کرکے تمام موجودات ارضی پر حکمرانی کے لائق بن جاتا ہے۔ پس اُس خدا کے شکر گزار بنیں جس نے یہ بے بہا نعمتیں تم کو عطا کیں۔ ان نعمتوں کی اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کانوں سے آدمی سب کچھ سنے مگر ایک خدا ہی کی بات نہ سنے، ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھے مگر ایک خدا ہی کی آیات نہ دیکھے اور اس دماغ سے سب کچھ سوچے مگر ایک ہی بات نہ سوچے کہ میرا وہ محسن کون ہے جس نے یہ انعامات مجھے دئیے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۹ تا ۵۶۰)

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ یہ ہے کہ اُس کی بندگی کی جائے:

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ -

(سورہ ابراہیم۔۳۱)

"اے نبی ، میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے کھلے اور

چھپے (راہ خیر میں) خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی"۔
یعنی اہل ایمان کی روش کفار کی روش سے مختلف ہونی چاہیے۔ وہ تو کافر نعمت ہیں۔ انہیں شکر گزار ہونا چاہیے۔ اور اس شکر گزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ نماز قائم کریں اور خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کریں۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ نمبر۴۸۷)

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ یہ ہے کہ اُس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا جائے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (الانفال۔۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبُوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو"۔
یہاں شکر گزاری کا لفظ قابل غور ہے۔ اوپر کے سلسلہ تقریر کو نظر میں رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس موقع پر شکر گزاری کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ لوگ اللہ کے اس احسان کو مانیں کہ اُس نے کمزوری کی حالت سے اُنہیں نکالا اور مکہ کی پر خطر زندگی سے بچا کر امن کی جگہ لے آیا۔ جہاں طیباتِ رزق میسر ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی اس شکر گزاری کے مفہوم میں داخل ہے کہ مسلمان خدا کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں جس نے یہ احسانات اُن پر کیے ہیں۔ اور رسول کے مشن میں اخلاص و جانثاری کے ساتھ کام کریں اور اس کام میں جو خطرات و مہالک اور مصائب پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ اُسی خدا کے بھروسے پر کرتے چلے جائیں جس نے اس سے پہلے اُن کو خطرات سے بعافیت نکالا ہے۔ اور یقین رکھیں۔ کہ جب وہ خدا کا کام اخلاص کے ساتھ کریں گے تو خدا ضرور اُن کا وکیل و کفیل، ہوگا۔ پس شکر گزاری محض اعترافی نوعیت ہی کی مطلوب نہیں ہے بلکہ عملی نوعیت کی بھی مطلوب ہے۔ احسان کا اعتراف کرنے کے باوجود محسن کی

رضاجوئی کے لیے سعی نہ کرنا اور اس کی خدمت میں مخلص نہ ہونا اور اس کے بارے میں شک رکھنا کہ نہ معلوم آئندہ بھی وہ احسان کرے گا یا نہیں ہر گز شکر گزاری نہیں ہے بلکہ اُلٹی ناشکری ہے ۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۹)

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح شکریہ یہ ہے
کہ جو کچھ اللہ دے اُس پر مطمئن رہا جائے:

قَالَ يٰمُوْسٰٓي اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَي النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ڮ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۔
(الاعراف۔۱۴۴)

"فرمایا '' اے موسیٰ ؑ ! میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دُوں اسے لے اور شکر بجا لا "۔

شکر کا انعام:

اگر شکر ادا کرو گے تو اور زیادہ نوازوں گا۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے :
وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ
(ابراہیم:۷)

"اور یاد رکھو ، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگرشکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔

اللہ شکر گزار بندوں کو جزا دیتا ہے۔
وَسَيَجزِی اللہُ الشَّکِرِینَ۔ (ال عمران: ۱۴۴)

"البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا"۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کرتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۱۲۰ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ۔
(النحل:۱۲۰و ۱۲۱)

"واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم ؑ اپنی ذات سے ایک پوری امّت تھا ، اللہ کا مطیع فرمان اور یکسو ۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا ۔اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا "۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرآن مجید کی ایک جامع اصطلاح ہے۔اور قرآن میں ایک وحدت کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے دس مقامات پر یہ دونوں ایک جامع اور مربوط اصطلاح کی شکل میں آئے ہیں۔(خطاباتِ جمعہ، از ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ۶۸۵)

۱) **معروف**

معروف کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریق کار ہے جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں۔ جس کے متعلق ہر وہ شخص جس کو کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اُٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریق عمل ہے۔ رواجِ عام کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عرف'' اور'' معروف ''سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جنکے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔ (تفہیم جلد اول صفحہ ۱۳۹)

۲) **منکر:**

اس سے مراد ہو وہ بُرائی ہے جسے انسان بالعموم بُرا جانتے ہیں ۔ ہمیشہ سے بُرا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔ (اس میں تمام فواخش بھی آجاتے ہیں جن کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ (مرتب) تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ٥٦٦ آیت ۹۰ سورۃ النحل)

''ایمانداری، سچائی، راستبازی، پرہیز گاری، فرض شناسی، ضعیفوں کی حمایت، مصیبت زدوں سے ہمدردی، محتاجوں کی اعانت، عدل و انصاف کا قیام، خدا اور بندوں اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور

انھیں ادا کرنا اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل ''معروف'' ہیں اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام ''امر بالمعروف''ہے۔
اس کے برعکس خیانت، بدکاری، دروغ بافی، فتنہ پردازی، فساد انگیزی، بے انصافی، اپنے حدود سے تجاوز کرنا، دوسروں کے حق مارنا، باطل کی حمایت کرنا، حق و صداقت کو دبانا، کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا، یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلافِ انسانیت، خلافِ عقل اور خلافِ فطرت اعمال ''منکر'' ہیں۔اور ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا ''نہی عن المنکر'' ہیں۔
(الجہاد فی الاسلام از مولانا مودودیؒ صفحہ نمبر ۹۲ و ۹۳)

امر بالمعروف و نہی عن المنکرکی اہمیت:

امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک عظیم کا م ہے اور دین میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے ،کیونکہ اس کے قائم کرنے میں امت مسلمہ کی مصلحت اور نجات کا راز مضمر ہے اور اس کو چھوڑ دینے میں عظیم نقصان ہے اور فساد کبیر کا اندیشہ ہے ۔
قرآن میں جا بجا اللہ تعالیٰ نے اس کی فضیلت بیان کی ہے اور دین اسلام میں اس کے مقام و مرتبے کو واضح کیا ہے ،یہاں تک کہ بعض آیات میں اس کو ایمان جو کہ دین کی اصل واساس ہے اُس سے بھی مقدم کیا ہے ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ

(آلِ عمران:110)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو ، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۔
اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ایمان باللہ سے پہلے کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہےحالانکہ ایمان باللہ تمام طاعات پر مقدم ہے۔
اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان باللہ کی صفت تمام برحق اُمتوں کی مشترک صفت ہے جب اللہ نے اس امت کی تمام اُمتوں پر فضیلت کا ذکر کیا تو اس میں ایسی صفت ذکر نہیں کی جا سکتی تھی جس میں دوسری اُمتیں بھی اس اُمت کے ساتھ شریک ہیں۔ البتہ اس موقع پر اُمت مسلمہ کے اس امتیازی وصف کا تذکرہ ہی ہونا چاہیے۔ تھا۔ جس کے باعث اُسے فضیلت کا منصب ملا ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ اُمتِ مسلمہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں دوسری اُمتوں پر فائق ہے۔ (صفحہ۲۵۲) تفسیر الرازی ۲:۲۷۔المسبوط ۲:۱۰۔
ایک دوسری جگہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اقامتِ صلوۃ اور ادائے زکوٰۃ پر مقدم رکھا گیا ہے ،باجودیکہ اقامتِ صلوۃ اور ادائے زکوٰۃ اسلام کے ارکان میں سے بنیادی ارکان ہیں اور شہادتین کے بعد بالترتیب ان دونوں کا مقام و مرتبہ ہے ۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو قائم کرنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اسی کے قیام سے امت درست سمت کی طرف گامزن ہو سکتی ہے ۔

ارشادِ ربانی ہے:
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
(سورہ آل عمران۔۱۰۴)
’’تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں ، بھلائی کا حکم دیں ، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے ‘‘۔
’’ولتکن منکم امۃ ‘‘میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں کیونکہ ان کی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :**یدعون الی الخیر** یعنی اس جماعت کا پہلا امتیاز خصوصی یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصد اعلی ہوگا، خیر سے مراد کیا ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ الخیر ھو اتباع القران وسنتی، "یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے "۔ (ابن کثیر)
"خیر" کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دین شریعت اس میں آگیا پھر یدعون کو صیغہ مضارع سے لاکر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ دعوت الی الخیر ہوگا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص مواقع پر ہوگی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں، لیکن یدعون الی الخیر کہہ کر بتلادیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس

وقت منکرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلا آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی کہ وقت نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے یا روزہ کا وقت نہیں آیا ابھی رمضان کا مہینہ دور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔ پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو رجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہے مسلمانوں کا ہر فرد عموما اور یہ جماعت خصوصا دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا وہاں سچے مومنین کی اس طرح تعریف کی:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (الحج: ٤١)

یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین و قدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہا اللہ کی زمین میں نظام اطاعت قائم کرتے ہیں جس کا ایک مظہر نماز ہے اور اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ کے اصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں، اگر آج امت مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہوجائیں گی جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہوجائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اقوام عالم پر غالب آنا ہے اور اقوام کی تربیت و تہذیب ہمارے ذمہ ہے تو اس کی نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہوجائیں گی، اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے لگ جائے گی، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامیابوں کا راز اسی میں مضمر تھا، حدیث میں ہے کہ حضرت ضحاک نے یہ آیت ولتکن منکم تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا :

هم خاصة اصحاب رسول الله (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (ابن جریر)

یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرام کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔

دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے، کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعت خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ اور فریضہ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری احکام و اسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی یعنی امت مسلمہ میں علوم قرآن و سنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دوسری آیت میں رہنمائی کی گئی :

فَلَوْلاَ نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ

(التوبہ:22)

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے ، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر

اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے"۔

(معارف القرآن جلد دوم از مفتی محمد شفیع صفحہ ۱۳۷ و ۱۳۸)

خیر اُمت کی حیثیت سے ذمہ داری:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (ال عمران:110)

‘‘اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو ، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں’’۔

یہ وہی مضمون ہے جو سورہ بقرہ کے سترھویں رُکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتا یا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں، اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ

عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اور تمہیں لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور اُن غلطیوں سے بچو جو تمہارے پیش رو کر چکے ہیں۔
مولانا مودودی الجہاد فی الاسلام میں فرماتے ہیں:۔ اس آیت میں قرآن وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جس کے لیے مسلمان پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ اصلی خدمت بھی بیان کرتا ہے۔ جس کو انجام دینے کے لیے اُن کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس ارشاد میں اُخرجت للعرب یااُخرجت للعجم یا اُخرجت للشرق نہیں کہا گیا ہے۔ بلکہ اُخرجت للناس کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم کریں اور بدی سے روکیں۔
(الجہاد فی الاسلام صفحہ ۸۶،۸۷)
اس اعلیٰ تعلیم کو اُس نے مختلف موثر پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اور تنگ خیالی کے علم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ۔
(البقرہ۔۱۴۳)

" اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ’’ امتِ وسط ‘‘ بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو"۔اور اس مضمون کی تشریح سورہ حج میں اس طرح کی گئی ہے:

مِلَّـةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭهُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِـمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ۔

(الحج۔۷۸)

"قائم ہو جائو اپنے باپ ابراہیم ؑ کی ملت پر ۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام " مسلم " رکھا تھا اوراِس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ۔ پس نماز قائم کرو ، زکوٰۃ دو ، اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ"۔
ان دونوں آیات کو جو ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں ملا کر پڑھو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہاں بھی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اُس عالم گیر خدمت انسانی کو بتایا ہے۔ فرمایا کہ تم بہترین گروہ

ہو جسے افراط و تفریط سے ہٹاکر عدل و توسط کی راہ پر قائم کیا گیا ہے۔ تمہیں اللہ نے اس خاص کام کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ کہ اپنے قول اور عمل سے دُنیا کو معلوم ہو کہ حق کیا ہے۔ راستی کسے کہتے ہیں۔ انصاف کے کیا معنی ہیں اور بھلائی کس چیز کا نام ہے۔ یہی شہادت حق تمہاری زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی کےلیے تم کو ''مسلم'' (یعنی خدا کے فرمانبردار گروہ) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا ہے کہ رنگ، نسل، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام کرنے سے باز نہیں رکھ سکتیں----- ہر وہ انسان جو اُصولِ اسلام کو قبول کرے، خواہ وہ کسی نسل اور کسی قوم کا ہو اور کسی ملک کا باشندہ ہو، تمہارے اس دین میں برابری کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ خدمت جو تمہارے سپرد کی گئی ہے اُس کا دائرہ بھی کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمہیں ساری انسانیت کے لیے گواہِ حق بن کررہناہے۔ اور پھر یہی مضمون ایک دوسرے طریقے سے یوں ادا کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ۭ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔

(الحج۔۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے ، زکٰوۃ دیں گے ، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے ۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے "۔

یہاں ''الناس'' کی بجائے ''الارض'' کا لفظ استعمال کیا اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا یہ فائدہ بتایا کہ وہ زمین میں خدا کی بندگی کو فروغ دیں گے۔ نیکی کا پرچار کریں گے۔ اور بدی کو مٹائیں گے۔

(ایضاً صفحہ ۹۰ و ۹۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خیر اُمت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے بلکہ تمام انسانیت کی خدمت اُن کا مقصدِ وجود ہے۔ اُن کے شرف کا راز اُخرجت للناس میں پوشیدہ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۹۲)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مراتب:

آپ □ کا فرمان ہے:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ »

(مسلم)

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کوچاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ کے ذریعے اس کو روکے اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے تو پھر زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتاہے تو پھر اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے "۔

مذکورہ بالا حدیث میں آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے تین مراتب کی نشاندہی کی ہے :

1۔ طاقت اور قوت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو نافذ کرنا ۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ منکر کا ازالہ کرنے والے میں اتنی قدرت ہو جو منکر کا ازالہ کر سکے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قدرت کے لحاظ سے داعیوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ قدرت حکمران کو ہوتی ہے۔ یعنی وہ شخص جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے۔ اور جو امر و نہی کے اختیارات کا مالک ہے۔ کیونکہ منکر کا عملاً ازالہ ایک ایسی چیز کا ازالہ ہے جو بھلائی یا حق کے راستے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر زمین میں کوئی منکر موجود ہو تو وہ اپنے برابر یا اس سے بھی زیادہ حق کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔ چنانچہ اس کو زائل کرنا یا اس کا زائل ہونا بھلائی اور حق کو لوگوں کے لیے آسان بنانے کی خاطر ہوگا۔

اس طرح حدیث کے مطابق كلكم راع ومسئول عن رعيته الإمام راع وهو مسؤل عن رعيته والرجل في أهله راع وهو مسؤل عن رعيته والمرأة راعية في بيت زوجها وهي مسئولة عن رعيتها والخادم في مال سيده راع وهو مسؤل عن رعيته قال سمعت هؤلاء من النبي صلى الله عليه و سلم وأحسب النبي صلى الله عليه و سلم قال والرجل في مال أبيه راع وهو مسؤل عن رعيته فكلكم راع وكلكم مسؤل عن رعيته (بخاری)

"ہم سب راعی ہیں۔ اور اپنے اپنے حلقہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پابند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مومن اپنے گھر میں منکر کا ازالہ کرنے کے سلسلے میں دوسروں کی نسبت زیادہ جواب دہ ہے۔ اس لیے کہ وہ شرعی طور پر اس کام پر مامور ہے کہ وہ یہ ازالہ کرے گا

اور اُس کو اپنے گھر میں ولایت حاصل ہے۔ اس لیے وہ اس ازالے پر قادر بھی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے"۔
البتہ اگر منکر کی بعض جزئیات میں کوئی چیز شرعی طور پر اس ازالے کے بالمقابل آجائے۔ اس لحاظ سے کہ اگر داعی اس جزوی خرابی کو دور کرتا ہے تو اس سے دوسری طرف ایسا نقصان ہوگا جو حاصل کیے جانے والے فائدے سے بہت زیادہ ہوگا۔ تو پھر اُس منکر کا ازالہ درست نہ ہوگا۔
یہ بات بھی پیش نظر رہے۔کہ ہاتھ سے منکر کا ازالہ انسان کی قوت اور قدرت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔ ارشاد ربانی ہے۔
فاتقوا اللہ ما استطعتم (التغابن۔۱۶) "جہا ں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو"
لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا (البقرہ:286)
"اللہ کسی نفس کو اُس کی وسعت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا"۔
مفتی محمد شفیع معارف القرآن میں فرماتے ہیں:۔امر بامعروف ونہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے۔ البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت و استطاعت پر احکام دائر ہوں گے۔ جس کو جتنی قدرت ہو اُتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اُس پر عائد ہوگا۔۔۔۔
پھر استطاعت و قدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے۔ امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف و منکر اُس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو۔ جس شخص کو معروف و منکر کی تمیز نہ ہو۔ یااس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح کے فساد ہوگا۔اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی نا واقفیت کی بنا پر کسی معروف کو منع کرنے لگے یا منکر کا حکم کرنے لگے۔ پس جو شخص خود معروف و منکر کا علم حاصل کرے۔ اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے۔
لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں۔اُس کا خدمت کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں۔ جیسے اس زمانہ میں بہت سے جاہل وعظ کہنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔نہ اُنہیں قرآن کا علم ہے نہ حدیث کا۔ یا بہت سے عوام سُنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں۔ کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو، یہ طریق کار بجائے معاشرہ کے درست کرنے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ وجدل کا سبب بنتا ہے۔۔۔۔

اس طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی ناقابل برداشت ضرر پہنچنے کا قوی خطرہ نہ ہو------زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اُس کو یہ خطرہ قوی ہے کہ اُس نے حق بات کی تلقین کی تو اُس کی جان جائے گی۔ یا کوئی دوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا۔اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اُس کو گناہ گار نہ کہا جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پراوہ نہ کرے اور نقصان برداشت کرکے بھی امر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے جیسے بہت سے صحابہ و تابعین اور آئمہ اسلام کے واقعات منقول ہیں۔یہ اُن کی اولوالعزمی اور بڑی فضیلت ہے جس سے اُن کا مقام دُنیا و آخرت میں بلند ہوا۔ مگر اُن کے ذمہ ایسا کرنا فرض و واجب نہ تھا------

نیز ہر شخص پر یہ فریضہ اُس وقت عائد ہوگا جب کہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو کرتے ہوئے دیکھے----- نبی ﷺ کے ارشاد :**من رائی منکم** میں اس طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم میں سے کسی منکر کو دیکھے۔(معارف القرآن جلد دوئم صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸)

2-<u>زبان اور بیان اور وعظ و نصیحت کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا</u> ۔ البتہ اس مرحلے میں زبان کو قابو میں رکھنا اور نرمی کے ساتھ بہترین اسلوب اختیار کر نا ،انتہائی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ

(النحل:125)

"اے نبی ﷺ ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو "۔

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے :

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الأَمْرِ كُلِّهِ (بخاری)

"بے شک اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتا ہے"۔

3-امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے معاملے میں اگر سابقہ دونوں مراحل سے کام نہ لیا جاسکتا ہو تو پھر اسے چاہئیے کہ وہ منکرات کو دل سے برا جانے اور غیر شرعی معاملات کو نفرت کی نگاہ سے

دیکھے اور برے لوگوں کی مجالس سے پرہیز کرے ۔آپ ہر رات کو دعائے قنوت میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ و نخلع و نترک من یفجرک۔اے اللہ جو بھی تیری نافرمانی کرے ہم اس سے ترکِ تعلق کرتے ہیں اور اس سے علٰحیدہ ہو جاتے ہیں۔یہ بہت بڑا دعوہ ہے لیکن اگر بالفعل ان سے ترکِ موالات نہیں ہے اور اُنہی میں گھل مل رہے ہیں تو یہ ایمان کی نفی ہے۔

نیز یہ بات بھی اچھی طرح جان لینی چاہیے۔ کہ منکر سے نفرت کامل اور مکمل ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان کے بارے میں اصل تصور یہی ہے کہ اُس کی محبت اللہ کی محبت کے موافق ہونی چاہیے۔ اور اس کا بغض اُس چیز کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کہ جو اللہ تعالٰی کو ناپسند ہو۔

اس موافقت میں کسی بھی قسم کی کمی، خواہ ایک جانب سے ہو یا دونوں طرف سے، قطعی طور پر ایمان کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ دل میں منکر کو ناپسند کرنا ایک ایسا امر ہے کہ اس میں کسی قسم کا ضرر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کوئی یہ بھی نہیں کرتا کہ وہ منکر کے ساتھ دل میں نفرت کرے۔تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کے ایمان میں ضعف ہے۔ بلکہ اُس کا دل مردہ ہے۔

قوموں کی تباہی کا اصل سبب: سورہ ہود:116،117میں ارشاد ہے :

"پھر کیوں نہ اُن قوموں میں سے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انھیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کردے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

ان میں قوموں کی تباہی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں۔ ان سب کو جس چیز نےگرایا۔وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں۔ اور اُن کا اجتماعی خمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو اُن کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں۔ جو اُن کو برائیوں سے روکتے یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ اُن کے روکنے سے فساد نہ رُک سکا یہی چیز ہے جس کی بدولت آخرکار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے

غضب کی مستحق ہوئیں۔ ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کہ وہ تو بھلےکا م کر رہے ہوں اور اللہ اُن کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے۔ یہاں تین باتیں اہم ہیں۔
ایک یہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ اصل چیز ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر جو اُن کے اندر موجود ہو۔ اور اُسی وقت تک کرتا ہے۔ جب تک اُن کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی اُن کی سُن کر نہ دے۔ اور پوری قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے۔ تو پھر خدا کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔
دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو۔ مگر صرف اُنہی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کیلیے تیار نہ ہو۔ جو اُسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں تو سمجھ لو کہ اُس کے بُرے دن قریب ہیں۔ کیونکہ وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے۔
تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کاآخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اُس دعوت پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اُس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کیلیے کافی ہو تو اُس پر عذاب عام نہیں بھیجا جاتا۔ بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاح کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کیلیے کافی ہو سکیں۔ تو پھر وہ قوم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۳۴۲ تا ۳۴۳)
اسلام جو نظام زندگی قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ فرد کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔مگر فرد کو جو مشن سونپا گیا ہے وہ صرف اپنی اصلاح اور تزکیے تک محدود نہیں۔ اور آخرت میں ہر فرد کو فرداً فرداً جو جو اب وہی کرنی ہے۔ وہ صرف اُس کی ذاتی زندگی تک محدود نہیں۔ اور آخرت میں ہر فرد کو فرداً فرداً جو جواب وہی کرنی ہے۔ وہ صرف اُس کی ذاتی زندگی تک محدود نہیں۔بلکہ وہ زندگی کی تمام وسعتوں پر محیط ہے۔ فرد کی زندگی حق و باطل اور نیکی اور بدی کے درمیان کشمکش کے درمیان گزرتی ہے اور فرد کی اصلاح کا مقصد اس کشمکش میں اُس کی صریح کردار کی ادائی ہے (جیسے پہلے عرض

کیا جا چکا ہے) اُس پر گرفت صرف اس بات پر نہ ہوگی کہ اُس کے انفرادی کردار یا محرکات میں کیا خرابی یا کوتاہی ہے۔ بلکہ اس پر بھی ہوگی کہ جس معاشرے میں وہ زندگی گزار رہا ہے اُس کو ظلم اور طاغوت کی حکمرانی سے نجات دلانے میں اس نے کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے کہ فرد کا اپنی ذات کا تزکیہ اور اجتماعی زندگی کی اصلاح اور تاریخ کے دھارے میں حق پرستی اور عدل و انصاف کی کشمکش کی جدوجہد میں تعاون ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اور اُن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتافرد اجتماعیت کا حصہ ہے۔ معاشرے میں معیشت اور تمدن میں خیر و شر کے درمیان جو کشمکش برپا ہے۔ اُس میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے فرد جو کردار ادا کرتا ہے۔ اور جدوجہد میں حصہ لیتا ہے۔ اس ہمہ گیر جدوجہد کا نام جہاد ہے جو ایمان کا تقاضا ہے۔ یہ جہاد اپنے نفس کی اصلاح اور نفس امارہ کو زیر کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن جہاد باللسان، جہاد بالعمل، اور جہاد بالسیف سے عبارت ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ماضی میں جو مشن انبیاء کرام نے انجام دیا۔ نبی آخرالزمانؐ کی سنت کے طور پر اب اُمت کی ذمہ داری ہر ہر فرد کی ہے۔اُمت کا بحیثیت اُمت اس مقصد کے لیے اجتماعیت اور امامت کا قیام بھی ضروری ہے۔ اس کا نام اقامت دین ہے۔ اور یہی استخلاف کا تقاضا ہے۔ (ہم آئندہ صفحات میں اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کے ارشادات پرروشنی ڈالیں گے۔تاہم یہاں صرف اقامت دین کی تعریف کے سلسلے میں ازالۃ الخفا سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں)

‘‘خلافت اس عمومی سربراہی اور ریاستِ عامہ کا نام ہے جو اقامت دین کے کام کی تکمیل کے لیے وجود میں آئے۔اس اقامت دین کے دائرے میں علومِ دینیہ کا احیاء، ارکانِ اسلام کا قیام، جہاد اور اسکے متعلقات کا انتظام، مثلاً لشکروں کی ترتیب، جنگ میں حصہ لینے والوں کے حصص و مالِ غنیمت میں اُن کا حق، نظامِ قضا کا اجراء، حدود کا قائم کرنا، مظالم اور شکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائی شامل ہے۔ اور یہ سب آنحضرت کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیے۔’’۔

فرد کی اصلاح اس ہمہ گیر مقصد کے لیے ہے۔ خود مقصود بالذات نہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے کہ فرد کی محض اپنی ذات کی اصلاح کافی نہیں مگر معاشرے کےبگاڑ کی زد بھی اس پر پڑتی ہے اور اگر وہ اس کی اصلاح اور اسلامی

اُصولوں کے مطابق اجتماع کے ہر ادارے میں انصاف اور عدل کے قیام سے غافل رہتا ہے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ-وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (انفال۔۲۴ تا ۲۵)
"اےلوگو جو ایمان لائےہو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیّک کہو جبکہ رسُول ﷺ تمہیں اس چیز کی طرف بُلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے، اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کےدرمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔اور بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔
(ترجمان القرآن مارچ ۲۰۱۵ اشارات از ڈاکٹر انیس احمد صفحہ ۹ تا ۱۳)

رسولؐ کی ذمہ داری کا اساسی نکتہ:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭفَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورہ اعراف آیت نمبر ۱۵۷)
"(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اِس پیغمبر ، نبی امی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے ، بدی سے روکتا ہے ، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے ، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں ، جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ، وہی فلاح پانے والے ہیں"۔
رسولؐ کی جہاں اور ذمہ داریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ایک اہم ذمہ داری یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اُنہیں نیکی کا حکم دیتا ہے۔ بدی

سے روکتا ہے اور اُن کیلیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔ اور اُن پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن کے مذہبی رہنماؤں اور فقیہوں نے قانونی موشگافیاں کر کرکے اُن عوام پر لا د رکھا ہے اور اسی قسم کی ساری بندشیں جن میں لوگوں کو اُنہوں نے جکڑ رکھا ہے وہ کھولتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۸۴تا ۸۵۔)

اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد :

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

(الحج۔۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے ، زکٰوۃ دیں گے ، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے ۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے "۔

اس ایک فقرے میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور فرمان رواؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔ یعنی اللہ کے مددگار اور اُس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں۔ کہ اگر دُنیا میں اُنہیں حکومت و فرمان روائی بخش جائے تو اُن کا ذاتی کردار فسق و فجور کے بجائے اقامتِ صلوٰۃ اُن کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صرف ہو، اُن کی حکومت نیکی کو دبانے کی بجائے اُسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے اور اُن کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کے بجائے اُن کے دبانے میں استعمال ہو۔ (تفہیم جلد سوم صفحہ نمبر ۲۳۳

امر بالمعروف و نہی عن المنکر بڑے حوصلے کا کام ہے :

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

(سورہ لقمان آیت نمبر۱۷)

"بیٹا۔ نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اُس پر صبر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔

جو شخص بھی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام کرے گا اُس پر مصائب کا نزول ناگزیر ہے۔ دُنیا لازماً ایسے شخص کے

پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی ہے اور اُسے ہر قسم کی اذیتوں سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے۔ لہٰذا یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اصلاح خلق کیلیے اُٹھنا اور اس کی مشکلات کو انگیز کرنا کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔یہ اُن کاموں میں سے ہے جن کیلیے بڑا دل گردہ چاہئے۔
(تفہیم جلد چہارم صفحہ ۱۷)

وہ اہلِ ایمان کی خصوصیت ہے :

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ
(سورہ التوبہ آیت نمبر ۷۱)

"مومن مرد اور مومن عورتیں ، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں ، بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہیں ، نماز قائم کرتے ہیں ، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺکی اطاعت کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی ، یقینا اللہ سب پر غالب اور حکیم ہو دانا ہے "۔

سچے مومن مرد و زن ایک گروہ ہیں۔ جن کے سارے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ بدی سے نفرت کرتے ہیں۔ خدا کی یاد اُن کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضرور بات میں شامل ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے کیلیے اُن کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ اور خدا اور رسول کی اطاعت اُن کی زندگی کا وطیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرز زندگی نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین کے گروہ سے توڑ دیا ہے۔ جن کو خدا سے غفلت، بُرائی سے دلچسپی، نیکی کے بُعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہل ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے۔ (تفہیم جلد دوم صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۴۔)

یہ فریضہ ادا کرنے والے اللہ کے مددگار ہیں اور اللہ اُن کا مددگار ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ
(سورہ ال عمران آیت نمبر۵۲)

"اور جب عیسٰی نے محسوس کیاکہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اُس نے کہا ‘‘ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے ’’

حواریوں نے جواب دیا ‘‘ ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، آپ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"۔
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ (سورہ الحج آیت نمبر ۴۰)
"اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کریگا جو اُس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے"۔
قرآن مجید میں یہاں اور دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو توحید کی طرف بلانے اور دینِ حق کو قائم کرنے اور شر کی جگہ خیر کو فروغ دینے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔ وہ در اصل اللہ کے مددگار ہیں۔ کیونکہ فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا دراصل اللہ کا کام ہے ۔ اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں۔ اُن کو اللہ اپنا رفیق اور مددگار قرار دیتا ہے۔ اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے۔ مگر تبلیغ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگار ی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ جو اس دنیا میں روحانی ارتقا کا سب سے اوُنچا مرتبہ ہے۔
(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۳۳۔)

نہی عن المنکر نہ کرنے والے عابدوں کا انجام:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

أوحى الله تبارك وتعالى إلى ملك من الملائكة أن اقلب مدينة كذا وكذا على أهلها فقال يا رب إن فيهم عبدك فلانا لم يعصك طرفة عين قال اقلبها عليه وعليهم فإن وجهه لم يتعر في ساعة قط (بیہقی)

"اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی کی کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں پر اُلٹ دو۔اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا پروردگار ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے کہ اُس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُلٹ دو ان بستیوں کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر۔ اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بدلا"۔
اس حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عابد کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہیں بدلا حالانکہ اُن بستیوں کے اندر بدی پھیلتی رہی،

ان میں منکرات کی اشاعت ہوتی رہی اور یہ آرام سے اپنی عبادت میں لگا رہا۔ (خطاباتِ جمعہ حصہ دوم ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ۶۹۴، ۶۹۵)

اس فریضے سے اعراض پر بنی اسرائیل کا مبتلائے لعنت ہونا:

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔

(المائدہ۔۷۸، ۷۹)

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤد ؑ اور عیسیٰ ابن مریم ؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے ، انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا برا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا "۔

بنی اسرائیل میں پہلا نقص جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کے دلوں سے برائی کی نفرت دور ہو گئی اور وہ جھوٹی رواداری پیدا ہو گئی تھی جو برائی کو برداشت کرتے کرتے خود برائی میں مبتلا ہو جانے پر انسان کو آمادہ کر دیتی ہے۔حدیث میں ہے کہ جب ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور یہ فعل چھوڑ دے۔جو تو کرتا ہے کیونکہ یہ تیرے لیے جائز نہیں ہے۔مگر دوسرے دن جب اُس سے ملتا تو اُسی کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ اور ہم نشین بننے سے کوئی چیز اسے باز نہ رکھتی۔ آخر اُن پر ایک دوسرے کی برائی کا اثر پڑ گیا اور ان کے ضمیر مردہ ہو گئے۔ جس وقت حضورؐ یہ فرما رہے تھے تو دفعۃً لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھے اور جوش میں آکر فرمایا:والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھن عن المنکر ولتا خذن علی یدالمسئے و لتطرنہ علی الحق اطراء او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنھم۔اُس کی قسم جس کی ہاتھ میں میری جان ہے، تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف موڑ دو، ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا، یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اُن لوگوں پر کی تھی۔

اس فریضے کی عدم ادائیگی کی صورت میں خاص لوگوں کے ساتھ عام لوگوں پر بھی عذاب مسلط ہو جاتا ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ
(اعراف۔۱۶۵)

''آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل فراموش کر گئے جو اُنہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے اُن کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا''۔

اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے جو طریقے اختیار فرماتا ہے اُن میں ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرمانبرداری سے انحراف اور نا فرمانی کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اُس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغدار کرنا چاہتا ہے اُن سے صرف اس لیے باز نہ رہ جائے۔ کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اُسے نہ مل سکے۔ قرآن آیت ۱۶۵ سورہ اعراف میں بنی اسرائیل کی ایک بستی میں ۳ قسم کے لوگوں کا ذکر کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک وہ جو دھڑلے سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔ مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ اور ناصحوں سے کہتے تھے۔ کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل۔ تیسرے وہ جن کی غیرت ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ اُن کی نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں یا دوسری صورت میں اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کرکے خدا کے سامنے اپنی برات کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورت حال میں جب عذاب آیا تو قرآن مجید کے بیان کے مطابق صرف تیسرا گروہ بچا لیا گیا کیونکہ اُسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

اجتماعی جرائم کے بارے میں قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔

"ڈرو اُس فتنے سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہونگے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو"۔

اور اس کی تشریح میں نبی ﷺ فرماتے ہیں :

ان اللہ لا یعذب العامۃ یعمل الخاصۃ حتٰی یروا المنکر بین ظہرانیھم وھم قادرون علیٰ ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذٰلک عذب اللہ الخاصۃ و العامۃ،

" یعنی اللہ عز وجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا۔ جب تک عامتہ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ خاص و عام کو سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ نمبر ۹۰ تا ۹۲)

<u>مشن میں استقامت، مقصد و ذریعہ کی تقدیس ۔ اور جلدبازی سے پرہیز</u>

قرآن مجید نے راہِ خدا میں نکلنے والوں کے لیے اخلاص، توجہ الی اللہ، صبر و ثبات کی بار بار تلقین کی ہے۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دُنیا میں آج تک بھلائی کی اشاعت اور اس کے نفاذ کو کبھی بھی دُنیوی مفاد کے پرستاروں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ بگاڑ کے علمبرداروں نے اس کی ہمیشہ پوری شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور جو لوگ اس راہ میں نکلے ہیں اُن پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہل خیر صبر کا دامن چھوڑ دیں تو وہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۔اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَي الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (الشوریٰ۔۴۱)

"اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں اُن کو ملامت نہیں کی جا سکتی ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے درد ناک عذاب ہے"۔

اللہ کے دین کی سربلندی کا کام کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ جسے کوئی فرد یا گروہ کوئی تکلیف اُٹھائے بغیر انجام دے سکے جبکہ کوئی شخص نیکی کا حکم دیتا ہے۔ تو منکرات کے سارے ایوانوں میں دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔اور وہ سب مل کر حق کے خلاف یلغار کرتے ہیں۔ اس طرح جب کوئی شخص برائی سے روکتا ہے تو برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اسے اپنے خلاف ایک خوفناک چیلنج سمجھ کر اُس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتے وقت مختلف قسم کے مصائب کا پیش آنا بالکل فطری امر ہے۔ اور اُنہیں ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرنا بھی دین حق کا ایک تقاضا ہے۔

سورہ لقمان میں ارشاد ہے:

یٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

(سورہ لقمان ۔١٧)

"بیٹا ، نماز قائم کر ، نیکی کا حکم دے ، بدی سے منع کر ، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔

جیسے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ کہ قرآن کریم کی بار بار اخلاص اور صبر وثبات کی تلقین کی ایک وجہ تو اس راستے کی مشکلات اور راہِ حق میں مزاحم قوتیں ہیں۔ اور دوسری وجہ انسانی فطرت کی ایک بہت بڑی کمزوری کے بارے میں احساس دلانا ہے۔انسان جب کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ اس کے ثمرات کو وہ جلد ہی اپنی جھولی میں ڈال لے۔ مگر جب اُسے اس صبر آزما اور مشکل کام میں بظاہر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی۔تو وہ بسا اوقات کسی سستے نسخے کو آزماکر کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے صبری اُس سے ایسے غلط کام کروا ڈالتی ہے جو اصل مقصد کے منافی بھی ہوتے ہیں اور اُس کے لیے نقصان دہ بھی۔

<u>صبر اور ثابت قدمی اولوالعزم رسول کرتے رہے ہیں:</u>

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰــغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف۔٣٥)

"پس اے نبی □ ، صبر کرو جس طرح اُولو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور اِن کے معاملہ میں جلدی نہ کرو ۔ جس روز یہ لوگ اُس

چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جارہا ہے تو اِنہیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دِن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے ۔ بات پہنچا دی گئی ، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟"۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں کے ذریعے اپنے دین کو سر بلند کرتا ہے اُن کے بارے میں اس کی سنت یہی ہے کہ وہ انہیں آزمائش کی بھٹی سے گزار کر اُن کی تربیت کرتا ہے اور کندن بناتا ہے اور اپنی مدد و نصرت سے بالاخر اُن کے ہاتھوں دین کو غلبہ عطا کرتا ہے۔ یہ سنت انبیاء کرام، رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ سے ہی مخصوص نہیں ہے۔بلکہ تمام اہل ایمان کے لیے عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصائب و آلام سے پریشان ہوکر انبیاء اور اہل ایمان پکار اٹھتے ہیں متٰی نصراللہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔جب اہل ایمان آزمائش میں استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو پھر اللہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اور اُس کی مدد آجاتی ہے۔اور فرمایا جاتا ہے الا ان نصراللہ قریب۔سنو اللہ کی مدد قریب ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی مدد اُن لوگوں کے لیے ہے جو اس کے مستحق ہیں اُس کی نصرت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک ثابت قدم رہیں۔جو شدائد و آلام میں ثابت قدمی دکھائیں، جو بلا ڈالنے والی مصیبتوں کے مقابلے میں چٹان ثابت ہوں۔جن کے سر طوفانوں کے آگے نہ جھکیں۔جنہیں اس بات کا یقین ہو کہ مدد صرف اللہ کی مدد ہے۔اور وہ اس وقت آتی ہے جب اللہ چاہتا ہے اور جب آزمائش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے وہ صرف اللہ کی نصرت کے منتظر ہو تے ہیں کسی اور حل کے نہیں اور نہ کسی اور مدد کے جو اللہ کی طرف سے نہ آئے۔حقیقت یہ ہے کہ مدد اور نصرت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔اس کے نتیجے میں اہل ایمان جنت میں داخل ہوتے ہیں۔وہ جہاد، آزمائش، صبر و ثبات، اللہ کے لیے یکسوئی و اخلاص، صرف اللہ کے تصور اور اس کے سوا ہر شے اور ہر شخصیت سے صرفِ نظر کے بعد جنت کے مستحق و سزاوار ہوتے ہیں۔

(ترجمان القرآن جولائی ۲۰۱۵ مضمون عزوہ بدر اور نصرت الٰہی کا قانون صفحہ ۵۷، ۵۸)

اور یہی بات سورت حٰم السجدہ کی آیات ۳۰ اور ۳۱ میں یوں کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰۗـؤُكُمْ فِي

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقینا اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ " نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جائو اُس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ہم اِس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی ۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی"۔

یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں۔بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کرلینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے۔ اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہیں کیا۔نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدہ توحید کے تقاضے پورے کرتے رہے (ترجمہ و مختصر تشریح قرآن از مولانا مودودی صفحہ ۱۲۱۳) اس استقامت اور ثابت قدمی کی بناپر اُن کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو اُن سے کہتے ہیں کہ تمہارے لیے کوئی غم و حزن و خوف نہیں بلکہ جنت کی بشارتیں ہیں۔اور اس کے علاوہ ہم دُنیا میں بھی تمہارے ساتھی اور مددگار ہیں اور آخرت میں بھی۔ جب اللہ اور اُس کے فرشتے آپ کے اولیاء ہوں تو پھر کیسا غم اور کیسا خوف۔

ثابت قدمی اور دُعا:

ثابت قدمی اور عزیمت اور اس کے تقاضے اور ذرائع پراس کتاب میں کافی گفتگو کی گئی ہے۔ ان ذرائع میں ایک ذریعہ دُعا بھی ہے۔ یہاں مشن میں استقامت کے حوالے سے دُعا سے متعلق کچھ باتیں مناسب ہوں گی۔ اللہ پر ایمان رکھنے والے بندوں کی خاص صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ دُعاوں کے ذریعے اللہ کی طرف متوجہ رہتے اور استقامت مانگتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔(ال عمران۔۸)

وہ اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ : "پروردگار ، جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے ، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے"۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۔ (البقرہ۔۲۵۰)
"اے ہمارے رب ! ہم پر صبر کا فیضان کر ، ہمارے قدم جما دے"۔
مسلم اور مسند احمد کی روایت کے مطابق تمام بنی آدم کے دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ وہ جس طرف چاہتا ہے ان دلوں کو پھیر دیتا ہے۔
رسول ﷺ کثرت سے یہ دُعا پڑھتے تھے:
یا مُقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک (ترمذی)
"اے دلوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا"۔

مقصد اور ذرائع کی تقدیس:

مقصد اور ذرائع کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مقدس مقاصد مقدس ذرائع کی مدد ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مقصد تو نیک ہو مگر حاصل اُسے ناپاک ذرائع سے کیا جائے۔اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد للّٰہیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ذرائع نا پاک ہوں تو ممکن ہے کہ انسان دنیوی اعتبار سے بظاہر کامیاب ہوتا نظر آئے مگر دینی اعتبار سے ناکام ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی کامیابی کا دارو مدار ظاہری کامیابی پر نہیں ہے بلکہ خلوص نیت، راست بازی اور اللہ کی رضا پر ہے۔ اگر اُس نے کامیابی کی بے جا خوہش اور تمنا میں اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا۔ تو وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام رہا۔ لیکن اگر اُس نےجدوجہد میں حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا اور مشکلات و مصائب کے باوجود جادہ مستقیم پر گامزن رہا تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے چاہے ظاہر بین آنکھوں کی نظر میں وہ ناکام ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف مختلف انداز میں اشارہ کیا ہے۔
وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (حٰم السجدہ۔۲۳)
"تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے "۔
یعنی سب سے اچھی بات اُس بندۂ خدا کی ہے جو ایمان و عمل کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اس کی طرف بلاتا ہے۔ اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس راہ میں جان کھپاتا ہے۔ اللہ کی طرف دعوت اس بات کی متقاضی ہے کہ داعی کے اپنے اعمال نیک ہوں اور وہ خود اپنے مالک و خالق کا فرماں بردار

بندہ ہو کیونکہ اگر اُس کی اپنی زندگی اطاعتِ الٰہی سے مزین نہ ہوگی تو اُس کی دعوت الی الخیر میں کیا اثر ہوگا؟
مقصد کی پاکی کے ساتھ ذرائع کی پاکی اسلام کا ایک ایسا تابناک اور امتیازی پہلو ہے کہ جو ایک مسلمان کی جدوجہد کو اول سے آخر تک روحانیت کے نور سے منور کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس یورپ کے مفکرین اور خصوصی طور پر میکیاولی کے مادی فلسفہ حیات نے یہ تعلیم دی ہے کہ اصل چیز مقصد کا حصول ہے اور اسے جائز و ناجائز جس طریقے سے بھی حاصل کیا جا سکے۔ حاصل کر لینا چاہئے۔(Ends justify the means)یہ اُن کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ حیلہ بازی، موقع پرستی، مکر و فریب سب کو سند جواز مل گئی ہے۔
اسلام کا اس معاملے میں اُصول یہ ہے کہ کوئی مقصد جس ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ ذریعہ خود اس مقصد کا ایک حصہ ہے۔ اسلام نے اپنی مقدس منزل تک پہنچنے کے لیے جوراستہ اور انداز تجویز کیا ہے وہ خود بھی اتنا ہی پاکیزہ اور مقدس ہے جتنا کہ خود منزل۔ کیونکہ اسلام کے پیش نظر یہ بنیادی حقیقت ہے کہ کوئی فرد یا گروہ جس راہ سے، فکر و احساس کے جس جذبے اور جس حوصلے اور نیت اور عزم کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھتا ہےاُن سب کا منزل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ قرآن نے کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد۔۲۲)
"ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں ، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر انہیں لوگوں کے لیے ہے"۔
یہ آیت مقصد اور ذریعہ کے باہمی تعلق اور ان دونوں کی تقدیس پر نہایت واضح الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس آیت کی رو سے خدا کے مخلص بندے کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ اور اس راہ میں ثابت قدم رہ کر جدوجہد کرتا ہے۔ اور جو مصائب اُسے پیش آئیں۔ اُنہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اس مقدس جدوجہد کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لیے سب سے اہم فرض نماز ہے۔ نماز کے ذریعے ہی اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جو انسان کے

دل سے حرص، لالچ، بخل اور دُنیوی مال و متاع کی محبت نکال کر اُس کے اندر اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اسی عمل سے اُسے راہِ خدا میں خلوص نیت کے ساتھ ایثار کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ اور اس ضمن میں آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ایک مومن صادق برائی کو نیکی سے دفع کرتا ہے۔ برائی کا مٹانا ایک بھلائیٔ کا کام ہے۔ خدا کا بندہ اس بھلائی کے کام کو بھلائی ہی سے سر انجام دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس بھلائی کے کام کو برائی کے ساتھ سر انجام دے تو اُس کے مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اس آیت کا آخری جملہ ’’ان کے لیے آخرت کا انجام ہے‘‘ بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس دُنیا میں خواہ مومن کو کامیابی نصیب نہ ہو۔ مگر آخرت کی کامیابی جو در حقیقت اُس کی جدوجہد کی غایت اُولٰی ہے وہ اُسے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک مومن کا مطلوب و مقصود جب رضائے الٰہی ہے جو سچے اور گہرے ایمان وایقان اورپاکیزہ اعمال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو خدا کا مخلص بندہ اس کے حصول کے لیے آخر ناپسندیدہ ذرائع کے استعمال کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن لاہورـجون ۱۹۷۰ اشارات از عبدالحمید صدیقی صفحہ ۸ تا۱۳)

جلد بازی سے پرہیز:

جلد بازی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی بھی کام کے نتائج اور اس کے ثمرات کو فی الفور حاصل کرنے کی کوشش کرے اورمناسب وقت کا انتظارنہ کرے ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشادہے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ 37
(الانبیاء:37)

"انسان جلد باز مخلوق ہے ۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں ، مجھ سے جلدی نہ مچاؤ‘‘۔

اصل میں عجل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہے۔ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے یا بنایا گیا ہے لیکن یہ لفظی معنیٰ اصل مقصودِ کلام نہیں ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں فلاں شخص عقل کا پتلا ہے۔ اس طرح عربی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کے سرشت میں ہے۔ (تفہیم القرآن جلد نمبر۳ صفحہ ۱۵۹)

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا
(بنی اسرائیل:11)
"انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہیے انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے "۔
اس آیت میں انسان کی اس کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ خیر و شر میں امتیاز نہیں کرتا اور بسا اوقات جلد بازی سے خیر کی جگہ شر کا طالب ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے نفس میں ایسی خواہشیں پال رکھی ہیں۔ جو فوری پورا ہونے کا تقاضا کرتی ہیں۔ جب وہ ان سے مغلوب ہو جاتا ہے تو ایک لمحہ کیلیے بھی صبر و انتظار نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کی جگہ برائی کا طلب گار بن جاتا ہے لہٰذا ایسے حالات میں اس کی ایسی رہنمائی ہونی چاہیے۔ جو اُس کو زندگی کے مختلف مراحل میں خیر و شر کا امتیاز سکھائے اور خواہشوں کو روکنے کے لیے اُس کی رہنمائی کر سکے۔ یہی رہنمائی قرآن سے باطبع حاصل ہو سکتی ہے۔ (تعلیم القرآن مرتبہ صابر قرنی ،پارہ نمبر 15صفحہ ۲۰)
<u>اسی طرح دُعا کے ضمن میں جلد بازی کے بارے میں</u> حافظ ابن قیم اپنی کتاب دوائے شافی صفحہ ۳۷تا ۳۸ میں فرماتے ہیں:
وہ آفت جو دعا کا اثر مرتب ہونے سے روکتی ہے، یہ ہے کہ بندہ جلد بازی کر جاتا ہے۔ دعا کی مقبولیت میں، جب تاخیر اور ڈھیل ہو جاتی ہے تو بندہ مایوس ہو کر دعا ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص کا حال اس آدمی جیسا ہو جاتا ہے جس نے کھیت میں دانے ڈالے، یا باغ میں درخت کے پودے لگائے، کھیتی اور درختوں کی خدمت کرتا رہا، انہیں پانی دیتا رہا، لیکن جب اس کے کمال کا وقت آیا اور پھل لگنے کا زمانہ قریب ہوا تو اس نے کھیتی اور درختوں کو چھوڑ دیا، اور اس سے بالکل غافل اور بے خبر ہوگیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت نے فرمایا:
يُسْتَجَابُ لأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ يَقُولُ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي.
(بخاری)
"تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے، اگر تم جلد بازی نہ کرو۔ دعا کرنے والا کہنے لگتا ہے کہ میں نے دعا کی، مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی"۔
حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت نے فرمایا:
لاَ يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ۔(مسند احمد)

"بندے کی دعا قبول ہوتی ہے، جبکہ وہ گناہ اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جلد بازی نہ کرے"۔
کسی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ □! جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟ آپ □ نے فرمایا:
يَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيبُ لِي فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ

(صحيح مسلم)
"جلد بازی یہ ہے کہ بندہ کہنے لگتا ہے۔میں نے دعا کی اور بہت ہی دعا کی، لیکن میری دعا قبول ہوتی نظر نہیں آتی۔اس حالت کو پہنچ کر وہ مایوس ہو جاتا ہے اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے"۔
حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ □ نے ارشاد فرمایا:
لا یزال العبد بخیر ما لم یستعجل (مسند احمد)
"بندے کی ہمیشہ خیر اور بھلائی ہے، جب تک کہ وہ جلد بازی نہیں کرتا"۔
صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بندہ جلد بازی کس طرح کرتا ہے؟
آپ□ نے فرمایا: یقول دعوت ربي فلم یستجب لي
"جب وہ کہتا ہے کہ میں نے رب سے بہت دعا مانگی، لیکن میری دعا اس نے قبول نہیں کی"۔
در اصل انسان کی جبلت کے اندر یہ کمزوری ہے کہ وہ نتائج جلد از جلد حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہ حاصل ہونے کی صورت میں مایوسی کا شکار ہونے لگتا ہے۔مولانا مودودی کے مطابق اس کے ذہن میں یہ خیال رہے کہ دُنیا میں حق اور باطل کی کشمکش بجائے خود ایک امتحان ہے۔ اور اس امتحان کا آخری نتیجہ اس دُنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نکلنا ہے۔اگر دنیا کے انسانوں کی عظیم اکثریت نے کسی قوم، یا ساری دنیا ہی نے حق کو نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام اور باطل کامیاب ہو گیا، بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت اپنے رب کے امتحان میں ناکام ہوگی۔ جس کا بدترین نتیجہ وہ آخرت میں دیکھے گا۔بخلاف اس کے وہ اقلیت جو باطل کے مقابلے میں حق پر جمی رہی اور جس نے حق کو سربلند کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی۔ اس امتحان میں کامیاب ہوگئی اور آخرت میں وہ بھی اپنی اس کامیابی کا

بہترین نتیجہ دیکھ لے گی۔ یہی بات ہے جو نوع انسانی کو زمین پر اُتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتادی تھی کہ :

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ 38وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ 39ۧ (البقرہ۔۳۸ تا ۳۹)

"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اُس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

اس حقیقت کو آپ جان لیں تو یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہے کہ اہل حق کی اصل ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیں اور حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ بلکہ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی حدتک باطل کو مٹانے اور حق کو غالب و سر بلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح اور مناسب و کارگر طریقوں سے کوشش کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ یہی کوشش خدا کی نگاہ میں ان کی کامیابی و ناکامی کا اصل معیار ہے۔ اس میں اگر ان کی طرف سے دانستہ کوئی کوتاہی نہ ہو تو خدا کے ہاں وہ کامیاب ہیں، خواہ دنیا میں باطل کا غلبہ ان کے ہٹائے نہ ہٹے اور شیطان کی پارٹی کا زور اُن کے توڑے نہ ٹوٹ سکے۔

(رسائل و مسائل، پنجم ص ۳۲۸)۔(انتخاب و ترتیب: امجد عباسی)(ترجمان القرآن فروری ۲۰۱۴ حکمت مودودی صفحہ ۳۱)

البتہ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنا اور سبقت کرنا پسندیدہ عمل ہے ، اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ 21

(الحدید:21)

"دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے ، جو مہیاکی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں ۔ یہ اللہ کا فضل ہے ، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے ، اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

دوسر ی جگہ فرمایا:
وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ۔
(آلِ عمران:133)
"دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے ، اور وہ خدا ترس لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے"۔

بے نیازی (خود داری)

دنیا میں با عزت زندگی گزارنے کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب لوگوں سے بے نیاز ہونا ہے جب تک انسان لوگوں سے بے نیاز رہے گا اور ان کا محتاج نہیں ہوگا تب تک لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت اور قدرو منزلت برقرار رہے گی۔ اوراللہ تعالی اس کے لیے آسانیاں پیدا کرے گا اور اس کی مدد کرے گاورنہ ذلیل و خوار ہوگا اور لوگوں کی نظروں سے گر جاے گا۔اللہ تعالی نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو بے نیاز (خود دار) ہوتے ہیں اور لوگوں سے سوال نہیں کرتے ہیں۔
اللہ تعالی کا ارشاد ہے:
لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ؁
البقرہ(273)
"خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے ۔ان کی خود داری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا"۔
آپ ﷺ خودداری کو بہت پسند فرماتے تھے اور صحابہ کرام کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے بلکہ بعض مرتبہ اس پر صحابہ سے بیعت لیا کرتے تھے۔ حضرتِ عوف بن مالک اشجعیؓ سے روایت ہے وہ فرناتے

ہیں کہ ایک دفعہ ہم آٹھ ، نو آدمی آپ کی مجلس میں بیٹھے تھے آپ نے ہم سے کہا کہ کیا تم لوگ بیعت نہیں کرو گے؟ جبکہ ہم سارے لوگ کچھ ہی عرصہ پہلے بیعتِ رضوان میں شریک تھے، ہم نے کہا یا رسول اللہ ہم نے تو بیعت کر لی ہے، اس کے باوجود آپ نے تین بار یہ سوال کیا ، تیسری بار ہم نے آپنے ہاتھ پھیلا دیے اور کہا یا رسول اللہ ہم نے تو بیعت کر لی ہے اب کس چیز پر بیعت کریں؟آپ نے فرمایا اس بات پر کہ تم اللہ عبادات میں کسی اور چیزکو شریک نہیں کروگے اور پانچوں نمازوں کی پابندی پر اورفرمانبرداری و اطاعت پراور پھر آپ نے آہستہ سے کہا اس بات پر کہ تم لوگوں سے سوال نہیں کرو گے ۔ حضرتِ عوف بن مالک فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے ان لوگوں میں سے ایسے بھی دیکھے کہ جب سواری کی حالت میں ان میں سے کسی کی چابک زمین پرگرجاتی توکسی کو یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ مجھے پکڑا دو بلکہ وہ خودسواری سے اترتے اور چابک اٹھا لیتے تھے

(مسلم)

توکل

توکل ایمانی صفت اور کیفیت کا نام ہے ' اس کے لغوی معنی کسی پر اعتماد ' بھروسہ اور سپرد کرنے کے ہیں اسی سے الوکیل کا لفظ ہے جو اللہ تعالی کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے اور اس کا معنی ہے کار ساز۔

توکل کے اصطلاحی معنیٰ یہ ہیں کہ

اولاً:

آدمی کو اللہ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو۔اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اُصول حلال و حرام کے جو حدود اور دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیئے ہیں وہی برحق ہیں اور اُنہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔

ثانیاً:

آدمی کا بھروسہ اپنی قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو۔ بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے۔ کہ دُنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اُس صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بناکر اُس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی میں کام کرے۔

ثالثاً:

آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کیلیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں اور اُنہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد، اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اُسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں۔ اور اُن سارے نقصانات، اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۵۰۷)

اللہ ہی پر توکل کیوں:

اللہ پر توکل ایمان کا لازمی تقاضا اور آخرت کی کامیابی کیلیے ایک ضروری وصف ہے۔ اس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو تو اُس کے وہ شاندار نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اُسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے۔ کہ ساری خیر اور مصلحت اُس حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اُس شخص کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ اُسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیل ارشاد کرنی چاہیے۔۔ اللہ اُس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اس کے سپرد کردے۔ وہ رہنمائی کیلیے بھی کافی ہے اور مدد کیلیے بھی۔ (تفہیم جلد چہارم صفحہ ۸۹)

ارشاد ربانی ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔"اللہ پر توکل کرو اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔ (سورہ احزاب آیت نمبر۴)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا

(سورہ الطلاق ایت نمبر۳)

"جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام (ارادہ)پورا کرکے رہتا ہے اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔

ابن حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی نے فرمایا:

من أحب أن يكون أقوى الناس فليتوكل على الله و من أحب أن يكون أكرم الناس فليتق الله عز و جل و من أحب أن يكون أغنى الناس فليكن بما في يد الله أوثق مما في يده۔۔عز و جل۔

"جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے زیادہ طاقت ور ہو جائے۔ اُسے چاہیے۔ کہ اللہ پر توکل کرے۔ اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے اُسے چاہیے۔ کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُس پر زیادہ بھروسہ رکھے بہ نسبت اُس چیز کے جو اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے تو اُسے چاہیے۔ کہ اللہ عز و جل سے ڈرے۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۷۴)

توکل اور اسباب کا صحیح توازن:

دنیوی تدابیر اور اسباب سے کام لینا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ مومن کی اصلی شان یہ ہے کہ وہ عالمِ اسباب میں ساری تدابیر قانون فطرت کے مطابق اُس طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہل دنیا کرتے ہیں مگر اُس کا بھروسہ اُن تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اور وہ خوب سمجھتا ہے کہ اُس کی کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک شروع ہو سکتی ہے نہ ٹھیک چل سکتی ہے اور نہ آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے جب تک اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو۔ اس ضمن میں رسول اللہ کا ایک اعرابی کو اونٹ باندھنے کا مشورہ اسبا ب کو اختیار کرنے کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا کشتی تیار کرنا اسباب کو اختیار کرنا تھا لیکن جب اُس کو پانی میں ڈالا تو پھر نتائج اور منزل تک پہنچنے کیلیے اللہ سے دُعا کی

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْـرٖ۩ـهَا وَمُرْسٰـهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(سورہ ہودآیت نمبر ۴۱)

"اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس میں۔ اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھرنا بھی۔ میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ نمبر ۳۴۰ تا ۳۴۱)

تدبیر اور توکل کے درمیان ٹھیک ٹھیک توازن ہمیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے اقوال میں نظرآتا ہے (سورہ یوسف) ایک طرف وہ عالم اسباب کے قوانین کے مطابق ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل و فکر اور تجربہ کی بنیاد پر اختیار کرنی ممکن تھیں۔ بیٹوں کو اپنا پہلا جرم یاد دلاکر زجر و تنبیہ کرتے ہیں تاکہ وہ دوبارہ ایسا جرم کرنے کی جرات نہ کریں۔اُن سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جن احتیاطی تدابیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اُسے بھی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں۔(شہر میں داخل ہونے کے لیے ایک سے زیادہ دروازے استعمال کریں) تاکہ اپنی حد تک خارجی سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے۔ جو ان لوگوں کے گھر جانے کا موجب ہو۔ مگر دوسری طرف ہر آن یہ بات اُن کے پیش نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اور اصلی حفاظت اللہ کی حفاظت ہے اور بھروسہ اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہیے۔۔

یہ صحیح توزن اپنی باتوں میں اور کاموں میں صرف وہی شخص قائم کر سکتا ہے۔ جو حقیقت کا علم رکھتا ہو۔ جو یہ بھی جانتا ہو کہ حیاتِ دُنیا کے ظاہری پہلو میں اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسان سے کس سعی و عمل کا تقاضا کرتی ہے اور اس سے بھی واقف ہو کہ اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت نفس الامری پوشیدہ ہے اُس کی بنا پر اصل کارفرما طاقت کونسی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی سعی وعمل پر انسان کا بھروسہ کس قدر بے بنیاد ہے۔ یہی وہ بات ہے جو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر ظاہر کا غلبہ ہوتا ہے وہ توکل سے غافل ہو کر تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور جس کے دل پر باطن چھا جاتا ہے وہ تدبیر سے بے پرواہ ہو کر نرے توکل ہی کے بل پر زندگی کی گاڑی چلانا چاہتا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۱۸)

پس خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے تمام امور و معاملات کی انجام دہی میں مناسب اسباب اختیار کرے اور حسبِ استطاعت بہترین تدبیر کرنے کے بعد نتائج اور انجام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور اُس پر مکمل اعتماد اور بھروسہ رکھے۔ اور راحت و تنگی، خوشی و غمی الغرض ہر حال میں اُسی سے مدد طلب کرتا رہے۔ اور اسی سے کامیابی کی التجا کرے اور پختہ عزم و ہمت کے ساتھ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہے۔ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (ال عمران آیت نمبر ۱۵۹)

"پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اُسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں"۔

اللہ پر توکل ہراس اور بے اطمینانی سے بچاتا ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَاوَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ-(توبہ۔۵۱)

"ان سے کہو، ’’ ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے ۔ اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے "۔

دُنیا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اُس کے نفس کی خوشی بعض دُنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر یہ مقاصد حاصل ہو جائیں۔ تو وہ پُھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اُس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اُس کا سہارا

تمام تر مادی اسباب پر ہوتا ہے وہ سازگار ہوں تو اُس کا دل بڑھنے لگتا ہے۔ اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اور اس کام میں اُس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔راہ حق میں کام کرتے ہوئے اُس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو، دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اُس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامیابیاں اُس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اول تو دونوں کو وہ اپنے حق میں خدا کی طرف سے سمجھتا ہے۔اور دوسرے اُس کے پیش نظر دُنیوی مقاصد نہیں ہوتے۔ کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ اُس کے سامنے تو رضائے الٰہی کا مقصدِ وحید ہوتا ہے۔ اور اس مقصد سے اُس کے قریب یا دُور ہونے کا پیمانہ صرف یہ امر ہے کہ راہِ خدا میں جان کی بازی لگانے کا جو فرض اُس پر عائد ہوتا تھا۔اُسے اُس نے کہاں تک انجام دیا۔
اگر یہ فرض اُس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دُنیا میں اس کی بازی بالکل ہی تِر گئی ہو لیکن اُسے پورا بھروسہ رہتا ہے کہ جس خدا کے لیے اُس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اُس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دُنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا کہ اُن کی سازگاری یا ناساز گاری اُس کو خوش یا رنجیدہ کر دے۔ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالمِ اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگارحالات میں بھی اُس عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہلِ دُنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہوا کرتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۰۰)

اللہ پر توکل دلیری پیدا کرتا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (انفال۔۶۱)

"اور اے نبیﷺ، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے"۔
یعنی اگر دشمن تمہارے ساتھ گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے تو بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ تمہیں خواہ مخواہ اُس

کی نیت پر شبہ کرکے خون ریزی کو طول نہیں دینا چا ہیے۔اور اس معاملے میں تمہیں خدا کے بھروسے پر بہادر ہونا چاہیے۔ یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ خدا کے بھروسے پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہئیے۔

اور ایک دوسری جگہ سورہ ہود آیت نمبر۵۵، ۵۶ میں حضرت ہود علیہ السلام کی مثال دی گئی ہے کہ وہ مجرم قوم کو انتہائی دلیری اور بہادری کے ساتھ اللہ پر پورا بھروسہ رکھتے ہوئے چیلنج دیتے ہیں کہ ’’تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اُس کے ہاتھ میں نہ ہو’’۔

<u>توکل استغنا پیدا کرتا ہے:</u>

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭعَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ (توبہ۔۱۲۹)

"اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ﷺ ، ان سے کہہ دو کہ’’ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے ، کوئی معبود نہیں مگر وہ ، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور مالک ہے عرشِ عظیم کا "۔

<u>اللہ پر توکل شیطان کے فتنوں سے محفوظ رکھتا ہے:</u>

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (نحل۔۹۹)

"اُسے اُن لوگوں پر تسلّط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

اس سے پہلے کی آیت میں خبر دار کیا گیا ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کرو تو شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ ہونے کے لیے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ <u>اور پھر اس آیت میں بتادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔اُن لوگوں پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہوتا۔</u>

احسان

ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو حسن کہا جاتا ہے۔الحسنۃُ ہر وہ نعمت ہے جو انسان کو اُس کے نفس یا بدن یا اُس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اُس کے لیے مسرت کا سبب بنے۔ اس کی ضدسَیِئَۃٌ یعنی بُرائی ہے۔کبھی یہ لفظ فراخ دلی، وسعت اور کامیابی کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے لیکن زیادہ تر حَسَن کا لفظ اُس چیز کیلیے استعمال ہوا ہے جو عقل و بصیرت کےرُو سے اچھی ہو۔

احسان دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا، کہا جاتا ہے کہ اَحسَنَ اِلَی فلان اُس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حُسن پیدا کرنا اور یہ چیز حُسنِ علم اور حُسنِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ (مفردات القرآن جلد 1،از امام راغب اصفہانی ص258)

اصطلاح میں احسان کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام اور عمل شرعی تقاضوں کے مطابق اس طرح ادا کیا جائے کہ اس کام یا عمل میں حسن اور خوبصورتی پیدا ہو۔

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُم بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (النحل۔۹۰)

"اللہ تعالیٰ تم کو انصاف اوراحسان کا حکم دیتا ہے"۔

اس میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کردینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے۔ لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو اُن کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے۔لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔

در اصل اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسانی روح نفس کی غلامی سے آزاد، اور دُنیا پرستی کی آلودگی سے پاک ہو اور اِن چیزوں سے پاک اور آزاد ہو کر اللہ کی اطاعت، اُس کی محبت اور اُس کی رضا جوئی کے جذبات سے سرشار ہو جائے۔اس پاکیزگی اور خدا طلبی کا معیارِ مطلوب یہ ہے کہ انسان وہی کچھ پسند کرنے لگے جو اُس کے اللہ کو پسند ہے اور ہر اُس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے جو اس کے اللہ کو ناپسند ہے۔ اپنے حقیقی آقا کے حکموں پر اس طرح عمل

کرنے لگے گویا وہ اُسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ناراضگی سے اس طرح ڈرتا رہے گویا اُس کے تختِ جلال کے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی رضا کے لیے اس طرح لپکتا رہے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے۔ اور اُس کے اشاروں پر اپنی جان و مال قربان کر دینے کیلیے اس طرح تیار رہے جیسے ان چیزوں کی اُس کی نگاہ میں کوئی قیمت ہی نہیں۔ روحانیت کے اس سب سے اونچے اور معیاری مقام کا نام اسلام کی زبان میں ''احسان'' ہے۔ اور روح میں پاکیزگی اور خدا طلبی کی یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے اسلام نے جو بنیادی اور راست تدبیریں مقرر فرمائی ہیں وہ وہی ہیں جن کو ارکانِ اسلام کہا جاتا ہے۔

احسان آگے بڑھ کر اور اچھے طریقے سے عمل اختیار کرنے کا نام ہے:

اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے۔ اُن کو چاہئے کہ وہ نعمتیں اپنے تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ لوگوں کی ضروریات اور حاجات اُن سے رفع کریں۔ اور احسان کا رویہ اختیار کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمر وعاصؓ سے روایت ہے۔رسول اللہ نے فرمایا:

''اللہ نے کچھ لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے۔ان نعمتوں کو وہ اُن کے پاس اُس وقت تک برقرار رکھتا ہے جب تک وہ مسلمانوں کی حاجتیں پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اُکتا نہیں جاتے۔ جب وہ اُکتا جائیں تو اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے"۔ (طبرانی)

اللہ تعالیٰ دُنیا میں اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازتا ہے تو یہ دراصل آزمائش ہوتی ہے جو لوگ خوش دلی سے ان نعمتوں سے مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔اُن کو نعمتیں ملتی رہتی ہیں۔ انسان کو سمجھنا چاہئے کہ اُسے جو کچھ مل رہا ہے اس لیے مل رہا ہے کہ دوسروں کا حق اُنہیں پہنچائے۔ وہ یہ نہیں کرتا تو اسے ان نعمتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔یہ نقطۂ نظر ہو تو معاشرے کے مسائل آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ کوئی مصیبت کے وقت تنہا نہیں ہوتا۔ (ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۶ مضمون ''کلام نبوی کی کرنیں از مولانا عبدالمالک صفحہ ۳۵۔)

احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے:

فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (ال عمران:148)

"آخر کار اللہ نے اُن کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں"۔

<u>اللہ تعالیٰ نے ہمیں برائی کے بدلے میں احسان کا حکم دیا ہے۔ اس سے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں:</u>

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ

(حم سجدہ۔۳۴)

"اور اے نبی ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں ۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے"۔

اس بنا پر جب آدمی کو رشتہ داروں یا دوسرے ساتھیوں کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اُن سے بھلائی کرے اور اُن کے ساتھ اور زیادہ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔اسی لیے اسلام نے ہمیشہ صلہ رحمی کا درس دیا ہے۔ نبی نے ان الفاظ میں اس طرف توجہ دلائی ہے:

لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلَكِنِ الْوَاصِلُ الَّذِي إِذَا قَطَعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا.

صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ آدمی صلہ رحمی کا بدلہ چکائے بلکہ صلہ رحمی یہ ہے کہ اگر لوگ آدمی سے تعلقات توڑیں تو یہ اُن کو جوڑے۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۲۰۰۵ مضمون قطع رحمی از ڈاکٹر سید محمد نوح صفحہ ۵۲ تا ۵۳)

<u>اسلام میں عمل، حجم کے لحاظ سے نہیں بلکہ احسان کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے:</u>

یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے۔ کہ اسلام میں عمل اس کے حجم یا اُس کی مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے ناپا جاتا ہے کہ اس میں احسان کتنا ہے اور اس میں پختگی کس قدر ہے۔

<u>اسلام میں احسان کا مقام نفل کا نہیں بلکہ یہ ایک فریضہ ہے :</u>

جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لازم کیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ اُن پر روزے اور دوسرے فرائض لازم کر دیئے گئے ہیں۔

امام مسلم نے حضرت شدّادبن اوسؓ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ فرماتے ہیں:

عن شَدَّادِ بن أوسٍ رضي اللّٰه عنه،عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال : " إنَّ اَللَّهَ تَعالى كَتَبَ الإِحْسانَ على كُلِّ شَيْءٍ، فإذَا قَتَلْتُمْ فأحْسِنُوا القِتْلَةَ وَإذَا ذَبَحْتُمْ فأحْسِنُوا الذَّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ ۔ (مسلم)

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں احسان کو لازم کیا ہے یہاں تک کہ جب تم کسی چیز کو قتل کرو تو احسن طریقے سے اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو وہ بھی اچھے طریقے سے کرو۔ اپنی چھری کو خوب تیز کیا کرو اور جس جانور کو ذبح کرنا ہو اُسے اذیت سے بچاؤ"۔

یہاں لفظ كَتَبَ استعمال ہوا ہے اور اس کے بارے میں اُصول یہ ہے کہ یہ وجوب اور فرضیت کیلیے آتا ہے۔

آپ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ:

إن الله يحب من العامل إذا عمل أن يحسن۔

(بھیقی)

"اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ایک عامل جب کوئی عمل کرے تو اُسے احسن طریقے سے انجام دے"۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر عمل میں احسان کو لازم کیا ہے اور اُسے واجب قرار دیا ہے اس طرح وہ احسان کو بھی پسند فرماتا ہے اور صاحب احسان کو بھی۔

بلکہ قرآن تو مکلفین سے صرف عمل حسن کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ اُنہیں عمل احسن کی طرف دعوت دیتا ہے :

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

(الزمر۔۵۵)

"اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی"۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ 17 الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

(الزمر۔۱۷ تا ۱۸)

"پس بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں"۔

قرآن مجید تو مخالفین کے ساتھ جدال کے لیے بھی طریق احسن کا حکم دیتا ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (النحل۔۱۲۵)

"اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو"۔

وہ برائی کو احسن طریقے سے دفع کرنے کا حکم دیتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِیَ اَحْسَنُ۔ (سورہ حٰم السجدہ۔۳۴)

"نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو"۔

تخلیق کائنات اور موت و حیات کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ کون احسن عمل کرتا ہے:

قرآن نے آسمان، زمین، باقی کائنات اور موت و حیات کی تخلیق کا مقصد یہی بیان کیا ہے کہ مکلفین کو آزمایا جائے کہ ؛

اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورہ الکھف ۔۷) "ان میں سے کون احسن عمل کرنے والا ہے"۔

جیسا کہ اس پر کتاب اللہ کی کئی آیات گواہ ہیں۔

(سورہ ہود آیت نمبر۷، سورہ الملک آیت نمبر۲، سورہ الکہف آیت نمبر۷)

ان کے درمیان تسابق اور مقابلہ اس میں نہیں ہے کہ کون بُرا عمل کرتا ہے اور کون اچھا، بلکہ اصل مقابلہ اس بات میں ہوتا ہے کہ کون حسن(اچھا) عمل کرتا ہے۔ اور کون احسن (زیادہ اچھا)۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مسلمان فرد کا اصل کام ہی یہ ہو کہ وہ ہمیشہ احسن اور ارفع کی کوشش کرتا رہے۔

جب جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگو:

حدیث میں ہے:

إذا سألتم الله فاسألوه الفردوس فإنه أوسط الجنة وأعلى الجنة وفوقه عرش الرحمن۔

"جب تم اللہ سے جنت مانگو تو اُس سے جنت الفردوس کی دُعا کرو۔یہ سب سے بہترین جنت ہے یہ سب سے اعلیٰ ہے اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے"۔

حدیثِ جبریل ؑمیں احسان کی کیفیت کا بیان:

اور مشہور حدیث جبریل میں بھی ہے کہ جب جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں سوال کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا:
الإحسان قال أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فإنه يراك۔
(متفق علیہ)
"احسان یہ ہے کہ اللہ کی ایسی عبادت کرو گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے پس اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے"۔
یہ عبادت میں احسان کی تفسیر ہے اور اس سے مراد ہے ایسا مگن ہونا اور اس قدر اخلاص کا مظاہرہ کرنا جیسے اللہ سامنے نظر آرہا ہے۔
(دین میں ترجیحات از یوسف القرضاوی صفحہ ۷۳ تا ۷۵)
کیا پیاری کیفیت ہے جو حضور ﷺ بیان فرماتے ہیں:
''عبادت ایسے کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ کر سکو تو یہ تصور کرو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔
یہی تصور غالب آجائے تو بہت بڑی بات ہے۔ ساری کیفیات ہی بدل جائیں گی۔ اگر کوئی نابینا بھی بادشاہ کے دربار میں ملنے کے لیے آئے، اگر چہ وہ اندھا ہے اور اُسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن جب اسے یہ کہا جائے کہ اب بادشاہ تمہارے بالکل سامنے ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ اُس کی گردن ڈھیلی پڑ جائے گی، اُس کے قدموں میں فرق آجائے گا اور اس کی آواز دب جائے گی۔ فقط یہ سنتے ہی کہ بادشاہ سامنے ہے۔ اس پر یہ کیفیت طاری ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ نابینا ہے اور اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا ۔ہم نا بینا ہی سہی۔ اگر صرف یہ تصور ہی دل میں بٹھا لیں کہ خدا دیکھ رہا ہے تو ہماری عبادت کی کیفیات بدل جائیں۔ اگر اللہ اپنی عظمت ہمارے دل میں بٹھا دے اور رونے کی توفیق بھی عطا فرما دے تو پھر کیا کہنے!
(ترجمان القرآن لاہور جون ۲۰۱۵ صفحہ ٦٤)

رزم خیر و شر کے سفر نامے سے آگہی

غلبۂ دین کی جدوجہد میں حصہ لینا، اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینا، بڑے پیمانے پر انسانوں کو ظلم کی طویل رات سے نجات دلانا، جھوٹے خداؤں اور طاغوت کی فرمانروائی سے بچانا اور اُنہیں اپنے رب کی طرف بلانا، ظاہر ہے کہ یہ کام ثبات و استقامت اور اولوالعزمی،اور ہر طرح کی آزمائش کو خندہ پیشانی سے جھیلنے کا مطالبہ و تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ تمام کیفیات اور ساری خصوصیات ایک مسلمان داعی اور تحریک کے کارکن سے مطلوب ہیں۔ ان صفات کو پیدا کیے بغیر انسان مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔

اسی غلبۂ دین کی جدوجہد کے حوالے سے یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔ کہ نیکی کو اپنانے اور خیر کی طرف بڑھنے، بھلائی کا شعور پیدا کرنے، حسنات کے حرص و لالچ کو اپنی طبیعت کے اندر پانے کا رجحان تو موجود ہوتا ہے لیکن خیر کا کوئی علم اپنے نتیجے اور انتہا کو نہیں پہنچ سکتاجب تک کہ شر کا علم بھی موجود نہ ہو۔ شر کے جو سر چشمے ہیں، برائی کی جو جڑیں ہیں۔ اس کا جو پورا نظام ہے۔ فتنے اور اس کے جو اسباب ہیں، فی زمانہ شرکی جو حکمتِ عملی اور اس کی یلغار کی جو صورتیں ہیں، اس باطل اور کفر کے اندر جس طرح کی کہرمانیاں ہیں اُن کے بارے میں علم حاصل کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ خیر کے بارے میں۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ مشہور صحابی ہیں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب نبی کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تھے تو خیر، بھلائی اور جنت کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ لیکن میں جب بھی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ تو میں آپ سے شر اور فتنونکے بارے میں پوچھتا تھا۔ اور ان کے سدباب اور مقابلے کے حوالے سے سوال کرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو طبقات ہیں اور بعد میں اُمت نے مختلف حوالوں سے اُن سے استفادہ کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ اس لحاظ سے یکتا اور منفرد اعزاز رکھتے ہیں۔ کہ نبی سے اُنہوں نے فتنوں اور مسلمانوں کی ناکامیوں اور ہزیمتوں کے حوالے سے بھی تمام پیشن گوئیوں کو حاصل کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو اس حوالے سے جب وقت پیش آتی تھی اور معاملہ فہمی کا مسئلہ پیش ہوتا تھا تو وہ حضرت حذیفہؓ سے رجوع کرتے تھے۔

اس سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ معاشرے کے اندر بدی کے جو رجحانات ہیں، بدی کی اُٹھنے والی تحریکوں کی جو

بنیادیں اور کلیات ہیں۔ اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔ اور طاغوت کی فرمانروائی کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے جتنے ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان ہاتھوں کو روکنا، ان چہروں کو پہچاننا، ان رویوں سے آگاہ ہونا اور اُن کے طور طریقوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا بالکل مطلوب ہے۔۔۔اگر آپ رزمِ خیر و شر کے پورے سفرنامے سے آگاہ نہیں ہونگے تو اپنی جدوجہدکو صحیح رُخ نہیں دے سکیں گے

(ترجمان القرآن لاہور جنوری ۲۰۱۱، مضمون غلبہ دین اور اُسوۂ رسول از سید منور حسن صفحہ۶۱ تا ۶۲)

ڈاکٹر محمود احمد غازی اسی رزمِ خیر و شر کے سفرنامے کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔اسلام کائنات کے حقائق کے مکمل ادراک اور صحیح شعور کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کو بہتر بنانے کے لیے مسلسل کوشش کی جاتی رہے۔ ان حقائق کے ادراک میں ان قوتوں کا ادراک بھی شامل ہے جو شر کی علمبردار ہیں۔ اور کائنات میں خیر کے خلاف کار فرما ہیں۔ خیر کے خیر ہونے کا تصور اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب تک انسان شر کے تصور سے آشنا نہ ہو۔ اس لیے کہ اگر انسان شر کا ادراک نہ رکھتا ہو تو اُس کو خیر کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک بار کسی علاقے کی گورنری یا کسی اور اہم ذمہ داری پر فائز کرنے کے لیے کسی مناسب فرد کی تلاش تھی۔ صحابہ کرام سے مشورہ ہوا اور مختلف نام زیر غور آئے۔ ایک نام زیرغور آیا اور حاضرین نے ان صاحب کے تقوے اور کردار کی خوب تعریف کی۔ <u>اور کہا کہ وہ اتنے نیک ہیں کہ کانہ لا یعرف الشر۔ گویا کہ وہ شر کو جانتے ہی نہیں</u>یعنی وہ بدی اور بُرائی کے تصور سے ہی نا آشنا ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواباً فرمایا اذا یوشکُ ان یقع فیہ۔پھر تو اس کا بڑا امکان ہے کہ وہ شر میں مبتلا ہو جائیں۔ (احکام القرآن جصاص میں ہے قیل للعمر بن الخطاب: فلاں لا یعرف الشر، قال اجدر ان یقع فیہ) پھر آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص کو قطعاً ایسی نازک اور اہم ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔ اس لیے جو شخص شر کے تصور سے ہی ناواقف ہو اُس کے شر میں پڑنے کے امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ہمیں ایسا فرد درکار ہے جو خیر و شر کا کما حقہ، ادراک رکھتا ہو۔ اور پھر خیر کی قوتوں کے لیے کام کرے۔ اس لیے اسلام روزِ اول سے ہی خیر کی بات کے ساتھ ساتھ شر کی بات بھی کرتا ہے۔ شر کے لیے جو قوتیں کار فرما ہیں اُن کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اور شر کی ان قوتوں کے خاتمے اور سدِباب کے لیے جس بالاتر

سیاسی اور عسکری قوت کی ضرورت ہے۔ اُس کا بھی ذکر کرتا ہے۔
اور اس قوت کو کامیاب و کامران بنانے کے احکام بھی دیتا ہے۔
(اسلام کا قانون بین الممالک از ڈاکٹر محمود احمد غازی صفحہ ۳۲۱)

جس طرح شر اور فتنہ و فساد کی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اُن کے سرچشموں، حکمت عملی اور تدابیر سے مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔۔اسی طرح یہ بھی ایک ضروری امر ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہوں کیونکہ یہ امت باہمی اخوت اور مروت اور ایک دوسرے کےضروریات اور حالات سےباخبری اور خبر گیری کی بنیاد پر ہی قائم و دائم رہ سکتی ہے اور اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے قوت فراہم کر سکتی ہے۔نبی کریمؐ کی تنبیہ ہے۔
حدثنا محمد ثنا أحمد نا عبد الله بن أبي جعفر الرازي عن أبيه عن الربيع بن أنس عن أبي العالية عن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم من لم يهتم بأمر المسلمين فليس منهم و من لم يصبح ويمس ناصحا لله ولرسوله ولكتابه ولإمامه ولعامة المسلمين فليس منهم۔ (المعجم الاوسط للطبرانی)
"حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کو اہمیت نہیں دیتا (ان میں دلچسپی نہیں لیتا) وہ مسلمانوں میں سے نہیں اور جو صبح و شام اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور اسکی کتاب، مسلمانوں اور ان کے (دینی و دنیاوی معاملات کے) ذمہ داروں کے ساتھ خیر خواہانہ و مخلصانہ تعلق نہیں رکھتا وہ ان میں سے نہیں"۔

جہاد فی سبیل اللہ سے قتال فی سبیل اللہ تک

جہاد کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کیلیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اُس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کر دینے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو بس میں ہو۔ اسلام ہمیں ہدایت دیتا ہے کہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ خواہ کوئی ہو اُسے ہٹانے کی بھر پور کوشش کی جائے۔ مسلسل کی جائے اور آخری حد تک کی جائے۔ اس کوشش کو شریعت جہاد فی سبیل اللہ کا نام دیتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کیا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ (الحج۔۷۸)

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے"۔

مولانا مودودی نے بہت خوبصورت انداز میں جہاد، قتال، اور فی سبیل اللہ کی وضاحت کی ہے۔ ''جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جدوجہد، کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر جہاد اور مجاہدہ میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مزاحمت کرنے والی کچھ طاقتیں ہیں جن کے مقابلے میں یہ جدوجہد مطلوب ہے۔ اور اس کے ساتھ فِی اللہ کی قید یہ متعین کر دیتی ہے کہ مزاحمت کرنے والی طاقتیں وہ ہیں جو اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی میں اور اس کی راہ پر چلنے میں مانع ہیں اور جدوجہد کا مقصودیہ ہے کہ ان کی مزاحمت کو شکست دے کر آدمی خود بھی ٹھیک ٹھیک بندگی کرے اور دُنیا میں بھی اس کا کلمہ بلند اور کفر و الحاد کے کلمے پست کر دینے کے لیے جان لڑا دے----- جہاد کا وسیع تر میدان پوری دنیا ہے۔ جس میں کام کرنے والی تمام بغاوت کیش اور بغاوت آموز اور بغاوت انگیز طاقتوں کے خلاف دل اور دماغ اور جسم اور مال کی ساری قوتوں کے ساتھ سعی و جدوجہد کرنا وہ حقِ جہاد ہے جسے ادا کرنے کا یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۵۳، ۲۵۴)

اس جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اُصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی مختلف شکلیں اور قسمیں مقرر کر دی ہیں ۔
امام راغب اصفہانی نے جہاد کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ ایک جدوجہد تو وہ ہے جو کسی کھلے دشمن کے خلاف ہو یعنی ''مجاہدة العدو الظاہر'' یعنی میدان جنگ میں نکل کر دشمن سے معرکہ آرائی۔ جدوجہد یا جہاد کی دوسری قسم ''مجاہدة النفس'' ہے جو انسان کی اپنے نفس امارہ اور اپنے اندر موجود بدی کی قوتوں کے خلاف ہو۔اور تیسری قسم وہ ہے جو شیاطین اور ابلیس کی ذریت کے خلاف ہو یعنی ''مجاہدة الشیطان'' (مفردات القرآن جلد اول صفحہ نمبر ۲۲۱)

مولانا یوسف اصلاحی کے نزدیک جہاد کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہیں:

(۱) داخلی جہاد ۔ (۲) دعوتی اور فکری جہاد۔ (۳) مسلح جہاد۔(قتال فی سبیل اللہ)

کس طرح کے حالات میں ان میں سے جہاد کی کونسی قسم اختیار کی جانی چاہیے۔ اور اس کا عملی طریقہ کیا ہوگا اس کی تفصیلات کتا ب و سنت میں نہایت واضح ہیں۔

۱۔ داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے :

کہ خود اسلامی معاشرے کے اندر جو بُرائیاں سر اُٹھاتی نظر آئیں۔ اُن کے خلاف جنگ کی جائے۔ اور اُنہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔ نبی کا ارشاد ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- قَالَ « مَا مِنْ نَبِىٍّ بَعَثَهُ اللَّهُ فِى أُمَّةٍ قَبْلِى إِلاَّ كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لاَ يَفْعَلُونَ وَيَفْعَلُونَ مَا لاَ يُؤْمَرُونَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ۔

(مسلم بحوالہ مشکوٰة۔اسلام ایک نظر میں صفحہ ۳۳۲)

"مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آئے تو ان کی امتوں میں سے ان کے کچھ حواری (ساتھی) ایسے ہوتے جو اس پیغمبر کے سنتوں پر عمل کرتے اور اس کے احکام کی اقتداء کرتےتھے۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جو وہ کہتے تھے تو اس پر خود عمل نہ کرتے تھے۔

اور جس بات کا ان کو حکم نہ دیا جاتا وہ کرتے تھے۔ پس جو اپنے ہاتھ کے ذریعے سے ان سے جہاد کرے تو وہ مومن ہے۔ جو اپنی زبان کے ذریعے ان سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اور جو اپنے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں"۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو بُرائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اُسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے۔

۲۔دوسری یہ کہ اس کوشش یا جہاد کی عملی صورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے امر بالمعروف و نہی عن المنکر عنوان کے تحت تفصیلاً درج کر چکے ہیں کہ سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس بُرائی یا ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے۔ اور اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ نصیحت کی جائے سمجھایا جائے۔ آخرت یاد دلائی جائے۔ اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہہ بھی کی جائے۔ اور اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو۔ تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس بُرائی کے خلاف دل بے چین ہو جائے۔ آرزو کی جائے کہ یہ بُرائی جلد مٹ جائے۔ دُعائیں کی جائیں کہ اللہ اپنے اس بندے کو شیطان کے حملے سے بچا لے۔ اور اس کے ایمان کو بیدار کر دے۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں۔ اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر شکل جہاد ہے۔ ان کوششوں کو کہیں احادیث میں جہاد اور کہیں تغییر منکر (برائیوں کو بدل دینا) بھی کہا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم انہیں چھوڑ رہےہیں۔ بہرحال ان تمام احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاد اُمت کا ایک اجتماعی فریضہ ہے اس فریضے سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں اور نہ ریاست بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں سبھی شریک ہیں۔

۲۔دعوتی اور فکری جہاد:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے خلاف جن شبہات کو پیش کیا جائے جو اعتراضات اُٹھائے جائیں۔ جو دلائل دیے جائیں۔ اُن کا مناسب اور مدلل جواب دیا جائے کہ پھر کسی اعتراض اور شک کی گنجائش نہ

رہے۔ مکی دور سر تا سر اسی جہاد کا دور تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دے رکھا تھا کہ:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ (الفرقان آیت۔۵۲)

"پس تم ان کافروں کا کہا نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے جہاد کبیر کرتے رہو"۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کے نزدیک قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی دلیلوں کو برابر پیش کرتے رہو۔ جو اسلام کی سچائی اور اُن کے انکار کی وجوہ کی بے وقعتی کو کھول کر رکھ دیتی ہوں۔ اور اُس طرزِ استدلال سے اُن کے موقف کی کمزوری برابر عیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے۔ اور یہ کام پورے زور شور کے ساتھ انجام دیتے رہو۔ یہاں تک کہ اُنہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہ رہے۔

نبی کا ارشاد ہے:

جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ

(ابوداؤد)

"مشرکوں سے اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ذریعے جہاد کرو"۔

قرآن مجید نے ان کی ایک ایک دلیل اور اُن کے ایک ایک اعتراض کا جس طرح جواب دیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا حال معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے لفظوں کو سُن لینا کافی ہے جس کا اس سلسلے میں اعلان فرما رکھا تھا:

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا۔

(الفرقان۔۳۳)

"اے محمدؐ! یہ لوگ تمہارے سامنے جو انوکھے سے انوکھا اعتراض بھی لے کر آئیں گے ہم اس کے جواب میں تمہیں ٹھیک بات اور بہترین وضاحت والی دلیل ضرور بتا دیں گے"۔

<u>مولانا مودودی قرآن کے ذریعے جہاد کبیر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔ جہاد کبیر کے تین معنی ہیں۔</u>

ایک انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جان فشانی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔

دوسرے بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لاکر ڈال دے اور

تیسرے جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے جس جس پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں اُس پر اپنی طاقت بھی لگا دے۔ اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو، کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے۔ اور جان و مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی۔ (تفہیم القرآن جلد سوم۔۴۵۷)

ظاہر ہے کہ جب گمراہوں کے پاس دلیل نہ ہو۔ تو ایسا ہو کر رہتا ہے کہ خیر خواہی کا جواب جاہلی حمیت سے، میٹھے بول کا جواب گالیوں سے اور دلیلوں کا جواب پتھروں سے دیا جائے۔ لیکن ان ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت مسلسل دی جاتی رہے۔ بلا کسی خوفِ ملامت دی جاتی رہے اور حالات کا دباؤ چاہے کیسا ہی سخت ہو کسی مصالحت کا خیال تک ذہن میں نہ لایا جائے۔ نبی ﷺ کو یہ ہدایت ایسی ہی صورت حال کے لیے دی گئی تھی کہ:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ

(حجر۔۹۴)

"جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اُسے واشگاف طور سے سنا دو اور مشرکوں کی پرواہ نہ کرو"۔

البتہ اس فکری اور دعوتی لڑائی کے لیے قرآن نے یہ اُصولی ہدایت دی ہے کہ بحثِ و مباحثہ کا وہ طریقہ اختیار کرو جو سب سے اچھا طریقہ ہو:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل آیت۔۱۲۵)

۳۔مسلح جہاد:(قتال فی سبیل اللہ)

مسلح جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے اور اُس وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری شکل ہے۔ اور اس کا دوسرا اور مخصوص نام ''قتال'' ہے۔

مسلح جہاد کی ضرورت پر مختصر طور پر دو آیات ربانی پیش کرتا ہوں۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔

(البقرہ۔۱۹۳)

"اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے "۔

یعنی جہاد کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے۔اور فتنے کی حالت ختم ہو جائے۔ ''فتنہ'' قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور سید مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ یہاں سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو۔ اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے۔ اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ''دین'' کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ''اطاعت'' کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اُس کے احکام و قوانین کی پیروی اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔ کہ سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے۔ فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۵۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ (الحج۔۴۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے '' ہمارا ربّ اللہ ہے '' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں ، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے ، سب مسمار کر ڈالی جائیں ۔ اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے ۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے "۔

یعنی یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اُس نے کسی ایک گروہ یا قوم کو دائمی اقتدار کا پٹہ لکھ کر نہیں دے دیا بلکہ وہ وقتاً فوقتاً دُنیا میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے دفع کرتا رہتا ہے۔ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو کہیں پٹہ مل گیا ہوتا تو قلعے اور قصر اور ایوان سیاست اور صنعت و تجارت کے مرکز ہی تباہ نہ کر دیئے جاتے بلکہ عبادت گاہیں تک

دست درازیوں سے نہ بچتیں۔ سورہ حج کی اس آیت سے اور زیادہ واضح ہو گیا کہ اگر دین کی خاطر تلوار نہ اُٹھائی جائے اور فتنے کی جڑ نہ کاٹ دی جائے تو خود دین کی جڑ کٹ جائے گی۔ اور فتنہ پسند عناصر خدا کا نام لینا دوبھر کر دیں گے اور خدا پرستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کردم لیں گے۔ اس لیے دین کی بقا اور ترقی کے لیے مسلح جہاد ایک ناگزیر ضرورت ہے (اسلام ایک نظر میں۔صدر الدین اصلاحی صفحہ ۳۴۴)۔سورۃ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ۔(البقرہ۔۲۵۱)

" آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور دائود نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا ، اس کو علم دیا ۔اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا ، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا ، لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)"۔

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۳۳)

<u>اب یہاں مختصر طور پر اُن رکاوٹوں کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے جنہیں دور کرنے کے لیے مسلح جہاد یا قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ جائزہ بتاتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اُصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔</u>

۱۔ ایک تو وہ جس کا تعلق اسلام لا چکنے والوں سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اسلام لا چکے ہیں۔ اُن کو اسلام لانے کے جرم میں ستایا جائے۔ اذیتیں اور تکلیفیں دی جائیں اور اُنہیں مجبور کیا جائے کہ اسلام سے باز آجائیں اور اس غرض سے اگر طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش آئے۔ تو اُس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔

۲۔ دوسری رکاوٹ وہ ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش ہی نہ کرنے دیا جائے۔ یا اُن کے اوپر ایسا اجتماعی نظام مسلط رکھا جائے۔ جس کے ہوتے ہوئے اُنہیں اسلام کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

سورہ انفال آیت نمبر۳۶ میں جن کافروں کے خلاف جنگ کرنے اور اُن کی جڑ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اُن کا ایک قصور اللہ کی راہ سے روکنا تھا۔ اس طرح سورہ انفال آیت نمبر ۴۱ اور سورہ توبہ آیت نمبر۹ اور نمبر۳۴ میں بھی کافروں، مشرکوں اور اہل کتاب کے خلاف جنگ کا حکم بھی من جملہ اور جرائم کے اللہ کے راستے سے روکنا تھا۔ ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ ''صد عن سبیل اللہ'' یعنی اللہ کی راہ سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جس کے خلاف جنگ ضروری ہے۔ اللہ کی راہ سے مراد وہی دین حق ہے جس کو قرآن میں صراط مستقیم بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کے انداز بیان کی انتہائی خوبی ہے کہ اس نے دین کو راستہ سے تعبیر فرمایا۔گویا وہ ایک طریق ہے جو سیدھا منزل تک لے جاتا ہے۔ اور جس پر شیطان اور اُس کے اولیا رہزنی کرتے ہیں۔ اس سیدھی راہ کی ضد کفر کی راہ قرار دی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سبیل اللہ سے روکنا دراصل اسلام سے روکنا ہے۔

اب غور کیجئے کہ اسلام سے روکنے کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کو جب راستہ کہا گیا تو اس کے روکنے کی بھی وہی صورت ہوگی۔ جو ایک رہگذر سے روکنے کی ہوتی ہے۔کسی راستہ کو روکنے کی قدرۃً تین صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

ایک یہ کہ جو لوگ دوسرے راستے پر چل رہے ہوں اُنہیں اس راستہ پر نہ آنے دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ جو اس راستے پر چل رہے ہیں اُنہیں اس سے زبردستی ہٹا دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ اس پر چلنے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھا دیئے جائیں، اُن کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور انہیں اس طرح دِق کیا جائے کہ وہ چلنے سے عاجز آجائیں۔

یہی تینوں مفہوم ''صد عن سبیل اللہ'' کے بھی ہیں۔ یعنی اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو روکنا، مسلمانوں کو زبردستی مرتد بنانے کی کوشش کرنا اور مسلمانوں کے لیے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کو مشکل بنا دینا۔ قرآن میں ان تینوں مفہومات کی مثالیں موجود ہیں۔ اور جو گروہ اس طرح اسلام کی راہ روکنے کی کوشش کرے اُس کو راستہ سے ہٹا دینا اور اُس کا زور توڑ دینا مسلمانوں کا اخلاقی حق بھی ہے اور دینی فرض بھی۔ (الجهاد فی الاسلام سید مودودی صفحہ٦٣تا٦٦)

اسلام الٰہی نظام حیات ہے۔اور دُنیا میں اس لیے آیا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی حکومت کا اعلان کرے اور تمام انسانوں کو ایک اِلٰہ

کی بندگی کی دعوت دے۔ اور اپنے اعلان اور دعوت کو عملی سانچے میں ڈھالے۔ اور پھر ایک ایسا معاشرہ تیار کرے جس میں انسان انسانوں کی بندگی سے آزاد ہوں اور بندگئی رب پر جمع ہوں۔اُن پر صرف شریعتِ الٰہی جو اللہ کے بالاتر قانون کی نمائندگی کرتی ہے، حکمران ہو۔ صرف اسلام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اُن تمام موانع کو زائل اور پاش پاش کردے جو روایات اور نظاموں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ جو اُس کے راستے میں حائل ہوں۔ اور جو انسان کی آزادئ انتخاب کو پابند سلاسل کرتے ہیں۔

(جادۂ و منزل۔ سید قطب مترجم خلیل حامدی صفحہ ۲۱۶ تا ۲۲۱۔

اسلام دنیا میں کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظام حیات کو نافذ رہنے کا حق دار تسلیم نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اقتدار صرف اس کے ہاتھ میں رہے اور جہاں بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے وہاں طاقت استعمال کی جائے۔ قرآن رسول کی بعثت کا مقصد اسلام کو دوسرے طریقۂ ہائے زندگی پر غالب کرنا بتاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ مشرکوں کو ناگوار ہو۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰي وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔

(توبہ۔۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یہ آیت قرآن کی تین سورتوں میں۔۔۔توبہ، صف اور الفتح میں تھوڑی سی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ۔۔۔آئی ہے۔

سارے دینوں پر غالب کرنے سے مراد نظریاتی غلبہ بھی تھا اور سیاسی غلبہ بھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے اس اعلان کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۔

(توبہ۔۳۶)

"اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں"۔

اور نبی نے اس قتال اور جہاد کو کبھی نہ ختم ہونے والی ضرورت اور ذمہ داری بتاتے ہوئے امت کو خبردار کر رکھا ہے کہ :

وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِي اللَّهُ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ ، لاَ يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ ، وَلاَ عَدْلُ عَادِلٍ۔

"جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے نہ لڑے۔ یہ جہاد کبھی نہ تو کسی ظالم امیر کے ظلم کی وجہ سے ساقط قرار پائے گا نہ کسی عادل آمیر کے عدل کی وجہ سے"۔

نبی اپنے آخری دور میں اور خلفائےراشدین نے اپنے زمانوں میں عرب سے باہر حکمرانوں کو جو دعوتِ اسلام دی اور اُن کے انکار پر جس طرح طاقت کے ذریعے انھیں اسلامی اقتدار کا تابع فرمان بنایا وہ اسی فرض کے تحت اور اسی مقصد کی خاطر تھا۔

(اسلام ایک نظر میں۔مولانا صدرالدین اصلاحی صفحہ ۳۴۸ تا ۳۵۰)

اسلام افراد پر حملہ نہیں کرتا۔ اور نہ اُن پر اپنا عقیدہ زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف حالات و نظریات سے تعرض کرتا ہے تاکہ افرادِ انسانی کو اُن فاسد اور زہریلے اثرات سے بچائے۔جنہوں نے اُن کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے۔ اور اُن کی آزادیٔ انتخاب کو پامال کر رکھا ہے۔رہا عقیدہ کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق آزادیٔ رائے سے ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسانی رائے کو متاثر کرنے کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں دور ہوں۔ اور ہمہ پہلو اسلام کا نظام غالب ہو جائے فرد کو ہر قسم کے عقیدہ اور نظریہ کے ردّ و قبول کی آزادی ہو اور وہ اپنی آزاد مرضی سے جو عقیدہ چاہے اختیار کر سکے(جادہ و منزل سید قطب شہید صفحہ نمبر۲۱۶ تا ۲۲۱)۔

اسلام کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے کیونکہ اسلام کا تعلق دل سے ہے اور دل جبر سے کسی کا معتقد نہیں ہوا کرتا۔قرآن مجید میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ اس کے بندوں میں کوئی گمراہ اور نافرمان نہ رہے تو وہ انہیں پیدا ہی مومن اور مسلم بنا کر کرتا یا پیدا کرنے کے بعدانہیں جبراً مسلم بنا دیتا۔

لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (الرعد۔۳۱)

"اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا"۔

چنانچہ اس کا صاف اعلان ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔(البقرہ۔۲۵۶) یہ اعلان صاف بتاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کسی حال میں نہ کیا جائے گا نہ پیدائشی طور پر نہ خارجی اور سیاسی طور پر۔اس معاملے میں ہر انسان کے لیے آزادی ہے چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے۔

(اسلام ایک نظر میں از مولانا صدرالدین اصلاحی صفحہ ۳۵۰ تا ۳۵۱)

قرآن کریم نے جہاد کا مقصد ظلم و تعدی، ناانصافی، فتنہ و فساد، قتل و غارت گری اور بدامنی کو دُور کرنا قرار دیا ہے کیونکہ قرآن کی نگاہ میں فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہے (فتنہ کی تعریف ہم پہلے کر چکے ہیں) جب تک کسی معاشرے سے ظلم و ناانصافی دُور نہ ہو وہاں عدل کا قیام نہیں ہو سکتا۔ جہاد فی الحقیقت معاشرتی، معاشی اور سیاسی عدل کے قیام کا ذریعہ ہے۔ جیسے ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ کہ جہاں ضرورت ہو یہ جہادقلم سے ہوگا۔ جہاں ضرورت پیش آئے اسلحے سے ہوگا۔ کہیں اس جہاد کا اسلحہ تعلیم و تربیت ہونگے۔ کہیں جدید ترین عسکری ایجادات۔ گویا جہاد محض عسکری جدوجہد کا نام نہیں بلکہ اُس مجموعی اور اجتماعی عمل کا نام ہے جو معاشرے کی اصلاح اور بقائے حیات کے لیے فاسد مادوں کو دُور کرکے فضا کو صحت مند، سازگار، اور عمل و امن کا مرکز بنادے۔

قرآن کا تصور جہاد ایک اصلاحی عمل ہے۔ جو ظلم و غارت، اور استحصال کو ختم کرنے اور امن، سلامتی، عدل و انصاف کے قیام کے لیے ہاتھ، زبان اور دل و دماغ کے استعمال کو اور اپنی جان اور اپنے مال کو بازی پر لگا دینے کو ایک انسانی فریضہ قرار دیتا ہے۔ یہ قرآن حقوق انسانی کی بحالی اور محکوم اقوام کو آزادی دلانے کے لیے قوت کے استعمال کو ایک اخلاقی فریضہ قرار دیتا ہے۔ اور بغیر کسی معذرت کے اس کی عظمت کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں وہ لوگ جو سجود و رکوع کرنے کے مقامات پر مصروف عبادت رہتے ہیں اور وہ جو میدانِ کارزار میں اپنے مال اور جان کی بازی لگاتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے۔وہ جہاد کرنے والوں کے عمل کے لیے ''اعظم درجہ'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اگر معروضی طور پر غور کیا جائے۔ تو قرآن کریم کا جہاد کے بارے میں غیر معذرت پسندانہ، شفاف، عقلی اور مصلحانہ تصور ہی انسانیت کو فلاح، امن، تحفظ، نجات، عدل و انصاف اور حقوق انسانی کے احترام سے روشناس کرا سکتا ہے۔

جہاد وہ ضمانت فراہم کرتا ہے جس کی بنا پر فتنہ و فساد، طاغوت اور فکر و فریب لرزہ براندام رہتا ہے اور انسانیت جھوٹ اور دھوکے سے نجات حاصل کرکے عافیت اور ترقی پذیری کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

(ترجمان القرآن لاہور فروری ۲۰۰٦ مضمون ''مغرب کا اندیشۂ جہاد اور جہاد'' از ڈاکٹر انیس احمد صفحہ ٦۵)

جہاد کے فضائل:

قرآن مجید اور احادیث کے صفحات اس عمل کی عظمت کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جہاد کرنے والوں کو ''اپنا مددگار'' قرار دیتا ہے۔اور نہ صرف مددگار بلکہ اپنا محبوب کہتا ہے ۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ
(سورہ صف۔۴)
یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (اسلام ایک نظر میں۔ مولانا صدر الدین اصلاحی صفحہ۔۳۶۷)
اس محبوبیت کی تھوڑی سے وضاحت بنی کی زبان سے سنیئے۔
''قال رسول اللہ لغدوۃ فی سبیل اللہ او روحۃ خیر من الدنیا و ما فیھا۔
(بخاری۔ مسلم۔ ترمذی)
"رسول اللہ نے فرمایا '' اللہ کی راہ میں گزرنے والی ایک صبح یا ایک شام دُنیاوما فیھا سے بہتر ہے"۔
(جہاد اسلامی خلیل احمدحامدی۔صفحہ۔۲۲)
مزید ''ایک شب و روز کی سرحدوں کی نگرانی ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔
(مسلم)

ایک اور حدیث ہے:

''راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شخص اُس وقت تک جب کہ یہ مجاہد اپنے جہاد سے واپس نہ آ جائے۔ مسلسل روزے رکھتا اور نمازیں ادا کرتا اور اُن میں قرآن پڑھتا رہے اور نہ تو اس روزے میں اُسے کوئی سستی لاحق ہو نہ اس نماز میں (مسلم و بخاری بحوالہ مشکوٰۃ)
صرف یہی نہیں کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑنا۔ اُس کی محبت، مغفرت اور رحمت کا حق دار بناتا ہے بلکہ اُس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی بڑا اونچا مقام پا لیتے ہیں جو لڑنے والوں کو صرف بالواسطہ مدد کرتے ہیں۔اور جہاد کی تیاریوں میں اُن کا ہاتھ بٹا تے ہیں۔
رسول اللہ کا ارشاد ہے۔
''جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والےکسی شخص کو جہاد کا سروسامان مہیا کر دیا۔ اُس نے (گویا) خود جہاد کیا اور جس نے کسی مجاہد کے اہل و عیال کی، اُس کی عدم موجودگی میں دیکھ بھال کی وہ (گویا) خود شریک جہاد رہا۔ (مسلم و بخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

''اللہ تعالیٰ صرف ایک تیر کے طفیل تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے۔ ایک وہ شخص جو ثواب کی نیت سے یہ تیر بناتا ہے ۔دوسرا وہ جو اُسے دشمن پر چلاتا ہے اور تیسرا وہ جو یہ تیر اُسے مہیا کرتا ہے۔

(ابوداؤد)

جس جہاد کی خاطر ہتھیار بنانے اور مہیا کرنے والے تک کو اتنی بڑی دولت میسر آتی ہو۔ وہ اللہ اُس شخص کو کیا کچھ نہ عطا کرتا ہوگا جو اس جہاد کے لیے صرف اُسی کے لیے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہو۔ میدان جنگ میں پہنچ کر لڑا ہو۔ زخمی ہوا ہو، خون میں نہایا ہو، یہاں تک کہ اُس نے اپنی جان اپنے مالک کے سپرد کر دی ہو۔ ایسے شخص کی خوش نصیبی کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لگائیے۔

جہاد کے بارے میں مشہور محدث عبداللہ ابن مبارک کے اشعار:

عبداللہ بن مبارکؒ امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے اور بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ ۱۷۰ ہجری یا ۱۷۷ ہجری میں وہ جہاد میں مصروف تھے۔ اس وقت ایک دوسرے بزرگ جناب فضیل بن عیاض مسجدِ حرام میں مصروفِ عبادت تھے۔ عبداللہ بن مبارک نے اپنے شاگرد محمد بن ابراہیم کو طرسوس سے فضیل بن عیاض کے نام ایک خط دے کر بھیجا تھا اس خط کا ایک شعر یہ ہے۔

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا
لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

اے حرمین میں عبادت کرنے والے اگر تم نے ہمیں دیکھا ہوتا۔۔۔تو جان لیتا کہ جہاد کے وقت تمہاری یہ عبادت ایک کھیل ہے۔

اس کے بعد فضیلت جہاد کے بارے میں چھ اشعار اور بھی ہیں۔فضیل بن عیاض نے جب یہ پیغام پڑھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے اور کہنے لگے کہ ابو عبداللہ نے سچ کہا ہے اور مجھے نصیحت کی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر آیت نمبر ۲۰۰ آل عمران جلد نمبر۲ صفحہ ۱۹۳ بحوالہ تفہیم المسائل حصہ اول مولانا گوہر رحمان صفحہ ۲۶)

شہید کا مقام:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ.

(ال عمران۔۱۶۹ تا ۱۷۱)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مردہ نہ سمجھو ، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں ، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں،جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے اُنہیں دیا ہے اُس پر خوش و خرم ہیں، اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اُس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور اُن کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا"۔

قرآن کریم کا یہ خصوصی اعلان بتاتا ہے کہ اس عمل کو اللہ کی نگاہ میں کتنی محبوبیت حاصل ہے۔ وہ کوئی عام قسم کی محبوبیت نہیں ہے بلکہ ایک امتیازی شان رکھنے والی محبوبیت ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی مندرجہ ذیل حدیث سے اس امتیازی شانِ محبوبیت کی بہت کچھ وضاحت ہو جاتی ہے۔

مَا أَحَدٌ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَلَهُ مَا عَلَى الأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلاَّ الشَّهِيدُ يَتَمَنَّى أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا يَرَى مِنَ الْكَرَامَةِ.

(مسلم و بخاری، بحوالہ ریاض الصالحین)۔

"کوئی شخص بھی جو جنت میں داخل ہوگا، اس دنیا کی طرف پلٹنا نہ چاہے گا، خواہ اس زمین کی ایک ایک چیز اسی کی ملکیت کیوں نہ ہو۔مگر شہید کا حال یہ نہ ہوگا۔ شہید اپنی اس عزت کو دیکھ کرجو اسے خدا کے حضور عطا ہوگی، تمنا کرے گا کہ کاش وہ دنیا میں دس بار واپس آجائے، اور دس بار راہِ خدا میں قتل کیا جائے"۔

یہ تو آخرت کا معاملہ رہا۔ خود اس دُنیا میں بھی راہِ خدا کے یہ شہید ایک امتیازی شان کے مالک ہوتے ہیں۔ ہر مرنے والے کو غسل دیا جاتا ہے اور جسم کے کپڑے اتارکر صاف ستھرا کفن پہنایا جاتا ہے۔ لیکن شہداء کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اُنہیں نہ تو غسل دیا جائے، نہ دوسرا کفن دیا جائے بلکہ اُن کے اوپر کے اپنی خون آلود کپڑوں میں، جن میں وہ قتل ہوئے ہوں، دفن کر دیا جائے۔

أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- بِقَتْلَى أُحُدٍ أَنْ يُنْزَعَ عَنْهُمُ الْحَدِيدُ وَالْجُلُودُ وَأَنْ يُدْفَنُوا بِدِمَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ۔
(ابوداؤد)

اُحد کے شہیدوں کے بارے میں آنحضرت نے حکم دیا کہ ان کے جسموں پر سے ہتھیار اور زرہیں اُتار لی جائیں، اور پھر انھیں ان کے خون اور ان کے کپڑوں سمیت (جوں کا توں) دفن کر دیا جائے۔

شہید کا خون وہ خون نہیں ہوتا جسے فقہ کی زبان میں ناپاک خون کہتے ہیں۔ بلکہ وہ خون ہوتا ہے جس سے زیادہ پاکیزہ چیز شاید کوئی اور ہوتی ہی نہیں۔ اللہ کے نزدیک وہ زعفران جیسا خوش رنگ اور مشک جیسا ہوتا ہے:

لَوْنُهَا لَوْنُ الزَّعْفَرَانِ وَرِيحُهَا رِيحُ الْمِسْكِ۔ (ترمذی، ابوداؤد بحوالہ مشکواۃ)

جہاد سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑی عبادت ہے:

چنانچہ جب نبی سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول سب سے افضل جہاد کونسا ہے (اَیُّ الجھاد افضل) تو آپؐ نے فرمایا:

من جاہد المشرکین بمالہ و نفسہ (ابوداؤد بحوالہ مشکواۃ)

"سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ آدمی مشرکوں سے اپنے مال اور اپنی جان کے ذریعے جہاد کرے"۔

اس طرح جب یہ دریافت کیا گیا کہ سب سے افضل شخص کون ہے (ایَّ الناس افضل) تو ارشاد ہوا:

مومن یجاھد بنفسہ و مالہ فی سبیل اللہ۔ (بخاری و مسلم)

"سب سے افضل مومن وہ ہوتا ہے جو اپنی جان اور اپنے مال سے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے "۔

(اسلام ایک نظر میں صفحہ ۳۷۰ تا ۳۷۲)

جو عمل سب سے اونچا ہو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اجر بھی سب سے اونچا نہ ہو:

دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہ چھوئے گی ایک وہ جو اللہ کے خوف سے رو پڑی ہو اور دوسرہ وہ جو جس نے اللہ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گزاری ہو (ترمذی)

عَيْنَانِ لاَ تَمَسُّهُمَا النَّارُ عَيْنٌ بَكَتْ فِي جَوْفِ لَيْلٍ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ سَرِيَّةً فِي سَبِيلِ اللهِ۔
(ترمذی)

"جس نے اللہ کی راہ میں اتنی دیر بھی جنگ کی جتنی دیر کہ اونٹنی دوہنے میں دو دھاروں کے درمیان ہو اکرتی ہے اس کے لیے جنت کا ملنا ضروری ہوگیا"۔

''جہاد فی سبیل اللہ کی گرد اور جہنم کا دھواں، یہ دونوں چیزیں کسی شخص کے اوپر اکٹھی نہیں ہو سکتیں'' جہاد کے فضائل اتنے زیادہ ہیں کہ اس کے لیے پوری ایک کتاب چاہئے۔ عام قاری کے لیے اس سلسلے میں جناب خلیل حامدی کی کتاب '' جہاد اسلامی'' کا مطالعہ مفید رہے گا اُنہوں نے ترتیب کے ساتھ احادیث کا انتخاب کیا ہے۔

جہاد ایمان و اسلام کی کسوٹی ہے:

راہ خدا میں لڑنے کا جذبہ اور عزم و ارادہ رکھنا ایمان کی ایک کبھی نہ الگ ہونے والی صفت ہے۔ سورہ توبہ کی آیات ۴۴، ۴۵ میں جن لوگوں نے نبی ﷺ سے حیلے بہانے کرکے رخصتیں مانگنی شروع کیں تو فرما دیا گیا کہ ''تم سے ایسی درخواست تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر یقین نہیں رکھتے''۔ ان آیات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر بھی مسلح جہاد (قتال) سے کترا جانا ایمان کے قطعی منافی ہے۔ نبی ﷺ کے یہ الفاظ ایمان اور قتال کے فطری تعلق کو پوری طرح بے نقاب کر دیتے ہیں:

من مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من نفاق۔
(مسلم بحوالہ مشکواۃ)

"جو شخص اس حال میں مرا ہو کہ اُس نے نہ تو دین کی خاطر جنگ کی ہو نہ اپنے دل میں اس جنگ کا خیال لایا ہو وہ کسی نہ کسی حد تک نفاق کی حالت میں مرا"۔ (اسلام ایک نظر میں۔ صفحہ ۳۷۸، ۳۷۹)

ترک جہاد کے نقصانات:

پستی اور زوال:

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِــيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَـيْــــًٔـا وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ
(التوبہ۔۳۹)

"تم نہ اُٹھو گے تو خدا تمہیں درد ناک سزا دے گا ، اور تمہیں جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا ، اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

ابتلائے عظیم کا تسلط:

عن ابن عمر قال: سمعت رسول الله - صلى الله عليه وسلم – يقول اذاضن الناس بالدينار والدرهم، وتبايعوا بالعِين واتَّبعوا أذناب البقر، وتركوا الجهاد في سبيل الله، أنزل الله بهم بلاءً فلم يرفعه عنهم حتى يراجعوا دينَهم۔ (مسند احمد، ابوداؤد)

"ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ سے سُنا کہ آپؐ نے فرمایا: جب لوگ درہم و دینار کے حریص ہو جائیں اور جنس بازار میں آنے سے پہلے ہی اس پر بیع کرنے لگیں، اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لیں (کھیتی باڑی میں منہمک ہو گئے) اور جہاد کو چھوڑ دیں تو اللہ اُن پر سخت آزمائش مسلط کرے گا۔اور وہ اُس سے اُس وقت تک نہ نکل سکیں گے جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ کر آئیں گے۔ (اور جہاد کو قائم نہ کریں گے)"۔

سامراجی قوتوں کا استیلاء:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لِثَوْبَانَ : كَيْفَ أَنْتَ يَا ثَوْبَانُ ، إِذْ تَدَاعَتْ عَلَيْكُمُ الأُمَمُ كَتَدَاعِيكُمْ عَلَى قَصْعَةِ الطَّعَامِ تُصِيبُونَ مِنْهُ ؟ قَالَ ثَوْبَانُ : بِأَبِي وَأُمِّي يَا رَسُولَ اللهِ ، أَمِنْ قِلَّةٍ بِنَا ؟ قَالَ : لاَ ، بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ ، وَلَكِنْ يُلْقَى فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهَنُ قَالُوا : وَمَا الْوَهَنُ ؟ يَا رَسُولَ اللهِ ؟ قَالَ : حُبُّكُمُ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَتُكُمُ الْقِتَالَ. (مسند احمد، ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے سُنا کہ آپؐ نے حضرت ثوبانؓ(آنجناب کے آزادکردہ غلام) سے فرمایا: اے ثوبان! تمہاری کیا حالت ہوگی اگر تم پر دوسری قومیں اس طرح ٹوٹ پڑیں جس طرح تم کھانے کے برتن پر لقمے لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہو؟ثوبان نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں اے اللہ کے رسولؐ، کیا ہماری یہ حالت قلتِ تعداد کی وجہ سے ہوگی؟ حضورؐ نے فرمایا: یہ بات نہیں بلکہ تعداد میں تو تم زیادہ ہو لیکن تمہارے دلوں کے اندر کمزوری، بزدلی پڑ جائے گی دوسرے صحابہ نے دریافت فرمایا: یا رسول اللہ! ''کمزوری'' سے کیا مراد ہے؟ سرکار دو عالم

نے فرمایا: تمہارا دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جانا اور لڑائی سے جی چُرانا یہ ہے کمزوری"۔

باب سوم

عزیمت کے ذرائع

قرآن

قرآنِ کریم پر ایمان کے بارے میں چند بنیادی باتیں:

اـقرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت محمد □ پر نازل کردہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔

ارشاد ہے:
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا۔
(النساء۱۰۵)

"اے نبی ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو"۔

۲۔یہ ہر لحاظ سے محفوظ کلام ہے۔قرآن جن الفاظ میں اُترا تھا۔ ٹھیک ٹھیک اُنہی الفاظ میں موجود ہے۔ اس کے ایک حرف بلکہ ایک شوشہ میں بھی تغیر نہیں ہوا۔ اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اُٹھائی ہے۔
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔
(الحجر۔۹)

"رہا یہ ذکر ، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں"۔

۳۔پچھلی کتابوں میں لوگوں نے اپنی طرف سے اپنی خواہشات کے مطابق تحریف کی ہے۔اور اب اُن کی کتابوں میں کلام الٰہی کے ساتھ قومی تاریخ، بزرگوں کے حالات، اپنے من مانے قصے اور کہانیاں، اُن کے اپنے نکالے ہوئے شرعی مسئلے ایسے گڈ مڈ کر دئیے گئے ہیں۔ کہ کلام الٰہی کو اُن میں سے چھانٹ لینا ممکن نہیں ہے۔ مگر قرآن خالص کلام الٰہی ہے۔ اور اس کے اندر کسی دوسرے کے کلام کی ذرہ بھر بھی آمیزش نہیں ہے۔

۴۔قرآن سے پہلے کی تمام آسمانی کتب کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کے لیے ہدایت بن کر آئی تھیں۔ کیونکہ وہ جن پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں۔ وہ بھی کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ لیکن قرآن عالمگیر کتاب ہے۔ کیونکہ ایک توبہ اللہ تعالیٰ کے جس رسول پر نازل ہوا۔ وہ سارے جہاں کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ (سورۂ اعراف ۔۱۵۸) اور دوسرے اس کا عالمگیر ہوناخود قرآن سے ثابت ہے:
اِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ۔ (ص:87) " یہ قرآن سارے جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے"۔

۵۔قرآنِ کریم تضادات سے پاک کلام ہے۔ اس کے مضامین ایک دوسرے سے باہم مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ قرآن حکیم کے مضامین،

احکام، مقاصد اور حکم میں کہیں بھی تعارض و تناقص محسوس نہیں ہوتا۔اگریہ خدا کے سوا کسی اور فرد یا جماعت کا کلام ہوتا تو لازماً اس کی عبادات، اسالیب، الفاظ اور اس کے معانی و مضامین میں باہم تفاوت و اختلاف ہوتا۔کیونکہ انسانی عقل چاہے جتنی ہی پختہ کار کیوں نہ ہو۔ناممکن ہے کہ وہ ۲۳ سال کے طویل عرصہ میں چھ ہزار آیات پر مشتمل کلام کرے اور پھر بھی اس کے الفاظ و عبارات، اسالیب اور مضامین کوئی اختلاف نہ پایا جائے۔

۶۔انسانیت کے لیے تا قیامت ہدایت ہے۔ اور یہ ایک مکمل ہدایت نامہ ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس لیے اس کو ھدی للناس کہا گیا ہے۔ اور یہ سر تا سر حق اور خیر ہے۔اول سے آخر تک سارا قرآن اعلیٰ درجہ کی حکمت، دانائی اور عدل و انصاف کی تعلیم اور راہ راست کی ہدایت اور بہترین احکام اور قوانین سے بھرا ہوا ہے۔

۷۔اللہ تعالیٰ کا یہ ہر معجزہ کلام عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ جو ایک زندہ زبان ہے۔اور دُنیا میں کروڑوں لوگ آج بھی اسے بولتے ہیں۔ اور جانتے اور سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید ایک فصیح و بلیغ کلام ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ کی فصاحت، اس کے معانی کی بلاغت اور اس کا انداز بیان سب معجزہ ہیں۔

۸۔اور یہ دوسری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اُن پر ''مُھیمن بھی ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (المائدہ۔۴۸)

پھر اے نبی ، ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور اُس کی محافظ و نگہبان ہے لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔ اگرچہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا ، لیکن "اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو ۔ آخر

کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے ، پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو "۔
قرآن کو ''الکتاب'' کا محافظ و مہیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں۔ اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔
پچھلی کتابوں پر ایمان صرف تصدیق کی حد تک ہے یعنی وہ سب خدا کی طرف سے تھیں اور سچی تھیں۔ اور اسی غرض کے لیے آئی تھیں جس کو پورا کرنے کیلیے قرآن آیا ہے۔۔ اور قرآن پر ایمان اس حیثیت سے ہے کہ یہ خدا کا خالص کلام ہے۔ سراسر حق ہے۔ اس کا ہر لفظ محفوظ ہے۔ اس کی ہر بات سچی ہے، اس کے ہر حکم کی پیروی فرض ہے۔ اور پیروی صرف اسی کتاب کی ہوگی اور ہر وہ بات ردّ کر دینے کے قابل ہے جو قرآن کے خلاف ہو۔ (دینیات۔مولانا مودودی صفحہ ۱۰۴)
مختصر یہ کہ یہ بےمثل اور بے نظیر کتاب ہے اور الٰہی معجزہ ہے۔ کتاب ہدایت اور کتاب فرقان ہے۔ حکمت سے لبریز، حق کی طرف رہنمائی کرنے والی، غفلت سے چونکانے والی، نصیحت بھری، بڑی بابرکت کتاب ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔
(مبادیات اُصولِ فقہ صفحہ۸۸)

اسماء قرآن:

کسی کتاب کا تعارف اُس کے نام سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے مختلف نام قرآن مجید میں بیان کیے ہیں۔
قرآن مجید کے جتنے بھی اسماء قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسماء قرآن کی مختلف صفات کی توضیح کر رہے ہیں۔ مثلاً قرآن کی یہ صفت ہے کہ وہ راہ ہدایت ہے تو قرآن کو ''ھدیٰ'' کہا اور فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ) قرآن کی ایک صفت کہ یہ نصیحت ہے لوگوں کے لیے تو قرآن کو ''ذکر''کہا اور فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔۹)
قرآن کی ایک اور صفت ہے کہ یہ حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کتاب ہے تو قرآن کو فرقان کہا اور فرمایا :

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا
(الفرقان۔۱)
قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے اور یہ بھی اُس کی صفت ہے۔ اسی لیے قرآن کو تنزیل کہا اور فرمایا :
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ
(الزمر۔۱)
غرض قرآن کے جتنے بھی اسماء ہیں تمام قرآن کی مختلف صفات کو بیان کر رہے ہیں۔
(ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۶ مضمون اسماء القرآن از ہدایت اللہ خان صفحہ۔۳۱)
قرآن کے کل کتنے اسماء ہیں۔ اس بارے میں علما کے مختلف اقوال ذکر ہوئے ہیں۔ کسی نے قرآن کے ۵۵ اسماء ذکر کیے ہیں۔ تو کسی نے ۸۸ اور کسی نے ۹۰ شمار کیے ہیں۔ مگر اس حوالے سے اکثر علماء کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ قرآن کے اصل نام صرف ۵ ہیں۔القرآن، الفرقان، الذکر، الکتاب، اور التنزیل۔ خود قرآن کریم نے اپنے لیے یہ پانچوں الفاظ اسم علم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں سب سے پہلے ان اسمائے خمسہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور اُن کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

القرآن:

قرآن کے تمام ناموں میں بالعموم اور ان مذکورہ پانچ ناموں میں بالخصوص سب سے زیادہ مشہور نام ''القرآن'' ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی ۳۶ سورتوں کی ۶۵ آیات میں ہوا ہے۔ مثلاً:
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (البقرہ۔۱۸۵)
"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے ، اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے ۔اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ

نرمی کرنا چاہتا ہے ، سختی کرنا نہیں چاہتا ۔اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سر فراز کیا ہے ، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو"۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا۔

(بنی اسرائیل-۹)

"حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے ۔ جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے بڑا اجر ہے "۔

قرُآن کو قرآن کیوں کہتے ہیں۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں (ا) جمع کرنا اور (۲) پڑھنا۔

اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔جو اس کا معنی جمع کرنا اور جوڑنا لیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک (مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ سدّوسی (م:۱۱۷ھ) اس کی دلیل یہ ہے۔کہ چونکہ قرآن کی سورتیں اور آیات جمع ہیں اور آپس میں مربوط و یک جاہیں اور اس سے قبل، یعنی نزول سے پہلے لوحِ محفوظ میں بھی وہ یک جا اور جمع تھیں لہذا اس بنا پر قرآن کو ''جمع'' کہا جائے گا۔

<u>قرآن بمعنی پڑھنا:</u>

قرآن کے دوسرے معنی ''پڑھنے'' کے ہیں۔ اور اس بارے میں بھی اہل علم کے مختلف اقوال آئے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے قول کے مطابق اس کے معنی ہیں''پڑھنا''۔خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن ''پڑھنے'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۔

(بنی اسرائیل-۷۸)

"نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کررات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو ! کیونکہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے۔ (یعنی فجر میں پڑھا جانے والے قرآن کی فرشتوں کی طرف سے گواہی دی جاتی ہے)"۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَه ٗفَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔

(قیامہ-۱۷،۱۸)

اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذِمّہ ہےلہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اِس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو یہاں دونوں آیات میں قرآن قرأت یعنی پڑھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَه۔(قیامہ۔۱۷) "اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذِمّہ ہے"۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

الفرقان:

فرقان کا مادہ یا اصل ''ف۔ر۔ق'' ہے اور اس کا معنٰی ہے ''دو چیزوں کے درمیان تمیز، فرق اور جدائی کرنا اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنا۔''جب یہ معنی کلام اللہ کے ساتھ خاص ہونگے تو معنیٰ ہوگا۔ حلال و حرام، سچ اور جھوٹ، حق و باطل، معروف و منکر، نیکی و بدی، نفع و نقصان کے درمیان فرق، یعنی امتیاز اور جدائی کرنا۔قرآن کا مقصد نزول بھی صرف یہی تھا کہ انسان ان دونوں راستوں کو پہچان جائے۔ اور ان میں واضح فرق کو محسوس کرتے ہوئے اچھی باتوں کو اختیار کرے اور بُرے کاموں سے خود کو روکے۔ اس طرح قرآن کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی ہے (مولانا مودودی تفہیم القرآن جلداول صفحہ233) اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ''فرقان'' رکھا۔ امام بدر الدین الزرکشی فرقان کے معنی کے تحت فرماتے ہیں کہ قرآن کا نام فرقان اس لیے رکھا گیا کہ یہ حق و باطل، مسلمان و کافر، مومن و منافق کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرؓ بن خطاب کو '' فاروق'' کہا جاتا ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان واضح فرق فرماتے تھے۔

الکتاب :

اسمائے خمسہ میں سے تیسرا نام ''الکتاب'' ہے جسے عام طور پر کتاب ہی کہتے ہیں۔اس لفظ کا اصل یا مادّہ ''ک۔ت۔ب'' یعنی كَتَبَ ہے۔ اکثر کلام اللہ کو صرف دو ناموں سے موسوم کہا جاتا ہے یا تو کہنے والا قرآن کہتا ہے یا کتاب:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (البقرہ۔۲)

"یہ اللہ کی کتاب ہے ، اس میں کوئی شک نہیں ۔ ہدایت ہے اُن پرہیز گارلوگوں کے لیے"۔

قرآن نزول سے قبل لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا تھا۔ اور نزول کے بعد حضورؐ نے اپنی نگرانی میں کاتبان وحی سے لکھوایا تھا۔ اسی وجہ

سے اسے ''کتاب'' کا نام دیا گیا۔ یعنی وہ کلام الٰہی جو لکھنے اور پڑھنے کے لیے نازل ہوا۔

کتاب بمعنی جمع کرنا:

کتاب کے دوسرے معنی جمع کرنا کے بھی آتے ہیں۔ کیونکہ کتب کے معنی میں جمع کرنا بھی ہیں۔ اور اس سے لشکر کا نام ''کتیبہ'' موسوم ہوا ہے۔ مولانا گوہر رحمٰن نےعلامہ سیوطیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں اُنہوں نے فرمایا ہے کہ قرآن کو کتاب کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مختلف قسم کے علوم، قصص اور اخبار کو مؤثر ترین طرز پر جمع کیا گیا ہے اور کتاب لغت میں جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ (علوم القرآن جلد نمبر ۱

صفحہ ۵۰)

کتاب بمعنی فرض و وجوب اور حکم و فیصلہ:

کتاب کا لفظ کبھی فرض و وجوب اور حکم و فیصلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً **کتب علیکم الصیام** (تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں) **کتب علیکم القتال** (تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے) ان تمام مثالوں میں **کتب** کا مطلب فرض کیا گیا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مختلف مقامات پر ''کتاب'' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ ان تمام معنوں پر غور کرتے ہوئے کتاب کا جامع معنی ہوگا۔ کہ یہ ''اللہ کا حکم اور قانون ہے اور اس کے احکام و فرائض کا مجموعہ ہے''۔

الذکر:

اسمائے خمسہ میں سے چوتھا نام الذکر ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ خود قرآن کو ''ذکر'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ذکر کا اصل مادہ ذکر ہے۔ اس کے معنی کے بارے میں مختلف اقوال آتے ہیں۔ عام طور پر اس کے تین معانی بیان کیے جاتے ہیں۔ (۱) یاد دہانی (۲) تذکرۂ اُمتِ سابقہ و موجودہ (۳) شرف و عزت۔

ذکر بمعنی یاددہانی:

قرآن کو اس معنی میں ذکر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کے لیے نصیحت اور رہنمائی ہے۔ آئمہ لغت (ابن درید ازدیؒ، علامہ جوہری، علامہ ابن منظور افریقی) نے لکھا ہے کہ ذکر، ذکریٰ اور ذکرہ، نسیان کی ضد ہے۔ علامہ زرکشی اور سیوطی نے ذکر کے معنی نصیحت بیان کیے ہیں۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے اور اُن کو آخرت کی فکر اپنے دلوں میں اُجاگر کرنے کے لیے نصیحت یعنی یاددہانی ہے:

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ-(سورہ ص-۱) "صٓ ، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی"۔

ذکر بمعنی تذکرہ اُمتِ سابقہ و موجودہ:

ذکر کے معنی اس حوالے سے کہ یہ تذکرہ ہے اُمتِ سابقہ کا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اُمتِ سابقہ، کتب سابقہ اور انبیائے سابقین کے حالات و واقعات اور ان کے احکام کی مکمل یادداشت ہے۔ قرآن میں ان کے وہ تذکرے بھی شامل ہیں۔ جن کو اُنہوں نے تبدیل کر دیا تھا۔ قرآن میں ان کی وہ تعلیمات موجود ہیں۔ جن کو انہوں نے اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے اپنی کتابوں سے نکال دیا تھا۔ ذکر کو ''مہیمن'' کے معنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مہیمن کا مطلب ہے نگران اور محافظ۔ نگران اور محافظ اس لیے کہا گیا کہ قرآن میں سابقہ اُمتوں کے حال محفوظ ہیں۔ اس لفظ کے ضمن میں ہم گذشتہ صفحات میں مولانا مودودی کی تشریح پہلے لکھ چکے ہیں۔

ذکر بمعنی شرف و عزت:

ذکر کے معنی کبھی مدح و تعریف، شہرت و عظمت اور شرف کے بھی آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن مدح و تعریف کے لائق ہے۔ شہرت کا حامل ہے۔ اور عظمت و شرف والا ہے۔ قرآن خود بھی شہرت والا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو، قرآن سے تعلق رکھنے والوں کو بھی شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ زخرف میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ۔ (زخرف-۴۴)

"حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے"۔

اس آیت میں ذکر کے معنی شرف یعنی عزت کے بیان کیے ہیں۔کہ یہ قرآن بڑی عزت والی کتاب ہے اور اسی وجہ سے تمہاری عزت ہے کہ قرآن تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اور اس لیے تمام اُمتوں پر فضیلت بھی دی گئی۔ مولانا مودودی اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ ''یعنی اس سے بڑھ کر کسی شخص کی کوئی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ تمام انسانوں سے اُس کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے منتخب کرے، اور کسی قوم کے حق میں بھی اس سے بڑی کس خوش قسمتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ دُنیا کی دوسری سب قوموں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اُس کے ہاں اپنا نبی پیدا کرے اور اُس کی زبان میں اپنی کتاب نازل کرے اور اُسے دُنیا میں پیغام خداوندی کی حامل بن کر اُٹھنے کا موقع دے۔ اس شرفِ عظیم کا احساس اگر قریش اور اہل

عرب کو نہیں ہے تو ایک وقت آئے گا جب اُنہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ540)
حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ''یہ کتاب شرف و عزت والی بھی ہے۔ اور نصیحت و یاددہانی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ ''الذکر'' کا لفظ نصیحت، یاد دہانی اور یاد داشت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔مولانا مودودیؒ سورہ الانبیاء کی آیت نمبر 10کی تشریح میں مزید فرماتے ہیں:
''تمہارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمہاری ہی نفسیات اور تمہارے ہی معاملات زندگی زیر بحث ہیں۔ تمہاری ہی فطرت و ساخت اور آغاز اور انجام پر گفتگو ہے۔ تمہارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چُن چُن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔اور تمہارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل و تبائح کا فرق نمایاں کرکے دکھایا جا رہا ہے۔ جس کے صحیح ہونے پر تمہارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمہاری عقل عاجز ہو۔
(تفہیم القرآن جلد سوم،ص:150)

التنزیل:

اسمائے خمسہ میں سے پانچواں اور آخری نام التنزیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر قرآن کو تنزیل کہا ہے
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (السجدہ۔۲)
"اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۔ (الزمر۔۱)
"اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (المومن۔۲)
"اِس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے"۔
اس نام کی وجہ تسمیہ تو اس کے معنی سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ نہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی ملک یا علاقے کا دستور ہے بلکہ یہ تو رب العالمین کا نازل کردہ قانون ہے۔ کہ جس میں انسانیت کی بھلائی کا سامان جمع ہے۔ تنزیل کا مطلب ہے ''نازل کردہ کتاب'' اور اس معنی سے بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔ دُنیا کی کتابوں اور نازل کردہ کتاب میں وہی فرق ہے۔ کہ جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ:

''اللہ کے کلام کی فضیلت دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہے جیسا خود اللہ تعالیٰ کی برتری اُس کی مخلوق پر ہے''۔
(ترجمان القرآن اکتوبر ۲۰۰۶ مضمون اسماء القرآن صفحہ ۳۱ تا ۴۱)

قرآن کی تلاوت:

قرآن کی تلاوت کی سب سے بالاتر اہمیت پر سبھی کا ایمان ہے۔ اور جو صرف کسی ایک خصوصی اہمیت کا نہیں بلکہ ہمہ جہتی اہمیتوں کا حامل ہے۔ کیونکہ حق اور ہدایت کا اصل سرچشمہ وہی ہے۔ اسی لیے یہ مقام اس کتاب کو حاصل ہے کہ علم و معرفت اور رشد و ہدایت کے معاملے میں وہ سب سے آگے رہے۔ اور دوسرے دینی مراجع اس کے تابع رہیں۔ جہاں یہ ترتیب بدلی یا اس کا پورا لحاظ نہ رکھا جا سکا تو پھر کامل، متوازن اور بے آمیز حق کبھی ہاتھ نہیں آسکتا۔ اس لیے بالکل ناگزیر ہے کہ ہر مسلمان اللہ کی کتاب کے مطالعہ اور تلاوت کو سب سے زیادہ اہمیت دے اور اسے اپنی زندگی کی اولین ضرورت سمجھے۔

قرآن مجید کی تلاوت کی اہمیت خود قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ کے سچے اور مخلص بندوں کی یہ ایک نمایاں اور امتیازی صفت ہے کہ وہ اللہ کا ذکر اور میری آیتوں کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سچے مومنوں کی صفت بیان کرتے ہوئے جو بار بار یہ فرمایا ہے کہ '' جب اُن کو آیاتِ الٰہی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان بڑھ جاتا ہے:
(وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔
(انفال۔۲)

یا یہ کہ'' ہماری آیتوں پر صرف وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اُنہیں ان آیتوں کے ذریعہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں''۔
(اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا۔
(سجدہ۔۱۵)

یا یہ کہ ''سچے مومن تو وہی ہوتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کے دل دہل اُٹھتے ہیں''۔
(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔
(انفال۔۲)

یا یہ کہ ''جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو پیغمبر پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق کی معرفت سے ان کی آنکھیں اشک ریز ہو جاتی ہیں۔
(وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓي اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَـقِّ۔
(مائدہ۔۸۳)
اس طرح اُمتِ سابقہ کے بارے میں بھی اس نے صاف صاف فرما رکھا ہے کہ فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی بنی اسرائیل کی قوم میں سے صرف وہ لوگ حق پر قائم باقی رہ گئے ہیں جو آیات الٰہی کی تلاوت کیا کرتے ہیں۔
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ۔ (ال عمران:112)
''اہل کتاب میں سے ایک گروہ ہے جو حق پر قائم ہیں۔ یہ گروہ آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں''۔
یہ تلاوت جس طرح کی تلاوت ہوتی تھی اس کی وضاحت بھی اس نے ان لفظوں میں کردی ہے۔
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ۔ (البقرہ:121)
''جنہیں ہم نے اپنی کتاب دی ہے وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے رہتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے''۔
اُوپر ہم نے اہل ایمان کا جو حال بیان کیا وہ یقیناً صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ اللہ کا کلام اس توجہ اور انابت کے ساتھ سنتے یا پڑھتے ہیں جس توجہ سے سننے اور پڑھنے کا حق ہے۔
اس ارشاد الٰہی نے یہ حقیقت کھول دی کہ تلاوتِ کتاب کی ایک سے زیادہ شکلیں ہوتی ہیں۔ ان شکلوں میں سے جو اللہ کو مطلوب ہیں وہ صرف وہ تلاوت ہے جسے حق تلاوتہ کہہ سکیں۔ یعنی جس سے وہ مدعا پورا ہو سکے جو کسی کتاب الٰہی کے نازل کیے جانے کا مدعا ہوا کرتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرنے کے لیے چند باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

- سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف ہدایت و معرفت حاصل کرنے کے لیے پڑھے۔ کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلب معرفت و ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی۔ تو نہ صرف یہ کہ وہ قرآن کے فیض سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دُور وہ اب تک رہا ہے۔ اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے گا۔ اگر آدمی قرآن کو اس لیے پڑھے کہ لوگ اسے مفسر قرآن

سمجھنے لگیں۔ یا اس لیے پڑھے کہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد اس سے شہرت اور دُنیادی نفع حاصل کرسکے۔ یا اس لیے پڑھے کہ اُس کے کچھ نظریات ہوں اور وہ اپنے اُن نظریات کو قرآن کے مُلمّع کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا خواہش مند ہو۔ تو ممکن ہے اُس کے یہ ارادے کسی حد تک پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں تک فہمِ قرآن اور اس سے حصولِ معرفت کا تعلق ہے اس طرح وہ اس کا دروازہ اپنے اوپر بالکل بند کر دے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہنمائی کا صحیفہ بناکر اُتارا ہے۔ اور ہر آدمی کے اندر ہدایت و معرفت کا داعیہ ودیعت کر دیا ہے۔ اگر اسی داعیہ کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اس سے اپنی کوشش اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق فیض پاتا ہے۔ اور اگر اس داعیہ کے علاوہ کسی اور خواہش کے تحت وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ تو لکل امرئ ما نوی کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طلب گار ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اس خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ''اس کے ذریعے سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے''۔ اور یہ اُصول بیان فرمانے کے بعد ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کردی کہ گمراہ اُن لوگوں کو کرتا ہے جو فاسق ہوتے ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی اغراض کے ایسے بندے ہوتے ہیں۔ کہ وہ ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کواللہ تعالیٰ وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جاکر بھی بتوں ہی کو یاد کرتا ہے تو وہ ہر گز اس بات کا سزا وار نہیں ہے کہ اس پر توحید کے رموز کھولے جائیں۔اسی حقیقت کی طرف قرآن نے سورہ بقرہ میں اشارہ کیا ہے:

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ(بقرہ۔۱۶)

''یہ وہ لوگ ہیں ، جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے ، مگر یہ سودا اِن کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں'' ۔ (تزکیۂ نفس، امین احسن اصلاحی صفحہ ۸۵، ۸۶)

لہٰذا اسے ہدایت کی سچی طلب کے ساتھ پڑھا جائے۔ نیت بھی خالص ہو اور عزم بھی صادق کہ اللہ کی اس کتاب سے جو ھدی للناس اور ھدی للمتقین ہے اور جس کے سوا صریح اور کامل حق کہیں اور ممکن ہی نہیں، ہدایت حاصل کرنی ہے۔ اوراللہ کی سچی معرفت اور اُس کی مرضیات معلوم کرنی ہیں۔

- <u>قرآن کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے شیطان کی درآندازیوں اور وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔</u>

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (النحل:98)
"پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو"۔

اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے اَعُوْذُ باللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہہ دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملا یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو، قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے جو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اسے بہکانے اور اخذ ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی چوکنا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مانگتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اسے اس سرچشمہ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کردیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پا سکے گا، اور جو اس کتاب سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکر سے نہ نکال سکے گی۔

اس سلسلہ کلام میں یہ آیت جس غرض کے لیے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آگے چل کر ان اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جو مشرکین مکہ قرآن مجید پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے پہلے تمہید کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کے گمراہ کن وسوسہ اندازیوں سے چوکنا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

(تفہیم القرآن جلد دوئم النحل۔حاشیہ ۱۰۱)

- <u>قرآن مجید کے مرتبہ و مقام کے صحیح علم و شعور کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کرنا چاہئے</u>۔ بالخصوص اسے اس امر کا پورا

احساس ہو کہ یہ کتاب انسانی زندگی کے لیے ایک کامل ہدایت نامہ اور اس کی ضرورت سے تعلق رکھنے والے سارے ہی احکام و معارف کا خزانہ ہے۔ اس لیے دُنیا اور آخرت کا جو بھی مسئلہ ہو اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔۔ اور وہ جو تفصیلی یا اُصولی رہنمائی دے اُسی کی روشنی میں عمل کی راہ متعین کی جانی چاہیے۔

- تلاوت میں آیاتِ قرآنی کے معانی کے اندر اُترنے کی پوری کوشش کی جائے۔ لفظ لفظ پر اور آیت آیت پر ٹھہر کر غور کیا جائے کہ ان کے اندر معرفت اور ہدایت کے کون کون سے انوار پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ (ورتل القرآن ترتیلا) (المزمل:4) طالبین حق کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ قرآن پڑھتے اور سنتے وقت اپنی آنکھیں اور فہم کے کان کھلے رکھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِـرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (الفرقان:73)

"اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اُنہیں اپنے رب کی آیات کے ذریعہ یاددہانی کیجاتی ہے تو اُن پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے"۔

اس کے برعکس منکرین حق کے انکار حق پر اصرار کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ قرآن پر غور نہیں کرتے (اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ) (محمد:24)اسی طرح یہود کا رویہ تھا۔ اُن کی مثال گدھے سے مشابہ ٹھہرائی گئی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں (كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا)(الجمعہ:5)

مگر اس سب تبصرے کے باوجود قرآن مجید کے ساتھ ہماری خاص بڑی تعداد کا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں رہ گیا ہے۔ اس کے الفاظ کو صرف برکت اور ثواب (اور یقیناً اس کا اجر ہے)کی خاطر پڑھ لیا جانا تلاوت کا حق ادا کر دینے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ رہی ہے کہ وقت کے مشہور و مقبول دین دار حلقوں سے تعلق رکھنے والے اونچے تعلیم یافتہ حضرات اپنے شاگردوں اور متوسلین کو علانیہ مشورے دینے لگے ہیں کہ قرآن کی بس تلاوت کر لیا کرو۔ اس کے ترجمے اور تفسیر کی جھنجھٹ میں نہ پڑو۔ ورنہ ذہن اُلجھنوں کا شکار ہو جائے گا۔ کیا یہ صورتِ حال رسول اللہ کی اس پیش گوئی کی یاد نہیں دلاتی۔ کہ ایک زمانہ آئے گا۔ جب اسلام کا صرف نام اور قرآن کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں گے۔

يوشك ان يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ ، وَمِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ ، مَسَاجِدُهُمْ يَوْمَئِذٍ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى (مشكواة كتاب العلم)

''عنقریب ایک زمانہ آئے گا جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا۔ اور قرآن کے صرف حروف رہ جائیں گے۔ ان کی مساجد آباد ہوں گی۔ مگر ہدایت کے پہلو سے وہ ویران ہو نگی''۔

- قرآن مجید کو دل کی حضوری کے ساتھ پڑھا جائے۔ یہ صرف شہنشاہ کائنات کے کلام کی عظمت کا ہی تقاضا نہیں ہے بلکہ عین اس کی بنیادی مقصود کا بھی تقاضا ہے جس کے لیے یہ قرآن نازل ہوا ہے۔ اور جس کی تلاوت ایک مسلمان کی بنیادی ضرورت قرار پائی ہے۔

تلاوت کےمتعلق یہ جان لینا چاہیے۔ کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کرکے اُس کے دل تک نہیں پہنچتی وہ اُسے کفر کی طغیانیوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ :

عن أبی سعيد قال سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول :يخرج فيكم قوم تحقرون صلاتكم مع صلاتهم وصيامكم مع صيامهم وأعمالكم مع أعمالهم يقرؤون القرآن ولا يجاوز حناجرهم يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية۔

''وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم۔موطا)

درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن و فکر اور اخلاق و کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے جس سے قرآن منع کرتا ہے۔ وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی ﷺ صاف فرماتے ہیں **عن صهيب قال : قال رسول الله صلى الله عليه و سلم ما آمن بالقرآن من استحل محارمه** - ''قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اُس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کیا''(ترمذی بروایت صہیب رومیؓ) ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اُس کی روح کو تقویت دینے کے بجائے اُس کو اپنے خدا کے مقابلہ میں اور زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے۔ اور اس کے اندر کیریکٹر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے

اور اُسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا رہے۔ کہ اُس کے خدا نے اُسے کیا ہدایات دی ہیں۔ اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے۔ اُس کا معاملہ تو اُس مجرم کا سا ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پوزیشن کو رسول ؐ نے ایک مختصر فقرے میں یوں واضح فرمایا ہے کہ:

وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ۔ ‘‘ قرآن حجت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف

(مسلم)-(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۷۰۳ تا ۷۰۴)

- قرآن پر عمل کیا جائے اور اس کے مطابق اپنے فکر و عمل کو بدلا جائے۔ قرآن ہر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ قرآں کے احکام کے مطابق بدلنے کے بجائے اپنی بد اعمالیوں کے لیے جواز پیش کرنے کے لیے قرآن کو (نعوذ باللہ) بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یا یہ کہ اس کے احکام کو تو پڑھا جائے مگر دوسری جانب اُن پر عمل نہ کیا جائے۔ قرآن نازل ہی اس لیے کیا گیا ہے۔ کہ اس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نقشے کو تعمیر کیا جائے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کے مطابق عمل کی سعی کی جائے۔
- قرآن مجید کی تلاوت کے سلسلے میں جو مشکلات اور الجھنیں پیش آئیں آدمی اُن سے بددل اور مایوس ہونے یا اُن کے سبب سے قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کی بجائے اپنی الجھن کو خدا کے سامنے پیش کرے اور اُس سے مدد اور رہنمائی طلب کرے۔قرآن میں آدمی کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے قول ثقیل کے نیچے دب گیا ہے جس کے بارگراں کو اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح علمی اور عملی مشکلوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے برابر دُعا اور قرآن مجید پر برابر غور کرتا رہے:۔

ارشاد ربانی ہے:

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (الفرقان۔۳۱) ‘‘اور تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے’’۔

رہنمائی سے مراد صرف علم حق عطا کرنا نہیں ہے بلکہ تحریک اسلامی کو کامیابی کے ساتھ چلانے کیلیے اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کیلیے بروقت صحیح تدبیریں سمجھانا بھی ہے۔ اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ بھی کھلیں، ہر ایک پر اہل حق کی تائید میں کمک پہنچانا

اللہ کا کام ہے۔ دلیل کی لڑائی ہو تو وہی اہل حق کو حجتِ بالغہ عطا کرتا ہے۔ اخلاق کی لڑائی ہو تو وہی ہر پہلو سے اہل حق کو اخلاقی برتری عطا فرماتا ہے۔ تنظیم کا مقابلہ ہو تو وہی باطل پرستوں کے دل پھاڑتا اور اہل حق کے دل جوڑتا ہے۔ انسانی طاقت کا مقابلہ ہو تو وہی ہر مرحلے پر مناسب اور موزوں اشخاص کو لالاکر اہل حق کی جمعیت بڑھاتا ہے۔ مادی وسائل کی ضرورت ہو تو وہی اہل حق کے تھوڑے مال و اسباب میں وہ برکت دیتا ہے۔ کہ اہل باطل کے وسائل کی فراوانی کے مقابلے میں محض دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتی ہے۔غرض کوئی پہلو، مدد اور رہنمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہل حق کے لیے اللہ کافی نہ ہو۔ اور اُنہیں کسی دوسرے سہارے کی حاجت ہو۔ بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمان و اعتماد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہیں بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑائیں۔

(تفہیم القرآن جلد سوم۔صفحہ۴۴۸)

مندرجہ ذیل دعا بھی اس طرح کے حالات میں پڑھتے رہنا نہایت نافع ہے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، ابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ أَمَتِكَ، نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِي، وَنُورَ صَدْرِي، وَجَلَاءَ حُزْنِي، وَذَهَابَ هَمِّي و غمی۔

"اے اللہَ ۔میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری مٹی میں ہے۔مجھ پر تیرا حکم جاری ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے، میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطہ جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنےاپ کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنادے"۔

- پھر قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کے سلسلے میں رہنما اور نمونہ اُس مبارک ہستی ﷺ کو ماننا جس پر یہ کتاب نازل ہوئی۔اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ سے سرمو انحراف بھی قرآن سے دور لے جانے والی چیز ہے۔ (اُسوۂ حسنہ پر تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے)

- اور آخری چیز یہ ہے کہ قرآن جس دعوت کو لے کر آیا ہے اُسے پھیلانے اور اس کے نظام کو قائم کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ابولاعلیٰ مودودی نے سچ لکھا ہے۔

''فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ وہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے۔ کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے۔ کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔۔(بلکہ) یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دُنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی۔اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سےاُس کو لڑا دیا۔گھر گھر سے ایک ایک سعید روح کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعئ حق کے جھنڈےتلے سب کو اکٹھا کیا۔گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے جنگ کرائی۔

ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کرکے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئس(۲۳) سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل اور جاں گس کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بنائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں۔ اور اسی کشمکش کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اُس وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اُٹھا تے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔مکہ، حبشہ اورطائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے۔ اور سابقین اولین سے لے کر مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے۔ اور

برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں ’’سلوکِ قرآنی‘‘ کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اورنحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالککی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ قرآن اپنی روح کو اُس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔
پھر اس کلّیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصول و قوانین، آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔
(تفہیم القرآن مقدمہ جلد اول صفحہ۳۳تا ۳۵)
’’قرآن پر ایمان اُسی وقت مفید اور معنی خیز ہو سکتا ہے جب ہم قرآن کے پیغام کو سمجھیں اور اس کی دعوت پر لبیک کہیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے اور اس کی ہدایت کے ذریعے اپنے معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ آج عالمِ اسلام جن مسائل اور مصائب سے دوچار ہے۔ اُن سے نکلنے، ترقی اور عزت کی راہ پر پیش قدمی کرنے کا راستہ صرف یہی ہے اور صادق برحق نے اس کی تلقین کی تھی۔
رسولؐ اللہ: خبردار عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اُٹھائے گا۔
حضرت علیؓ: اس سے نجات کیا چیز دلائے گی یا رسول ؐ اللہ!
رسولؐ اللہ:اللہ کی کتاب

- اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔
- تم سے بعد میں ہونے والی باتوں کی خبر ہے
- اور تمہارے آپس کے معاملات کا فیصلہ ہے
- اور یہ ایک دوٹوک بات ہے، کوئی ہنسی دل لگی کی بات نہیں
- جو سرکش اسے چھوڑے گا، اللہ اُس کی کمر کی ہڈی توڑ ڈالے گا
- اور جو کوئی اسے چھوڑ کر کسی اور بات کو ہدایت کا ذریعہ بنائے گا۔ اللہ اُسے گمراہ کر دے گا

- خدا کی مضبوط رسی یہی ہے
- یہی حکمتوں سے بھری ہوئی یاد دہانی ہے
- یہی بالکل سیدھی راہ ہے
- اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں کرتیں۔
- اور نہ زبانیں لڑکھڑاتی ہیں۔
- اہل علم کا دل اس سے کبھی نہیں بھرتا
- اسے کتنا ہی پڑھو طبیعت سیر نہیں ہوتی
- اس کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں
- جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا
- جس نے اس پر عمل کیا، اجر پائے گا
- جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا، اس نے انصاف کیا
- جس نے اس کی دعوت دی، اُس نے سیدھی راہ کی دعوت دی (مشکواۃ)

یہی وہ سیدھی راہ ہے جس کی طرف قرآن ہم سب کو دعوت دے رہا ہے۔

(ترجمان القرآن لاہور جون ۲۰۱۵ پروفیسر خورشید احمد ''رمضان قرآن کریم اور ہماری ذمہ داری'' صفحہ ۷ تا ۲۴)

ترکِ قرآن/ہجر قرآن/قرآن سے اعراض کی سزا

(i) **دنیوی زندگی میں سزا**

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (طہ۔۱۲۴)

''جو ہمارے ذکر (قرآن) سے منہ موڑے گا اس کے لیے تکلیف دہ زندگی ہوگی''۔

Ii۔**شیطان کا تسلط**:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُـقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ (الزخرف۔۳۶)

''جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے''۔

Iii۔**ذلت اور رسوائی**:

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ آخرین (مسلم)

‘‘اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے کچھ قوموں کو رفعت اور ترقیاں عطا فرمائیں گے اور کچھ دوسری قومیں اس کی وجہ سے ذلت اور پستی سے دوچار ہوں گی’’۔

برزخی زندگی میں سزا

جو شخص قرآن سے غافل رہا اور قرآن مجید نہ پڑھا وہ قبر میں منکر نکیر کے سوالوں کے جواب نہ دے پائے گا۔ فرشتے اُسے ڈانٹ کر پوچھیں گے لا دَرَیْتَ ولا تَلَیْتَ (تو نے جاننے کی کوشش نہ کی اور نہ قرآن مجید کی تلاوت کی) اس کے بعد فرشتے اُس میت کو لوہے کے گرزوں سے مارنا شروع کریں گے۔(مفہوم حدیث بخاری)

آخرت کی سزا

i۔قبر سے اندھا اٹھایا جائے گا:

وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى۔ (طہ۔۱۲۴)‘‘اور اسے قیامت کےدن اندھا کرکے اٹھائیں گے’’۔

Ii۔خود نبی ﷺ اس کے خلاف گواہی دیں گے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا
(الفرقان۔۳۰)

‘‘اور رسول ﷺ کہے گا کہ ‘‘اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا’’۔

Iii۔قرآن خود ایسے لوگوں کے خلاف گواہی دے گا:

الْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَيْکَ‘‘ (رواہ مسلم)

‘‘قرآن تیرے لیے حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے’’۔

Iv۔جہنم کے شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا:

وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۔ (جن:۱۷)

‘‘اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا، اُس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا’’

اُسوۂ حسنہ

مولانا مودودیؒ محسن انسانیت کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:
''اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام۔دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ، تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا۔ بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔
یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کرکے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہوسکا۔ اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یا ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجئے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر جیسے لیکر اناڑی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجئے تو خدا کا راستہ پانے کی بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنابیٹھنے سے کبھی بچ نہیں سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔یہودیوں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا۔ اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں اُن کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں۔ حتیٰ کہ آخر کار خود اُنہیں بھی وہ گُم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کرکے نبی کا دامن پکڑا۔ اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کوئی چیز اُنہیں بنی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔
پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آرہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتی ہے۔ دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی ﷺ کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان اگر حاصل کر سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد ﷺ سے اور محمد ﷺ کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اُس نے اسلام کو سمجھا ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجۂ ہدایت سے بھی۔
پھر قرآن اور محمد ﷺ چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں۔ ایک مقصد و مدعا کو لیے ہوئے آئے ہیں۔ اس لیے اُن کو سمجھنے کا انحصار اس پر

ہے کہ ہم اُن کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔اس چیز کو نظر انداز کرکے دیکھیں تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں۔ اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھاکر رسول اللہؐ کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں۔ مگر روحِ دین تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے۔ جس کے لیے قرآن اُتارا گیا۔ اور محمد عربیؐ کو اس کی علمبرداری کے لیے کھڑا کیا گیا۔ اصل مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا۔اُتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا وہ ناقص ہوگا۔ اُتنا ہی دونوں کا فہم ناقص ہوگا۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی دونوں ہی بحرِ نا پیداکنارہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی اُن کا زیادہ سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرے اور اُن کی مدد سے روحِ دین تک رسائی پائے۔''

(دیباچہ محسن انسانیت از نعیم صدیقی صفحہ ۲۵، ۲۶)

<u>انبیاء کرام کی دعوت کا مقصد:</u>

قرآن کریم نے اس مقصد کو چار مختلف مقامات پر معمولی تبدیلئ ترتیب کے ساتھ ہمیں سمجھایا ہے۔ اختصار کی بنا پر ہم صرف ایک مقام کا تذکرہ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ فرمایا گیا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔(ال عمران۔۱۶۴)

''درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے ، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے ، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے''۔

قرآن کریم اس آیت مبارکہ اور سورہ بقرہ ایت نمبر۱۲۹، ۱۵۱ اور سورہ جمہ ایت نمبر۲ میں بھی اسی پہلو کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ انبیاء کرام بطور داعی جس مقصد کے لیے بھیجے جاتے ہیں <u>وہ جامع شکل میں چار وظائف ہیں۔</u>

تلاوت آیات:
اللہ کے کلام کو وہ جس شکل میں، جن الفاظ میں، اور الفاظ کی جس ادائیگی و صحت، کے ساتھ اُن پر نازل ہوا ہے اُس میں بال برابر تبدیلی کے بغیر جوں کا توں بطور امانت انسانوں تک پہنچا دیں۔ انبیاء کرام بطور معلم اور داعی پہلا کام یہی کرتے ہیں کہ اپنے ماننے والوں کو اس عظیم کلام کو صحیح طور پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے، تلاوت کرنے، اور اس پر غور کرنے کی تربیت دیں۔ یہ علمی اور فکری تطہیر کا مقدمہ ہے۔

تعلیم کتاب:
دوسرا کام اللہ کی عظیم کتاب کی تعلیم ہے۔ یہ کام پہلے کام کا تسلسل ہے اور بنیادی فریضۂ دعوت ہے۔ اس سے مراد احکام کی حلت و حرمت، ترجیح، تطبیق،تخصیص سے آگاہ کرنا اور عملی طور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اتباع کی عملی شکل پیش کرنا ہے۔

تزکیۂ و تربیت:
تیسری اہم ذمہ داری جو انبیاء کرام اور خصوصاً نبی ﷺ پر ڈالی گئی ہے وہ تزکیہ ہے۔ چونکہ اس کا براہِ راست تعلق ہمارے موضوع سے ہے اس لیے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔
تزکیہ کے عمل کو قرآن کریم نے خود بہت وضاحت سے مختلف مقامات پر بیان کر دیا ہے۔ کہ اسے کس طرح کیا جائے اور اس کی سب سے مکمل اور عملی شکل خاتم النبین ﷺ کی حیات مبارکہ کی شکل میں رہتی دنیا تک ہمارے سامنے قابل عمل نمونے کے طور پر رکھ دی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ (الاعلیٰ:14،15)

”فلاح پا گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی“۔

اس کی وضاحت یوں کردی:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۔ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا۔ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۔
(المزمل۔۱تا۴)

”اے محمد ﷺ ! اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (اے چادر لپیٹنے والے)۔ رات کو نماز میں کھڑے رہا کیجیے مگر کم ۔آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو،یا اس پر کچھ زیادہ بڑھادو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو“۔

نماز تہجد اور قرآن کا رشتہ انتہائی قریبی اور حقیقی ہے۔ اللہ کا ذکر اور اس کی یاد نماز کی شکل میں اور قیام میں رکوع میں حتیٰ کہ پہلو پر لیٹے ہوئے بھی، اللہ کا ذکر اختیار کرنا، نفس اور تزکیۂ ذات کی اعلیٰ شکل، خود کلامِ عزیز نے متعین کردی۔ اور اسوۂ پاک نے اسے تاریخ کی روشن مثال بنا دیا۔
مال کے تزکیے کے لیے زکواۃ فرض کی گئی اور وقت اور تعلقات کے تزکیے کے لیے روزے کی فرضیت، لیکن اس میں بھی تزکیۂ نفس کشی کا نام نہیں بلکہ توازن و اعتدال سے سنت پاک کے دائرے میں رہتے ہوئے روزے رکھنا تجویز کیا گیا۔
مشہور حدیث کے مطابق، جب آپ کے تین اصحاب نے اُمہات المومنین سے یہ سمجھنا چاہا کہ آپ کے لیل و نہار کیسے گزرتے ہیں۔ جب اُنہیں بتایا گیا تو اُنہوں نے آپ کی عبادت کی مقدار کو کم تصور کیا کہنے لگے نبیؐ سے ہمارا کیا مقابلہ۔ان سے نہ تو پہلے گناہ ہوئے نہ بعد میں ہونگے۔ ہم معصوم نہیں ہم تو عام انسان ہیں۔ اس لیے ہمیں عبادت میں کثرت کے ذریعے تزکیۂ نفس کرنا چاہیے۔۔ چنانچہ ایک نے قصد کیا کہ تمام رات نماز میں مصروف رہے گا۔ دوسرے نے عزم کیا کہ مستقل روزہ رکھے گا اور تیسرے نے طے کیا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا۔کبھی شادی نہ کروں گا۔ تزکیے کی ان تینوں شکلوں کو خاتم النبینؐ نے یک قلم منسوخ کرتے ہوئے توازن و عدل کے ساتھ تزکیے کی تعلیم فرمائی۔ اور یہ اصول طے فرمایا کہ نیکی سمجھ کر جو کام آپؐ کی سنت کے علی الرغم کیا جائے گا۔ وہ ایسے فرد کو آپؐ کی امت سے خارج کردے گا۔ اس طرح دُنیا کے تمام مذاہب کے تصور تزکیۂ نفس اور ریاضت باطنی کو رد فرماتے ہوئے آپؐ نے ایک صالح شخصیت، صالح معاشرہ،اور عادلانہ تہذیب کی تعمیر کے لیے اپنی سنت پر عمل کو شرطِ اول قرار دے کر انحراف کے تمام راستے بند کر دئیے۔
(ترجمان القرآن لاہور جنوری ۲۰۱۶ اشارات از ڈاکٹر انیس احمد صفحہ ۱۵ تا ۱۸)
یہ تزکیہ ایوانِ اقتدار اور خود اقتدار کا بھی کیا جائے گا۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے اقتدار کو چیلنج کرنے کے لیے بھیجتے وقت وصیت کی گئی:
اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی۔فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰی۔
(سورہ طٰہ۔ایت ۴۳و ۴۴)
یہ تزکیہ میدان جہاد میں بھی ہے کہ اپنی جان اور مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کو سربلند کرنے کے لیے لگا دیا جائے۔ یہ غیر

اخلاقی ثقافتی معاملات کا بھی ہے کہ اُن سےپاک دامن رہتے ہوئے اُن کی جانب کسی رجحان کے بغیرگزر جایا جائے۔وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔(مومنون۔۳)لغویات سے دور رہتے ہیں۔
مزید فرمایا گیا کہ اللہ کے بندے کس طرح اپنے اوپر مکمل قابو کرکے اپنا تزکیۂ کرتے ہیں۔
(سورۃ الفرقان ایات ۶۳ تا ۷۲)
اللہ تعالیٰ نے تزکیے کا کام بعد میں آنے والے کسی فرد یا افراد کی جگہ، خود خاتم النبینؐ کی ذمہ داری قرار دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ دروازے بند کر دئیے۔ جن میں کوئی اور یہ تعلیم دے کہ میرے تجربے میں فلاں عمل سے یہ بات آئی ہے۔اس لیے اس طریقے سے تزکیہ کیا جائے۔ رسول اللہ سے زیادہ تزکیہ کی تربیت دینے والا نہ آج تک کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ ڈاکٹر انیس احمد تحریک اسلامی کے کارکنوں کو ہدایات دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ‘‘اس لیے تحریک کے ہر کارکن کا فرض ہے کہ وہ قرآن کریم اور سیرت پاک میں تلاش کرے کہ سچائی کے ان نمونوں نے کن کاموں کے ذریعے نفس کا تزکیۂ عقل کا تزکیہ، مال کا تزکیہ، خاندان کا تزکیہ، ثقافت کا تزکیہ، سیاست کا تزکیہ، باہمی تعلقات کا تزکیہ، اور عالمی سطح پر فکر اور عمل کا تزکیہ کرنے کی تعلیم اور عملی مثال ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ تاکہ اہل ایمان، ظن و گمان اور قیاس کی جگہ سنت پاک کی پیروی کرتے ہوئے اپنے مال، اپنے جسم و روح، اپنی صلاحیت، اپنی فکر، اپنے اختیارات، انسانی تعلقات اور معاملات، غرض پوری زندگی کا تزکیہ کر سکیں۔ اس کا م میں قائد اور کارکن میں کوئی فرق نہیں جو حکم قائد کو دیا گیا۔ کہ وہ رات کے کچھ حصے کو اللہ کے حضور سرگوشی کے لیے محصوص فرمالیں وہی حکم ایک عام کارکن کا ہے تاکہ وہ سیدہ عائشہؓ کی روایت کردہ حدیث کی روشنی میں کم از کم دو رکعت جیسے مختصر عمل کو اپنا ذریعہ تزکیہ بنالے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس بظاہر چھوٹے عمل کو حدیث میں بڑے عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس چھوٹے سے عمل سے اگر اللہ اور رسولؐ خوش ہوتے ہیں تو یہ دو رکعت ایک بہت بڑی ریاضت ہے۔ اس سے بھی زیادہ جس کے لیے بعض مذاہب میں سنیاسی اور روحانیت کے متوالے ۳۰، ۳۰ سال جنگلوں اور بیابانوں میں سرگرداں رہتے ہیں’’۔
(ایضاً صفحہ ۱۹، ۲۰)

تعلیم حکمت:

انبیاء کا چوتھا اہم مشن اور مقصدِ نبوت تعلیم حکمت ہے۔ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ حکمت سے مراد رسولؐ کی سنت مبارکہ ہے۔ یعنی

آپ کا کسی کام کو کرنا، کسی بات کا زبانی حکم دینا، یا کسی بات کے واقع ہونے پر خاموشی کے ذریعے اس کی توثیق فرمانا۔ یہ حکمت اور سنت بھی قرآن کی طرح آفاقی ہے۔ حیات طیبہ نے جس طرح عبادات و معاملات میں رہنمائی فراہم کی ہے ویسے ہی عقود و معاہدات میں، قانون صلح و جنگ میں، بین الاقوامی تعلقات، تجارت، تہذیب و معاشرت میں مستند رہنمائی فراہم کی ہے۔ ہم پر یہ فرض ہوتا ہے کہ کس طرح آج کے حالات میں سنت اور حکمت کی تطبیق کی جائے گی۔ ہر ہر معاملے میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ سنت پاک ہمیں اس حوالے سے کیا بنیاد اور دلیل فراہم کرتی ہے۔ نہ صرف خاتم النبینؑ کا اسوہ بلکہ دیگر انبیاء کرام کا اسوہ آج کے معاملات میں کن مصالح کو تقویت دیتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے۔ الکتاب نے اسی بنا پر ہمیں احسن القصص سے نوازا ہے۔

قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اُسوۂ حسنہ اور احادیث کا مطالعہ اور اتباع ہے۔ اسلام کی شاہراہ پر برقرار رہنے اور بھٹک کر غلط راستوں پر پڑ جانے سے محفوظ رہنے کی جو تدبیر رسول اللہ ﷺ تلقین فرما گئے ہیں۔ وہ صرف تمسک بالکتاب (کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے) ہی کی نہیں ہے بلکہ ساتھ ہی تمسک بالسنۃ (سنت رسول کو مضبوط پکڑے رہنے کی بھی ہے)

(ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتوا بھما کتاب اللہ و سنت رسولہ)

اسی طرح جہاں آپ نے قرآن کو خیر الحدیث (سب سے بہتر کلام) فرمایا ہے وہیں اپنی ھدی (منہاج عمل) کو سب سے بہتر منہاج عمل بھی قرار دیا ہے:

فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَخَيْرُ الْهُدَى هُدَى مُحَمَّدٍ (مسلم)

''بے شک بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین منہاج عمل محمد ﷺ کا منہاج عمل ہے۔پھر ان سب باتوں سے بھی زیادہ واضح اور صریح بات یہ کہ آپ ﷺ نے اپنی سنت کو دانتوں سے پکڑے رہنے کا بصیغۂ امر حکم دے رکھا ہے''۔

فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّينَ الرَّاشِدِينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔

(ابوداؤد)

"پس میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع کو اپنے اوپر لازم ٹھرالو۔ اسے مضبوطی سے تھامے اور دانتوں سے پکڑے رکھنا۔

(دین کا مطالعہ کیسے کریں از صدرالدین اصلاحی صفحہ ۲۶، ۲۷)
اسلام ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کے لیے سرورِ عالم کی ایک ہی بے داغ اور بے میل شخصیت کو اُسوہ و معیار بنائیں۔ اور سارا اکتساب وہیں سے کریں۔ انسانی کردار کے لیے یہی سب سے اونچا مقام ہے۔ جس پر نگاہ جماکر بلند ترین پرواز کی جا سکتی ہے۔ اس معیار سیرت و کردار کی بننے والی ہستی کی سنت کا مستند ریکارڈ اُس کی پوری تصویر ہمارے سامنے لا رکھتا ہے۔ اور ہماری تاریخ کا ایوان اس کی لازوال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔
آیت قرآنی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔(الاحزاب:21)
اگر قرآن صامت اللہ کی کتاب ہے۔ اور انسانوں کے عمل کرنے کے لیے ہے۔ تو اس پر عمل کرنے کا طریقۂ کار بھی انسانوں کے سامے آنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے محض نظری ہدایت پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی رحمت کا ملہ اور انسانوں کے سامنے آنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے محض نظری ہدایت پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی رحمت کاملہ اور فضل عمیمہ سے ایک عملی نمونہ بھی بھیجا۔اور وہ ہے سیرت۔قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ کار اور قرآن مجسم کا رویہ۔ جو قرآن نے کہا وہ حضورؐ نے کیا۔ اور جو حضورؐ نے کیا وہ قرآن نے کہا۔ ان دونوں میں گہری نسبت پائی جاتی ہے۔بلکہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ جو حضور ؐ نے چاہا وہ قرآن نے کہا۔ اس کی مثالیں بھی خود قرآن پاک میں موجود ہیں:
قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (سورہ بقرہ:144)
حضورؐ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ بیت اللہ ہمیشہ کیلیے قبلہ قرار پائے اور قرآن پاک نے اس کو ریکارڈ کر لیا۔قرآن پاک میں یہ وضاحت کیا جانا کہ ہم آسمان کی طرف آپ کے چہرے کا باربار اُٹھنا دیکھتے تھے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ تحویل قبلہ کے باب میں حضورؐ کی خواہش کی تکمیل اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا تھا۔
حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ سیرت کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض ہے۔ اس لیے کہ سعادت دارین رسول اللہ کی لائی ہوئی ہدایت اور رہنمائی پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنے لیے سعادت کا طالب ہے۔ اپنا خیر خواہ ہے اور اپنی نجات چاہتا ہے۔ وہ رسول اللہ کی لائی ہوئی ہدایت، آپ کی سیرت اور آپکے معاملات سے آگاہی حاصل کرنے کا پابند اور مکلف ہے۔
اس اسوہ حسنہ یا بہترین رول ماڈل یا واحد رول ماڈل کی تفصیلات تین(۳) ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید، جس

کے بارے میں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا ارشاد ہے۔''**کَانَ خلقہ، القرآن''** آپ کے اخلاق وہی تھے جو قرآن میں تحریر ہیں۔ دوسرا ماخذ حدیث و سنت کے وہ ذخائر ہیں۔ جن کے جمع کرنے اور مدون کرنے پر ہزاروں انسانوں نے اپنی زندگیوں کے سالہا سال دور شب و روز قربان کیے۔ اور تیسرا بڑا ماخذ سیرت مبارکہ اور آپ کے شمائل و خصائل ہیں۔

نبی ﷺ کا منصب رسالت اور اُن سے ہمارے تعلق کی بنیادیں:

آپؐ کے اسوہ حسنہ سے صحیح فیض ایک مومن صرف اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب نبی ؐ کے ساتھ اُس کو صحیح قسم کی نسبت حاصل ہو۔اور اس نسبت کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آپؐ کے منصب رسالت کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔قرآن نے نبی ؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کو مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم کیا ہے۔جومختصراً مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ایمان:

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی پہلی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ اللہ کے آخری رسول ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچااور پکا اعتماد ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ ؐ صادق اور امین ہیں۔ اور یہ کہ آپ کے ہر قول اور فعل کے اندر گہری حکمت ہے۔ اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ نے جو راہ دکھائی ہے۔ وہی نجات اور حقیقی فلاح کی راہ ہے اگر چہ بظاہر اُس میں بے پناہ خطرات نظر آ رہے ہوں اور یہ کہ زندگی کے جو اُصول آپ نے سکھائے ہیں۔ وہ وقتی اور عارضی نہیں بلکہ وہ دائمی اور ابدی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس بات پر اعتماد کہ اللہ کی معرفت کا جو طریقہ آپ نے بتایا اور سکھایا ہے اُس سے بڑھ کر نہ کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

جب تک آدمی کے اندر یہ اعتماد نہ پیدا ہو مجرد تصدیق سے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

ذَاقَ طَعْمَ الإِيمَانِ، مَنْ رَضِيَ بِاللهِ رَبًّا، وَبِالإِسْلاَمِ دِيناً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولاً». رواه مسلم

ایمان کا مزہ اُس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمدؐ کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہوں گے۔(تزکیہ نفس از امین احسن اصلاحی صفحہ ۱۰۱)

اس ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ رسالت محمدی کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کرے۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کئی مخصوص امتیازات کی مالک ہے۔

(۱)پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ آپ کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ ساری دُنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سبا۔۲۸)

"اور (اے نبی ﷺ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

قُلْ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔

(اعراف۔۱۵۸)

"اے نبی ﷺ ! کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے ، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے ، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبیِّ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے ، اور پیروی اختیار کرو اُس کی ، اُمید ہے کہ تم راہِ راست پا لو گے"۔

آپؐ نے صراحت سے فرمایا کہ كان النبي يبعث إلى قومه خاصة ، وبعثت إلى الناس عامة

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

"مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بناکر بھیجا جاتا تھا۔لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بناکر بھیجا گیا ہوں"۔

(۲)دوسرا امتیاز یہ ہے کہ آپ کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اُسی طرح ہمیشہ کےلیے بھی ہے۔آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ اور اب قیامت تک کوئی نیا رسول نہیں آئے گا۔

مَا كَانَ مُحَـمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّـبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِـيْمًا۔

(احزاب۔۴۰)

(لوگو) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ، (کہ یا نکاح نا جائز ہو)مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں ، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔
اس فیصلۂ خداوندی کی خبر نبیؐ نے اپنے الفاظ میں بھی بے شمار مواقع پر دی ہے۔ اور واضح ترین انداز میں دی ہے:
مثلاًختم بی البُنیان و ختم بی الرُسل۔ (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ)
''مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور میرے ذریعے رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا''۔
انہ لا نبی بعدی۔ (بخاری ومسلم بحوالہ مشکواۃ)
''بلاشبہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا''۔
(۳)تیسرا امتیاز یہ ہے کہ آپ جو دین و شریعت لے کر آئے ہیں وہ ہر پہلو سے کامل ہے۔ جب تک یہ دین مکمل نہ ہوا اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان ملتوی رہا۔ کہ :
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَي النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (المائدہ۔۳)
''تم پر حرام کیا گیا مردار ، خون ، سور کا گوشت ، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو ،وہ جو گلا گھٹ کر ،یا چوٹ کھا کر ، یا بلندی سے گر کر ، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو ۔سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کرلیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو ۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو ۔آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے (لہٰذا حرام و حلال کی جو قیود تم پر عائد کر دی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان

میں سے کوئی چیز کھا لے ، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔
اس طرح یہ شرف رسالت محمدی کو ملا۔ قرآن مجید کی اس آیت کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اُترنی شروع ہوئی تھی اور جو نوعِ انسانی کے ذہنی اور تمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ تفصیل اور وسعت کا رنگ اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ آج ہر پہلو سے کمال کے درجے کو پہنچ گئی۔
<u>(۴)اس رسالت کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ آپ پر جو کتاب اُتری ہے۔ وہ جوں کی توں محفوظ ہے۔ اور قیامت تک محفوظ رہے گی:</u>
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔
(الحجر۔۹)
"رہا یہ ذکر ، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں "۔
قرآن کے سلسلے میں ہم پچھلے صفحوں میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

<u>اس امتیازی حیثیت کے فطری تقاضے دو ہیں:</u>

(۱)اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے۔ رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔اور ہر قوم، ملک، اور ہر زمانے کا انسان اس کی پیروی کرے۔
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (ال عمران۔۱۹)
وَمَنْ يَّبْتَـغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَھُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔
(ال عمران۔۸۵)
اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اُس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔
پھر نبی کے فرمان نے یہ بھی واضح کردیا کہ دوسرے انبیاء بھی اگر اس زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے امتی اور پیرو بنتے۔

ارشاد ہے:لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی۔
(مشکواۃ)
"اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے تو اُن کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں"۔
(۲)اسلام کی پیروی شرطِ نجات:رسالت محمدی کی ان مخصوص امتیازات کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام اور شریعت محمدی ہی پر موقوف ہے۔ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابل قبول ٹھہرا چکا ہے۔ اُن کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا۔
وَمَنْ يَّبْتَـغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔
(ال عمران۔۸۵)
اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اُس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔(اسلام ایک نظر میں۔مولانا صدرالدین اصلاحی صفحہ ۲۹۰ تا ۳۱۱)

۲۔اطاعت:

نبی ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد آپ کی کامل اطاعت ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ(النساء۔۶۴)
ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔"
دوسری جگہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال کی قبولیت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اس کے تمام اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ(محمد۔۳۳)
اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اپنے اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو۔
رسول ہی لوگوں کو اللہ کی ہدایات اور احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کی اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء:80)
"جس نے رسول کی اطاعت کی تو اُس نے اللہ کی اطاعت کی"۔
خود احادیث میں بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ یہی ہے کہ محمد کی اطاعت کی جائے۔
فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا صلى الله عليه وسلم فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ، وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا صلى الله عليه وسلم فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَمُحَمَّدٌ صلى الله عليه وسلم فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ. (بخاری)
"جس نے محمد کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمدؐ ہی نشانِ امتیاز ہیں"۔
قرآن نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ یہ اطاعت محض ظاہری اور رسمی طور پر مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے طور پر اپنے آپ کو اللہ کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کے تابع کردے۔ اور سب قضیے اور مسئلے طے کرنے کے لیے کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور پھر کتاب و سنت کے فیصلوں کو پورے اطمینان کے ساتھ قبول کیا جائے اور اُن کے خلاف دل میں کسی قسم کی بدگمانی یا شکایت نہ رہے۔ ارشاد ہے:
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَـرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِـيْمًا
(النساء:65)
"پس نہیں۔ تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہے جب کہ ان تمام معاملات میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور وہ پورے طور پر اپنے آپ کو تمہارے تابع نہ بنائیں"۔
ان آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کا تعلق صرف نبی کی زندگی ہی سے تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اللہ کی کتاب اور آپ کی سنت اُمت کے اندر آپؐ کے قائم مقام ہے۔ اور جیسے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ نبی نے اپنی وفات سے پہلے ان دو چیزوں کی اطاعت کی وصیت فرما دی تھی۔

۳۔اتباع:

رسول سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اس کا دائرہ اطاعت سے وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرہ میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی کی ہو۔ لیکن اتباع

کے دائرہ میں مستحبات اور نوافل بھی آجاتے ہیں۔ اور اتباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا بھی شرط ہے۔
صحابہ کرام صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ کا اتباع بھی کرتے تھے۔ اور ہر ایک کی یہ دلی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی ؐ کی زندگی کے سانچے میں ڈھالے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محبت و عقیدت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔ اور اُن کو معلوم تھا کہ اللہ کی محبت نبی کے اتباع میں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔
(ال عمران۔۳۱)
کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

۴۔محبت:

اور اس تعلق کی چوتھی بنیاد آپ کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ پھر محبت بھی محض رسمی اور ظاہری قسم کی مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے۔ جو تمام محبتوں پر غالب آجائے اور جس کے لیے دُنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے:
قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰي يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبہ۔۲۴)
"اے نبی ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ ، اور تمہارے بیٹے ، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں ، اور تمہارے عزیز و اقارب ، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار، جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے، اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں ، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا"۔
<u>اور ضیاءالعمری سیرت رحمت عالم مین محبتِ رسول اور ہمارا ایمان کے تحت لکھتے ہیں۔</u> یہ آیت کریمہ رسول اللہ کے ساتھ محبت کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس محبت کے لیے میزان رکھ دی گئی ہے۔ جس پر اُسے جانچا جائے گا۔ مطلوب یہ نہیں ہے کہ مومن رسولؐ کے ساتھ اس طرح محبت کرے جس طرح اپنے باپ، بیٹے، بیٹی بیوی اور ماں کے ساتھ ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی محبت

کا پلڑا سارے پیاروں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اُس کے دل میں کسی چیز کی محبت، رسول اللہ سے زیادہ نہ ہو کیونکہ رسول اللہ اس کے لیے جہالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکلنے اور علم و ہدایت کی سعادت کا سبب ہیں۔آپؐ کے ذریعے سے نعمت ایمان کا حصول تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اس عظیم نعمت کے پانے والے پر حق ہے کہ وہ اس ہستی سے محبت کرے جس نے اُس تک یہ نعمت پہنچائی۔ صحابہ نے اس نعمت کی حقیقت کو پا لیا تھا۔اور اُن کا رسولؐ کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور آپ کے ساتھ اُن کی محبت عظیم ترین تھی۔ چنانچہ وہ آپ پر جان، مال اور اہل کے ساتھ فدا تھے۔

نبیؐ نے ناگزیر محبت کی حدود بیان فرمائیں۔ جب کہ عمرؓ بن خطاب نے کہا''اے اللہ کے رسول آپ مجھے سوائے میری جان کے دیگر ہر چیز سے محبوب تر ہیں'' آپؐ نے فرمایا ''نہیں'' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے حتیٰ کہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی محبوب تر نہ ہو جاؤں'' اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا '' واللہ آپ مجھے میری جان سے محبوب تر ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا '' ہاں اب اے عمرؓ'' (صحیح بخاری) اور اس محبت کی علامت آنحضورؐ کا اتباع ہے اور قول یا عمل کے ساتھ آپؐ سے عدم تقدم ہے۔ انسان کی رائے رسولؐ کی حدیث اور آپؐ کے حکم سے محبوب تر نہ ہو اور آپ کی محبت کی حدود اور واجب مرتبہ تک اُس کی رسائی کی علامت آپؐ کی سنت کی نصرت اور شریعت کی حفاظت اسے اپنی مصلحتوں، اپنی جان، اپنے اہل و عیال اور مال وجاہ کی نسبت محبوب تر ہو۔ آپ کے اس ارشاد کے مطابق:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین

(صحیح بخاری و مسلم)

"تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس کے ہاں اس کی اولاد، اس کے ماں باپ اور جملہ انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں "۔

(سیرتِ رحمتِ عالم ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری ۴۹۶ تا ۴۹۸)

اس محبت سے مقصود وہ اُصولی محبت ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ اُسی اصول اور اُسی مسلک کو مقدم رکھتا ہے۔ اور اس کے اوپر ہر مسلک، ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کرتا ہے۔ اگر اس سے خود اپنا نفس اس کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس

سے بھی لڑتا ہے۔ اگر دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو اُن کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ بیوی بچوں اور دوسرے عزیز و اقارب کے مطالبات اگر اس سے ٹکراتے ہوں تو وہ بے تکلف اپنے بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبات کو ٹھکرا دیتا ہے۔ (تزکیۂ نفس از امین احسن اصلاحی صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۹)

صحابہ کرام کو حضور ﷺ سے بے انتہا محبت تھی اس کی ایک جھلک عروہ بن مسعود ثقفی نے بیان کی جو قریش کی طرف سےصلح حدیبیہ کے موقع پر نمائندہ بن کر آیاتھا۔ وہ جب قریش مکہ کے پاس واپس گیا تو اس نے صحابہ کرام کے بارے میں درج ذیل تاثرات بیان کیے:۔

''اے میری قوم! اللہ کی قسم! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی جیسے بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ میں نے کبھی ایسا بادشاہ نہیں دیکھا کہ جس کے اصحاب اُس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی تعظیم محمد ﷺ کے اصحاب اُن کی کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! جب وہ تھوک بھی پھینکتے ہیں تو وہ اُن کے اصحاب میں کوئی نہ کوئی ہاتھ پر لے لیتا ہے۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو اُن کا پانی لینے کے لیے اصحاب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کوئی حکم فرماتےہیں تو ان کے اصحاب اس حکم کی تعمیل کے لیے دوڑتے ہیں۔ جب وہ کلام کرتے ہیں تو ان کے اصحاب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں َ مزید برآں اصحاب اُنہیں بڑی الفت و محبت اور ادب کی نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

(صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۷۳۲)

<u>سنت نبوی میں بہت سی احادیث ہیں۔ جو مومن کی زندگی کے مختلف امور اور معاملات سے تعلق رکھتی ہیں:</u>

اس طرح رسول ﷺ کی سیرت مطہرہ میں مکہ اور مدینہ میں آپ کو جو کچھ پیش آیا او پیش آمدہ حالات و واقعات میں آپ نے جو طرز عمل اختیار کیایہ سب کچھ ایک مومن کے لیے اپنے اندر بہت سی ہدایات اور رہنمائی کے اُصول مہیا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ مختلف حالات سے گزرے۔ اور جب مومن ان کا استحضار کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ جو حالات اُس کو درپیش ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی صورتِ حال نبی کی سیرت میں موجود ہے۔ اس طرح اگر مومن سیرت کا گہرا فہم حاصل کرے گا تو وہ اس سے کسی

مسئلے کے بارے میں صحیح حل اور درست موقف نکال سکے گا۔ اور اُس کے لیےضروری ہوگا کہ اسی موقف کو اپنائے۔
بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی منشا یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے رسولؐ کو ایسے حالات و ظروف سے گزار دیا تاکہ مومن معلوم کر سکے کہ ایسے حالات و ظروف میں وہ اپنے نبی ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے کیا اور کیسے اقدامات کرے گا۔

رہنمائی کے لیے سیرتِ مُبارکہ سے چند مثالیں:

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق کی بنیادیں واضح کر دینے کے بعد اب اُسوۂ حسنہ سے ہمارے موضوع سے متعلق ایسی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو ایک طرف ایک مومن کے لیے روزمرہ معاملات اور مصائب اور پریشانیوں میں نمونہ ہیں تو دوسری طرف اُن میں حق و باطل کی کشمکش میں اہل حق کے لیے رہنمائی کا سامان موجود ہے۔
آپ ﷺ کو نبوت و رسالت کی گراں بار ذمہ داری سے پہلی بار آگاہ کیا گیا تو اس راہ کی مشکلات کا اندازہ آپؐ کو اُس وقت ہو گیا تھا۔ جب ورقہ بن نوفل نے یہ کہتے ہوئے حسرت و افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ''کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔ کاش! میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی'' ورقہ کی یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ کہ جس روز اللہ کے رسولؐ نے لوگوں کو ایک اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی اُس روز سے قوم کی نادانیوں اور ایذاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ آپؐ کی راہ روکی گئی، آپؐ کو جھٹلایا گیا۔ آپؐ کو ٹھٹھہ اور تضحیک سے رُسوا کرنے کی کوشش کی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ جب قریش کی اذیتوں کا ہدف بنے تھے اُس وقت آپ کے رفقا کو ابھی ان مصیبتوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:
''مجھے اللہ کے معاملے میں اس قدر ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اس قدر نہیں ڈرایا گیا۔ مجھے اللہ کے معاملے میں جس قدر اذیت سے دو چار کیا گیا کسی اور کو نہیں کیا گیا۔ میرے اوپر تیس تیس دن رات ایسے بھی آتے رہے کہ میرے اور بلالؓ کے پاس کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے سوائے اس معمولی شے کے جو بلال اپنی بغل میں چھپائے ہوتے۔''
(سنن ترمذی حدیث ۲۳۷۲)
یہ اُس ذات کی کیفیت ہے جس کو قرآن نے تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ انسانیت کا محسن بتایا ہے۔ لوگوں کی ہدایت و نجات کے لیے اپنی جان کو ہلکان کرنے والا کیا ہے۔ ۱۳ برس تک

قریش مکہ کی ایذاؤں کا ہدف بنے رہنے کے بعد بالاخر جب مظلومانہ جذبات سے بھرے دل کے ساتھ یہ رحیم و کریم انسان مکہ کو خیر باد کہتا ہے اور بے سروسامانی کے عالم میں مدینہ چلا جاتا ہے۔ تو یہ کشمکش مسلح جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور نبی کریم کی بقیہ زندگی اس کشمکش میں گزرتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری آزمائش اور دوسری کےبعد تیسری اور پھر یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لیتا۔

اجر اور انعام کی بشارت:

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں نے آپؐ سے پوچھا ''یا رسول اللہ ! سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے۔آپؐ نے فرمایا: انبیاء کی۔ پھر ان سے کم درجہ لوگوں کی۔ پھر اُن سے کم درجہ لوگوں کی۔ آدمی کی آزمائش اس کی دینی کیفیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر وہ دین میں مضبوط ہو تو آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر دین میں نرم ہو تو اُس کی دینی کیفیت کے مطابق ہی آزمائش ہوتی ہے۔ بندے پر آزمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کی ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ زمین پر چلتا ہے تو اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔'' (ترمذی)۔

مومن کا یہ ایمان ہے کہ دین کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات و تکالیف بہترین دروس اور مفید تجربات ہیں۔جو اُس کی شخصیت کو آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن بنا دیتے ہیں۔ اس کے ایمان کو جلا بخشتے ہیں اُس سے زنگ کو کھرچ ڈالتے ہیں۔

دُعا اور گریہ و زاری:

اپنے مقصد کو حاصل کرنے اور مصیبتوں اور تکلیفوں سے نکلنے کے لیے دُعا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔یہ مومن کا ہتھیار ہے۔ رسول اللہ نے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اللہ سے مدد و استعانت طلب کرے ۔آپؐ نے دُعا کا مقام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہی عبادت ہے۔ دُعا میں غفلت اور تساہل سے آپؐ نے منع فرمایا:

مصیبتوں اور تکلیفوں کے مواقع پر رسول اللہ مخصوص دُعائیں کیا کرتے تھے۔ ترمذی میں حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ نبی کے لیے جب کوئی معاملہ بڑا اہم ہو جاتا تو آپؐ آسمان کی طرف چہرہ بلند کر لیتے اور گڑگڑا کر دُعا کرنا مقصود ہوتا تو یا حَیُّ یا قَیّوم کہتے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی اکرم کو جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپؐ یوں دُعا کرتے:

يا حَـيُّ يا قَيّـومُ بِـرَحْمَـتِكِ أَسْتَـغـيث۔
"اے زندہ اور قائم ذات۔ میں تیری رحمت کے واسطے تیری مدد کا طالب ہوں"۔
حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ مصیبت کے موقع پر یوں دعا کرتے:۔ لا إله إلا الله رب العرش العظيم لا إله إلا الله رب السماوات السبع ورب العرش الكريم
(بخاری۔مسلم)
"اللہ بزرگ و برتر کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ ساتوں آسمان و زمین کے رب اور عرش کریم اور عرش عظیم کے رب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔
طائف سے واپسی پر اور عزوہ بدر کے موقع پر آپ کی دُعائیں آج بھی رہنمائی دیتی ہیں۔ عزوہ اُحد میں مسلمانوں کو بڑے زخم آئے تھے۔ رسول اللہ بھی اس موقع پر زخمی ہوئے اور آپ کو بھی دشمن کے سخت حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا صدمہ بھی اس غزوے میں آپ کو پہنچا۔ لیکن آپ نے شدائد و مصائب کے ان مواقع پر دُعا کے ذریعے اللہ کی مدد اور نصرت طلب کی۔ اور اللہ کی حمد و توصیف فرمائی۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب دشمنوں نے مسلمانوں کا محاصرہ سخت کر دیا تو اللہ کے رسولؐ مشرکین کے خلاف دُعا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور دعا فرمائی:
اللهم منزل الكتاب، سريع الحساب، اهزم الأحزاب، اللهم اهزمهم وزلزلهم.
"اے اللہ کتاب کے نازل کرنے والے، جلد حساب لینے کی قدرت رکھنے والے۔ ان لشکروں کو شکست سے دوچار کردے۔ اے اللہ اُن کو شکست دے دے اور اُن کے قدم اُکھاڑ دے"۔
دُعا عظیم عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے۔مومن پر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب وہ تفکر و تدبر سے عاجز ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے سامنے دستِ دُعا دراز کردے۔ پھر ادھر دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے ہاتھ نیچے آتے اور دُعا کے الفاظ کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو اُدھر رب العالمین کی طرف سے قبولیت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

اُمید و یقین سے سرشار ہونا:

مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ آزمائش و مصائب میں شدّت آجائے اوراسلام اور مسلمانوں پر پے درپے حملے ہونے لگیں تو حالات کی اصلاح اور تبدیلی سے مایوس و ناکامی اُس کے دل میں راہ پائے۔ راہِ خدا پر چلنے اور لوگوں کو اس طرف بلانے کی جدوجہد جس قدر تکلیف دہ اور صبرآزما تھی۔ رسول اللہ کو ذاتی حیثیت سے تو اس کا مکمل اور کامل ادراک تھا۔ آپؐ نے ہر مشکل موقع پر جس عزم و استقلال اور پامردی و ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا وہ آپ ہی کے شایانِ شان تھا۔

آپ اپنی دعوت کی کامیابی اور اسلام کی سربلندی کا یہ یقین اپنے صحابہ کے دلوں میں جا گزیں کرتے تھے۔ مشرق و مغرب تک اُن کا پیغام پہنچ جانے کی نوید سناتے تھے۔ اور مصائب و مشکلات کا جواں مردی اور جرأت مندی سے مقابلہ کرنے کا درس دیتے تھے۔

ایک موقع پر حضرت خبابؓ بن ارت کو جہاں دعوت کی سنگینی سے آگاہ فرمایا وہاں کامیابی کا یقین بھی دلایا اور فرمایا:''تم سے پہلے لوگوں کی حالت یہ تھی۔ کہ آدمی کو پکڑا جاتا۔ اُس کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا اور اُسے اُس زمین میں گاڑ دیا جاتا۔ پھر آرا لایا جاتا۔ اور اُس کے سر کے اوپر رکھ کر چیر کر دو حصے کر دیا جاتا۔ لیکن یہ چیز اُس کو اس کے دین سے ہٹا نہ سکتی۔ اللہ کی قسم! اللہ اس معاملے کو مکمل کرکے چھوڑے گا۔ یہاں تک کہ (ایک وقت آئے گا) سوا رصنعا سے چل کر حضر موت آئے گا تو اُسے اللہ کے سوا اور اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑئیے کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا مگر تم جلد بازی میں پڑ گئے ہو''۔

غزوۂ خندق کے روز مسلمانوں کو ہر طرف سے خطروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کٹھن اور سخت موقع پر اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کو خوش خبریاں سنائیں۔ فرمایا:۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ ضرور تم سے اس سختی کو دُور کر دے گا جو تم دیکھ رہے ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں بیت اللہ کا طواف کروں گا اور اللہ کعبہ کی کنجیاں مجھے دلا دے گا۔ اور کسریٰ اور قیصر کو ہلاک کر دے گا اور پھر تم اُن کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کروگے''۔

دعوتِ دین کے کارکنان اور قائدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس نبویؐ منہج و حکمتِ عملی کا دامن نہ چھوڑیں۔ مایوسی، پست ہمتی، بزدلی اور بددلی پھیلانے کےبجائے دلوں کو اُمید اور یقین سے سرشار کیا جائے۔

<u>عزم و استقلال اور ثابت قدمی:</u>

مصائب و مشکلات اور آزمائش کے مراحل میں مومن وسائل کے محدود ہونے اور کمزور ہونے کے باوجود گھبرایا نہیں کرتا۔ وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرکے راہِ خدا میں صبر و استقامت دکھاتا ہے۔ حق کی سربلندی کے لیے خواہ کیسے بھی حالات ہوں وہ عزم و استقلال اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نبی کریمؐ کے اسوۂ مبارک میں غزوۂ احد اور غزوۂ حنین کے معرکے اس کی نمایاں مثال ہیں۔

غزوۂ احد میں کفار نے پلٹ کر حملہ کیا تو اس کی شدت اس قدر تھی کہ بڑے بڑے جواں مرد اور صبری مسلمانوں کے لیے بھی میدان میں پاؤں جمانا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس وقت رسول اللہ صرف ۹ صحابہ کے ہمراہ پیچھے تشریف فرما تھے۔ حضور اکرم ؐکی حیات مبارکہ کی آزمائشوں کا یہ نازک ترین موقع تھا کہ اس معرکے میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپؐ کے ساتھ صرف دو صحابی رہ گئے تھے۔ حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے آپ کے دفاع میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔آزمائش کے اس نازک ترین موقع پر رسول اللہ پوری ثابت قدمی سے اپنی جگہ پر موجود تھے۔ اور بلند آواز سے لوگوں کو اپنی طرف بُلا رہے تھے۔ حالانکہ اُس وقت آواز دے کر بلانا اپنے بارے میں مشرکین کو خبر دینے کے مترادف تھا۔لیکن آپؐ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایسا کیا۔ اور صحابہ کو دوبارہ اپنے گرد جمع کیا اور مسلمان بالاخر دشمن کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

کچھ ایسی صورت حال غزوۂ حنین میں بھی پیش آئی۔ جونہی مسلمانوں نے طلوعِ فجر سے پہلے وادی میں قدم رکھا تو گھات میں بیٹھے دشمن نے اچانک اُن پر تیروں کی بارش کردی۔ پھر یکدم جتھوں کے جتھے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان سنبھل نہ سکے۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ کوئی کسی کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ پسپائی اور فرار کا یہ عالم تھا کہ ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا کہ اب ان کی بھگدڑ سمندر سے پہلے نہیں رُکے گی۔اس موقع پر رسول اللہ نے لوگوں کو پکارا۔لوگو! میری طرف آؤ میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں۔ اس شدید بھگدڑ کے باوجود آپؐ کا رُخ کفار کی طرف تھا۔ اور اپنے خچر کو ایڑ لگا رہے تھے۔ اور یہ فرما رہے تھے:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب اَنا بن عبدالمطلب

"میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں"۔

اس موقع پر آپؐ کے ساتھ چند صحابہ تھے لیکن ثبات و استقلال کا عالم دیدنی تھا۔

مشورہ اور رائے لینا:

مشاورت اگر شرعی طور پر مطلوب اور لازمی ہے تو مشکل مواقع پر یہ انتہائی لازم ہے۔ رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم دیا ہے کہ اہل ایمان سے مشورہ کر لیا کرو۔ وَشَاوَرهُم فی الامر (ال عمران آیت ۱۵۹) چنانچہ آپ نے ہر مشکل موقع اور دشوار اور کٹھن صورتِ حال میں صحابہؓ سےمشورہ کیا۔ اور بعض مواقع پر لوگوں کی متفقہ رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دی۔ واضح رہے کہ رسول اللہ کو مشاورت کا حکم اور اختیار صرف اُنہی اُمور میں دیا گیا تھا۔جن کے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو یا وہ خالصتاً دُنیوی اُمور ہوں۔

اس کی ایک نمایاں مثال عزوۂ بدر ہے۔مدینہ کے مسلمان کسمپرسی، بے سروسامانی اور بہت سے مسائل سے دوچار تھے۔ ایسے میں جنگ کا مسلط ہو جانا جب کہ بڑی تعداد میں لشکر کی آمد تھی، زندگی موت کا سوال تھا۔ اس نازک مرحلے پر آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور مختلف مراحل پر اُن سے رائے لی۔ مدینہ سے باہر نکل کر دفاع کا فیصلہ کیا۔ میدان بدر میں جب آپ نے اسلامی لشکر کو بدر کے قریب ترین چشمے پر بھڑایا تو آپ نے حضرت حبابؓ بن منذر کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دی۔ اور فرمایا '' تم نے بہت ٹھیک مشورہ دیا۔ اس کے بعد آپؐ لشکر سمیت اُٹھے اور آدھی رات کے وقت دشمن کے قریب ترین چشمے پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ اُسوہ رسولؐ میں اس حوالے سے بہت سی مثالیں سامنے آتی ہیں۔

صبر کا طویل سفر:

جیسا کہ ہم پچھلے صفحوں میں لکھ چکے ہیں کہ بعض لوگ صبر کو ایک منفی رویہ سمجھتے ہیں اور کمزوری و بے بسی اور ذلت و خواری کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ صبر نہیں ہے۔ بلکہ صبر تو قابل تعریف اوصاف اور مثبت رویوں کا نام ہے صبر اور ثابت قدمی لازم و ملزوم ہیں۔

اپنے نفس سے جہاد پر بھی صبر کرنا ہوگا۔ دوسروں سے جہاد پر بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ باطل سے ٹکرانے کے لیے بھی صبر ضروری ہے۔ دعوت حق کے راستے کی طویل مسافت بھی صبر کی متقاضی ہے۔ اس راہ کے نشیب و فراز بھی صبر ہی سے طے ہو سکتے ہیں۔

رسول اللہ کی ۲۳ برس کی داعیانہ زندگی صبر کی ایک دردناک داستان ہے۔ دیکھئے وہ شخص جو اپنی قوم سے صادق و امین کا لقب پا چکا ہو۔ اور قوم اُس کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہو۔ وہ جب کائنات کی

عظیم ترین صداقت قوم کے سامنے پیش کرے اور قوم اُس کو جھٹلا دے۔تو اس سے بڑی تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ معزز و محترم اور کعبہ کا متولی قبیلہ محض اس بنا پر تین سال کے لیے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا جائے۔کہ اس کے ایک فرد نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا ہے۔ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے کہ تین برس تک ان لوگوں کو انسانی ضروریات کی اشیاء فراہم نہ ہونے دی جائیں۔اور اُنہیں قوت لا یموت بھی میسر نہ آسکے۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی حق تلفی ہو سکتی ہے۔ کہ کعبہ کے حدودِ حرم کے اندر تو جانور بھی محفوظ و مامون ہوں۔ مگر محمد ﷺ کو وہاں بھی آزادانہ عبادت کی اجازت نہ ہو۔ اُن پر گندی اوجھڑی پھینکی جائے۔ اُن کا گلا دبایا جائے۔اُن سے بدکلامی کی جائے۔کیا یہ نہایت تکلیف دہ امر نہیں کہ حقیقی چچا کے بیٹے آپکی بیٹیوں کو اپنے نکاحوں سے خارج کرکے آپؐ کے گھر بھیج دیں۔ اور وجہ صرف آپؐ کی دعوتِ دین ہو۔ طائف کا واقعہ کسے یاد نہیں ہے اور اس واقعے میں رسول رحمت کے منہ سے نکلے الفاظ بھی سب کو یاد ہونے چاہئیں کہ ''نہیں اے اللہ! نہیں!انہیں تباہ نہ کرنا۔ یہ نہیں تو اُن کی اولاد میں سے کوئی تیرا نام لیوا ہوگا''۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی مصیبتوں، تکلیفوں، ابتلاؤں اور آزمائشوں سے لبریز ہے۔ ان تمام لمحات میں صبر آپ کا اوڑھنا بچھونا رہتا ہے۔ اور آپ قرآن کے اس بیان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰي مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ

(الانعام۔۳۴)

" تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں ، مگر اس تکذیب پر اور اُن اذیتیوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں ، انہوں نے صبر کیا ، یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں"۔

دعوت،دعوت، دعوت:

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے مخالفین کی طرف سے تحقیر و تضحیک کی ایک کھلی جنگ کا سامنا کیا۔ قتل و تعذیب سے دوچار ہوئے۔ ہجرت کے عمل سے گزرے۔ مال و اسباب سے محروم ہوئے۔ غرض کوئی ایسی تکلیف باقی نہیں رہ گئی تھی جو آپؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نہ پہنچائی گئی ہو۔ حتیٰ کہ آپ کو جھوٹ بولنے والا،

مجنون، دیوانہ اور جادوگر کہا گیا (نعوذ باللہ) اور اس پر بھی بس نہ کی۔ بلکہ مخالفین نے عداوت کی آخری حد تک پہنچنے کے لیے آپؐ کو راستے سے ہٹانے کی دھمکی دے دی۔
پھر معاملے کی نزاکت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ اور آپؐ کے قتل کا عملی منصوبہ مشرکین مکہ کی مجلس میں منظور ہوتا ہے۔ اور رات کے اندھیرے میں اس پر عمل درآمد بھی کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھا۔
اس سارے عرصے میں دشمن اپنا کام کرتا ہے اور آپؐ اپنا ۔دشمن نے اپنے ہتھکنڈے آزمائے اور آپ نے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا اور ان مخالفتوں کی پراہ کیے بغیر قوم کی مجلسوں میں جاکر اور ایک ایک فرد کو مل کر اپنی دعوت پیش کی۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ کہا کرتے کیا کوئی شخص مجھے سوار کرکے قوم کے پاس نہیں لے جائے گا؟ (تاکہ میں اُنہیں دعوت دوں) کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کا کلام لوگوں تک پہنچانے سے روک رکھا ہے۔
رسول اللہ اپنے راستے کی ان تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے محوِ سفر رہے۔ اور اُنہوں نے اپنے عزم کو شکستہ نہ ہونے دیا۔ یہ بات داعیان دین کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہنی چاہیے۔ کہ دعوت اُس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جبتک اس کی راہ میں روحوں کو گھُلا نہ دیا جائے۔ دعوت کی نصرت و تائید کے لیے عزم کی شدت سے بڑھ کر کوئی چیز اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ قوتیں صرف کیے بغیر اور قربانیاں دئیے بغیر دعوت، نظریات و خیالات تک محدود ہوگی۔ جو کتابوں میں رقم اور مقررین کی تقریروں میں موجود ہوتی ہے۔ مگر ایسی دعوت کوئی تبدیلی اور انقلاب پیدا نہیں کرسکتی۔
سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے یہ چیز روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے اپنے جسم وجان سے لے کر دُنیاوی ساز و سامان تک ہر چیز کو اسلام کے اوپر نچھاور کر دیا۔اور ایک بھرپور حکمت عملی اپنائی۔
(ترجمان القرآن ،اگست 2007ء ، ص:34تا45رہنمائی حاصل کی گئی)
انسانیت کے اس محسن نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیاتِ انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ان فرقوں اور عناصر کو پہچانا جونظام حیات پر حاوی تھیں۔ اس قیادت کو زیر نظر رکھا۔ جو جاہلی تمدن کی گاڑی چلا رہی تھی۔اسے دلائل کے ساتھ دعوت بھی دی۔اُس پر تنقید بھی کی اور اسے چیلنج بھی کیا۔ تاریخ کے دھارے پر نگاہ رکھی۔ حالات و واقعات کی ایک ایک لہر پر توجہ دی۔ہر واقعے کو قائدانہ بصیرت اور سیاسی شعور کے ساتھ دیکھا۔ کہ وہ کس پہلو سے اصلاح

کی مہم کے لیے مفید ہے۔ اور کس پہلو سے خلاف جاتا ہے۔ معاشرے کے جملہ عناصر پر توجہ رکھی کہ دعوت کے لیے کسی موقع پر کس سے کیا اُمیدیں کی جا سکتی ہیں۔اپنی قوت اور رفقاء کو حریفوں کی قوت و رفتار کے مقابل میں ملحوظ رکھا۔ ہر اقدام کے لیے صحیح ترین وقت کا انتظار صبر سے کیا۔ اور جب موزوں گھڑی آتی تو جرأت سے قدم اُٹھا دیا۔رائے عام کے ہر مدوجزر کا کامل فہم حاصل کیا۔ اور مخالفین کے ہر پروپیگنڈے کا مقابلہ کرکے اُن کے اثرات کو توڑا۔اپنے اصولوں کی کڑی پابندی کی۔ مگر آنکھیں بند کرکے نہیں بلکہ احوال و ظروف کو دیکھا۔ وقت کی مصلحتوں کو سمجھا۔ اور حکیمانہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا۔ جہاں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا۔آگے بڑھایا۔آگے بڑھنا جب موزوں نہ دیکھا تو قدم روک لیا۔ دو بلائیں سامنے آگئیں تو ایک سے بچ کر دوسری سے مقابلہ کیا۔جنگی کاروائی کی ضرورت پڑی تو دریغ نہیں کیا۔مصالحت کی راہ ملی تو دستِ صلح بڑھادیا۔اور پھر کمال یہ کہ اس ساری جدوجہد میں خدا پرستی کی روح اور اخلاقی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ اُن کو مسلسل نشوونما دی۔ اس پورے طریق کار کو اگر قرآن اور سیرت پاک کے اوراق سے اخذ کرکے سامنے رکھیئے تو وہ فرق بیّن طور پر معلوم ہو جائے گا۔جو مذہب اور دین میں، وعظ اور انقلابی دعوت میں، انفرادی تزکئیے اور تمدنی تحریک میں ہوتا ہے۔

حضور نے چونکہ ایک مکمل دین کو برپا کرنے کے لیے تحریک برپا کی تھی۔ اس لیےآپؐ نے ایک ایک سلیم الفطرت افراد کو تلاش کیا۔ اور پھر جس کےسینے میں بھی کلمۂ حق کی شمع روشن ہو گئی تو اُسے ایک تنظیم میں پرودیا۔ اس کی تربیت کی۔اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا۔اور پھر جس مرحلے مینجتنی منظم قوت حاصل تھی اُسے اپنی قیادت کے تحت جاہلی نظام کےخلاف معرکہ آراکیا۔فکری میدان میں بھی، سیاسی میدان میں بھی۔ اور بالاخر جنگ کے میدان میں بھی۔

جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہوئے اُن کو آپ نے صوفی اور درویش نہیں بنایا۔ راہبوں اور جوگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا۔ بدی سے بھاگنے والا اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت و اقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت اُنہیں نہیں دی۔وہ لوگ جری اور بے باک، باشعور اور بصیرت مند، خوددار اور غیور، ذہین اور زیرک، فعال اور متحرک،پیش رو اور تیزگام تھے۔

تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظام فلاح پنپ سکا ہو۔ اور بغیر سیاسی کشمکش

کے محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصطلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہوا ہو۔ خلافتِ راشدہ کے بعد گزشتہ ۱۳ صدیوں میں وعظ و ارشاد، تبلیغ و تذکیر اور تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے ادارات کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں لیکن اس کے باوجود نہ اُس حد مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہو سکا ہے اور نہ کبھی معاشرے کی اتنی اصلاح ہو سکی ہے کہ جس کے نتیجے میں اجتماعی نظام بدل جائے۔ اور محمد رسول اللہؐ کا انقلاب دوبارہ رونما ہو جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ طرزِ فکر اور نقشۂ کار اور نظریۂ انقلاب میں کوئی بڑا جھول ہے۔ وہ جھول یہی ہے کہ قیادت کی تبدیلی کے لیے سیاسی کشمکش کیے بغیر افراد کو نظامِ تمدن سے منقطع کرکے دعوت کا مخاطب بنایا جاتا رہا ہے۔ (محسن انسانیت از نعیم صدیقی صفحہ۳۹ تا ۴۳)

رسول اللہ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اللہ کے دین کی طرف دعوت اور اُس کا نفاذ تھا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الصف:9)

"اور ہمارے لیے رسول کریمؐ کی یہ وہ سب سے بڑی سنت ہے جس کا اتباع ہم پر لازم ہے"۔

لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا برپا ہونا تو اصل مطلوب نہ تھا اور یہ محض انعام خداوندی کے طور پر یکایک بیچ میں آنمودار ہوا۔ تو وہ حضورؐ کے کارنامے اور آپؐ کی جدوجہد کی سخت ناقدری کرتے ہیں۔ اور حضورؐ کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی عظمت پر غبار ڈال دیتے ہیں۔

یہاں موقع نہیں۔ ورنہ پھر وہ ساری جدوجہدجو میثاقِ مدینہ سے شروع ہو کر یہودیوں، منافقین، مشرکین کی سازشوں کی بیخ کنی کرتے ہوئے فتح مکہ پر منتج ہوئی۔ کی تفصیلات سامنے رکھ دیتے۔ اور بتاتے کہ آخر لوگ اس سارے کام میں قائدانہ بصیرت، سیاسی مہارت، اور مضبوط حکمت عملی کے حیرت ناک شواہد سے کس طرح صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خدا کا انعام تھا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس معنی میں کہ ہر بھلائی خدا کا انعام اور عطیہ ہوتی ہے۔ تاہم انسانوں کو کوئی انعام جبھی ملتا ہے کہ وہ اس کے لیے ضروری محنت، عقل و بصیرت کے ساتھ کر دکھائیں۔

بدقسمتی سے حضورؐ کے کارنامے کا یہ سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا ہے کہ آج حضورؐ کی دعوت اور نصب العین کے صحیح تصور کا ادراک مشکل ہو گیا ہے۔ اس پہلو کو جب تک پوری سیرت میں سامنے

نہ رکھا جائے۔ وہ فرق سمجھ میں آہی نہیں سکتا۔ جو محدود مذہبیت اور دین کے وسیع تصور میں ہے۔حضورؐ پورا دین لائے تھے۔ حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے۔ خدا کے قوانین کو عملاً جاری کرنے آئے تھے۔ اور جس طرح کسی اور پہلو میں حضورؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا اس طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی آپؐ کا کوئی ہم سر نہیں۔ اور جس طرح آپ زندگی کے ہر معاملے میں اسوہ و نمونہ ہیں۔ اس طرح اس جدوجہد میں بھی آپؐ کی ذات ہمیشہ کے لیے اسوہ و نمونہ ہے۔

حضورؐ کا کارنامہ یہ ہے۔ کہ آپ نے نیکی کی دعوت دی۔ نیکی کے غلبے کے لیے جدوجہد کی۔ اور ایک مکمل نظام قائم کردیا ۔

(محسن انسانیت نعیم صدیقی صفحہ نمبر ۳۹ تا ۴۴)

سیرتِ صحابہ

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی سنت کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کو بھی دانتوں سے پکڑے رہنے کی تلقین اور تاکید فرمائی ہے:
عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔
اس طرح حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت ہے:
قَالَ : وَحَدَّثَنَا قَالَ : وَحَدَّثَنَا سُنَيْدٌ ، ثنا مُعْتَمِرٌ ، عَنْ سَلامِ بْنِ مِسْكِينٍ ، عَنْ قَتَادَةَ ، قَالَ : قَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: "مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُتَأَسِّيًا فَلْيَتَأَسَّ بِأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؛ فَإِنَّهُمْ كَانُوا أَبَرَّ هَذِهِ الأُمَّةِ قُلُوبًا وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا وَأَقْوَمَهَا هَدْيًا وَأَحْسَنَهَا حَالا ، قَوْمًا اخْتَارَهُمُ اللَّهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وإقامة دينه، فَاعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوهُمْ فِي آثَارِهِمْ ؛ فَإِنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيمِ" حوالہ:جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر، بَابُ مَا تُكْرَهُ فِيهِ الْمُنَاظَرَةُ وَالْجِدَالُ...
(ترمذی)
"جس شخص نے کسی کی پیروی کرنی ہو تو وہ محمد رسول اللہ کے صحابہ کی پیروی کرے کیونکہ پوری اُمّت میں اُن کے دل سب سے زیادہ نیک تھے۔ اُن کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا۔ وہ بہت کم تکلّف کرتے تھے او رنیکی کرنے میں سب سے بڑھ کر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے نبی کی صحبت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے چُن لیا تھا۔ لہٰذا اُن کے مقام و مرتبے کو پہچانو اور اُن کے نقش قدم پر چلو کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔"
ان روایتوں سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ قدوسیوں کا یہ پورا گروہ ہی ہدایت کی سیدھی شاہراہ پر تھا۔ اور ان لوگوں کی سیرت ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔ وہاں ان روایتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ اس گروہ میں سے خلفائے راشدین کی سنت اور سیرت اور اُسوہ کو ایک خصوصی اور برتر حیثیت حاصل ہے۔ اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ یہ خصوصی اور برتر حیثیت اسے حاصل ہی ہونی چاہیے۔ تھی۔ ایک تو یہ حضرات گروہ صحابہ میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے اُن کے عملی نقوش زندگی کے ہر میدان میں ثبت ہیں۔ چنانچہ راشدین مہديين ہونے کے باعث اُنہی کی سنت بعد کے مسلمانوں کو کامل رہنمائی دےسکتی ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کی صحبت کے لیے منتخب فرما لیا تھا۔اُن کے دلوں کا امتحان لے کر اُن کو اپنے نبی کا مددگار اور وزیر بنا لیا۔ (استیعاب ۱ ۔صفحہ۔۶)
یہ حضرات پہلے ہی بہت سی صلاحیتوں کے حامل تھے لیکن جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور رسولؐ کی غلامی کو قبول کیا تو دُنیا جانتی ہے۔ کہ ان کی صلاحیتوں میں اور زیادہ جِلا پیدا ہوئی۔اور وہ ایسے عظیم اوصاف کے مالک بن گئے۔ کہ ان اوصاف کے لوگ نہ ان سے پہلے زمین پر آباد ہوئے اور نہ اس کے بعد دوبارہ دیکھے گئے۔ گویا جاہلیت کے بہتر لوگ اسلام کے بہترین لوگ بن گئے۔خیارھم فی الجاہلیہ خیارھم فی الاسلام (بخاری) یہی لوگ تھے جو آپؐ کے دین کے ایسے دیوانے ہو گئے کہ سیدنا حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ۷۰ صحابہ کرام کو دیکھا اُن کا لباس زیادہ تر اُون کا ہوتا تھا۔اگر تم اُن کو دیکھتے تو تم اُنہیں پاگل اور مجنون کہتے اور اگر وہ تمہارے اچھوں کو دیکھتے تو کہتے کہ اُن کا دین میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ یہ لوگ یومِ حساب پر ایمان نہیں رکھتے۔اور سیدنا علیؓ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسولؐ اس اُمت کے بہترین لوگ تھے اُن کے دل بہت اچھے تھے اُن کا علم بڑا گہرا تھا۔ اور وہ ہر قسم کے تکلفات سے دور تھے۔ (حلیۃ الاولیا لابی نعیم۔۱ صفحہ ۳۰۵)

<u>سیدنا علیؓ اصحاب رسول کے بارے میں فرماتے ہیں:</u>

''بخدا میں نے رسول اللہؐ کے صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ آج کوئی چیز ان جیسی نہیں، وہ خالی ہاتھ، پراگندہ اور ژولیدہ بال اور غبار آلود ہو کر صبح کرتے تھے۔اُن کی آنکھوں سے آنسو ایسے گرتے تھے کہ اُن کے کپڑے بھیگ جاتے تھے (**حتٰی تبل ثیابھم**) بخدا آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے غفلت میں رات گزاری ہے ۔
(البدایہ و النہایہ:٦/٨)

<u>اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک روز اپنے زمانے کے لوگوں سے فرمایا:</u>

''تم نماز، روزہ میں اصحاب رسول سے زیادہ ہو، تم اُن سے زیادہ مجاہدہ کرتے ہو، لیکن وہ تم سے بہت بہتر تھے'' لوگوں نے پوچھا '' کس وجہ سے'' فرمایا '' وہ دُنیا سے بہت زیادہ بے رغبت تھے اور آخرت کے بہت زیادہ مشتاق تھے'' ھُم کانوا ازھد فی الدنیا وارغب فی الاخرہ۔(حلیۃ الاولیا ٣٦/١)
وہ جس مہم پر بھی جاتے تھے ہمیشہ کامیاب ہو کر آتے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے اُن کا پیشہ رہزنی اور ڈاکہ زنی تھا۔ اُن کی پیشانیاں

سینکڑوں خداؤں کے سامنے جھکتی تھیں۔لیکن جب سرکار دو عالمؐ نے اُن کے دل و دماغ میں توحید کے جذبات پیدا کیے تو اُن میں حقیقی خدا پرستی جو آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوتی ہے آگئی۔ اب اُن کے فکر و ذہن میں اللہ کی بڑائی کا احساس جاگ اُٹھا۔ اور اُن کا وجود حق تعالیٰ شانہ کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو گیا۔ پھر ان کا ہاتھ، اُن کا پاؤں، اُن کی آنکھ، اُن کی زبان اور اُن کے تمام اعضا و جوارح صرف اور صرف اللہ تعالٰی کے وظائف ادا کرنے لگے۔اب اُن کی پوری ہشتی اس دُعا کی عملی تفسیر بن گئی۔ جو رکوع و سجود میں پڑھنے کے لیے ہمیں تلقین کی گئی ہے۔

اللّٰهُمَّ خَشَعَ لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ وَعَظْمِیْ وَعَصَبِی ۔

"اے اللہ تیرے لیے جھک گیا میرا کان، میری آنکھ، میرا مغز، میری ہڈی، اور میرے اعصاب"۔ (پیغمبر اسلامؐ اور غزوات و سرایا حکیم محمود احمد ظفر صفحہ ۱٦ و ۱۷)

قرآن مجید اور اُسوۂ حسنہ کے بعد صحابہ کرام کی سیرت کا مطالعہ ایک اہم دینی ضرورت ہے۔ صحابہ کرام وہ مقدس گروہ ہے جن کی تربیت رسول اللہ جیسے مربیّ نے خود فرمائی۔ یہ وہ لاثانی مقدس گروہ تھا۔ جن کا دل و دماغ نہایت پاکیزہ اور مطہر تھا۔ جس کا احساس و شعور انتہائی صاف و شفاف تھا۔ ان کے احساس اطاعت گزاری نے اُن کے لیے عمل کو بھی نہایت درجہ آسان کردیا۔ خدا کے احکام اُن کے لیے بوجھ بننے کے بجائے ہلکے پھلکے اور حد درجہ آسان ہو گئے۔ قرآن کی تعلیمات ان کے نفوس میں اس طرح اُتر گئیں کہ ان کی زندگیاں اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ بن گئیں۔آئیے ہم یہاں اُن کی زندگیوں کے چند اوراق کا مطالعہ کریں۔

صحابہ اور قرآن:

صحابہ کرام قرآن کی تلاوت اور اس میں تدبر اس غرض کے لیے نہیں کرتے تھے کہ اپنی معلومات کو بڑھائیں یا ادبی ذوق کو تسکین دیں۔ یا ذہنی تفریح کا سامان مہیا کریں۔ ان میں سے کوئی فرد بھی کبھی اس غرض کے لیے قرآن نہیں سیکھتاتھا کہ وہ علمی اور قانونی رموز و مسائل میں اپنے سابقہ علم کے اندر اضافہ کرنا چاہتا تھایا کسی بھی پہلو سے اپنی علمی کسر کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرتا تھا۔ تاکہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس کی انفرادی زندگی کے بارے میں مالک الملک نے کیا ہدایات دی ہیں۔ جس معاشرے کے اندر وہ سانس لے رہا ہے اُس کی اجتماعی زندگی کے لیے کیا احکام ہیں۔اس برگزیدہ جماعت کا ہر فرد میدان جنگ میں لڑنے

والے سپاہی کی مانند اللہ تعالیٰ کے احکام موصول ہوتے ہی ان پر بلا چون و چرا کاربندہو جاتا تھا۔ وہ ایک ہی نشست میں قرآن حکیم کی کئی سورتیں نہیں پڑھ ڈالتا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اس طرح اُس کے کندھوں پر یکدم بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دس آیات کی تلاوت کرتا، اُنہیں حفظ کرتا اور اُن کو عملی زندگی پر نافذ کرتا۔ اس طریقۂ تعلیم کی تفصیل ہمیں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی ایک حدیث سے ملتی ہے۔ اس روایت کو حافظ ابن کثیر نے اپنے مقدمہ تفسیر میں نقل کیا ہے۔
(جادہ و منزل، سید قطب شہیدصفحہ ۷۹ تا ۸۸)

آپؐ ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے صحابہ سے قرآن سننا پسند فرماتے جو قرآن کے حافظ اور تجوید و حسن قرأت سے متصف تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا ''رسول اللہؐ نے مجھے فرمایا: ''مجھے قرآن سناؤ'' میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں قرآن پڑھوں۔حالانکہ قرآن آپ پر نازل کیا گیا ہے'' آپؐ نے فرمایا '' میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں''۔ابن مسعودؓ کہتے ہیں میں نے سورۃ النساء کی آیات پڑھیں حتیٰ کہ میں وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا تک پہنچا تو میں نے دیکھا آنحضورؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں ۔ (صحیح بخاری و مسلم)

امام بخاری نے حضرت انس بن مالک کی سند کے ساتھ بیان کیا کہ اُنہوں نے کہا'' نبیؐ نے ابی بن کعبؓ سے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قرآن کی قرأت تم سے سنوں۔ اُنہوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں اُنہوں نے کہا رب العالمین کے ہاں میرا ذکر کیا گیا؟ آپؐ نے فرمایا ''ہاں'' تو اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (فتح الباری) رسول اللہؐ ابوموسیٰ اشعری کی آواز پر تعجب فرمایا کرتے آپؐ نے اُن کی اس خوبی کے باعث اُنہیں آلِ داؤد کی مزامیر سے تشبیہ دی۔ اسی طرح سے حضورؐ نے صحابہ سے قرآن سنا۔

(سیرت رحمتِ عالمؐ۔ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری صفحہ ۷۸۴)۔

دل بیدار کی ضرورت:

آج ہمارے ہاتھوں میں بھی وہی قرآن ہے جو صحابہ کرام کے پاس تھا اُنہیں تو اس قرآن نے ایک بے مثال گروہ بنا دیا۔ لیکن ہم۔۔۔؟آج ہمارے اندر ان جیسے نمونے اور کردار کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ کیا آج قرآن کی تاثیر ختم ہو گئی ہے؟۔۔۔ نہیں ہر گز نہیں، قرآن کی تاثیر ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ دل بیدار نہیں ہیں جن کے اندر یہ تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکارنہیں کہ قرآن کی طرف رجوع کی صورت میں ہی ہم

اس پریشان کن صورت حال کو ختم کر سکتے ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر یا اس کو نظر انداز کرکے کوئی ذریعہ اور طریقہ ایسا نہیں جو اُمت کی اصلاح اور تبدیلی میں بنیادی کردار ادا کر سکے اور مطلوبہ نتائج فراہم کرے۔
(ترجمان القرآن لاہور جون ۲۰۱۶ مضمون تلاوت قرآن کا بنیادی تقاضا از ارشاد الرحمٰن صفحہ۔۵۰)

جاہلیت سے مکمل لا تعلقی:

عہد رسالت میں ایک شخص جب حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا تو وہ اپنے دورِ جاہلیت کو یک قلم ترک کر دیتا تھا۔ یہ صحابی کی شان تھی۔ کہ دائرہ اسلام میں قدم رکھتے ہی وہ یہ محسوس کرتا کہ وہ کتاب حیات کا ایک ورق اُلٹ رہا ہے اور ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے جو گزشتہ جاہلی زندگی سے مختلف ہے۔ وہ جاہلی زندگی کی تمام معلومات کو شک و شبہ اور خائف نگاہوں سے دیکھتا۔اُس پر یہ خیال طاری رہتا کہ یہ تمام ناپاک اور پلید کام تھے۔ان میں اور اسلام میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔پھراس احساس اور قلبی دھڑکن کے ساتھ وہ اسلام کی طرف لپکتا تاکہ وہاں سے نورِ ہدایت حاصل کرے۔اور اگر کبھی اُس کا نفسِ امارہ غالب آجاتا یا ترک شدہ عادات کی کشش اُس پر غالب آجاتی یا اسلام کے احکام کی تعمیل میں اس سے کوئی تساہل ہو جاتا۔ تو وہ احساس گناہ ولعزش سے بے چین ہو جاتا اور فوراً توبہ کرتا۔ وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے گناہ کی تلافی اور روح کی تطہیر کی ضرورت محسوس کرتا اور دوبارہ قرآنی ہدایت کے مطابق مکمل طور پر ڈھل جانے کے لیے کوشاں ہوتا۔
دامنِ اسلام میں پناہ لینے کے بعد اُس کی کیفیت یہ ہو جاتی تھی۔ کہ اُس کے جاہلی اور نئی اسلامی زندگی کے درمیان کامل انقطاع واقع ہو جاتا تھا۔ یہ انقطاع پورے شعور اور سوچے سمجھے فیصلے کے تحت ہوتا۔ اس کے نتیجے میں اردگرد کے جاہلی معاشرے کے ساتھ اُس کے تمام اجتماعی روابط ٹوٹ جاتے وہ اپنی تمام کشتیاں جلاکر اس جذبہ و ولولہ کے ساتھ اسلام کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ ہو جاتا کہ جاہلی ماحول کے ساتھ اُس کا ایک ایک رشتہ کٹ جاتا۔
یہی وہ فیصلہ تھا جو اُس کی شاہ راہ حیات کو دوسری تمام راہوں سے الگ کر دیتا تھا۔اس فیصلے کے بعد وہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیتا تھا۔ اس سفر میں اگر کسی بوجھ سے صحابی کو سامنا تھا تو وہ آزمائش و اذیت تھی۔ جو جاہلیت کے ہاتھوں اُسے پہنچتی تھی لیکن وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ہر امتحان اور ہر صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے اور راہ حق پر گامزن رہنے کا عزمِ صمیم کر چکا

ہوتا تھا۔اس لیے جاہلیت کے تصورات اور جاہلی معاشرے کی روایات کا دباؤ اس کی سخت جانی پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے تھے۔(جادہ و منزل سید قطب شہیدؒ صفحہ۸۹، ۹۰) (اس کی مثالیں ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ مرتب)

کردار کی درخشانی:

حضورؐ کے کارنامہ کا ایک مبہوت کر دینے والا یہ پہلو بڑا ہی اہم ہے کہ انسان اندرون سے بدل گیا اور یکسر بدل گیا۔ کلمۂ حق کے اثر سے معاً خدا پرست اور بااصول انسان اُبھر آیا۔ اور یہی وہ انسان تھے جن کو ہم صحابہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان انسانوں کے کردار کی درخشانی دیکھئے تو آنکھوں میں چکا چوند آجاتی ہے۔حضرت عمرؓ جیسا مکہ کا ایک تُند خو لااُبالی نوجوان بدلا تو کہاں پہنچا۔ فصالہ میں تبدیلی آئی۔ تو کس شان سے آئی۔ ذوالبجادین کو دیکھیے کہ کس طرح دولت و آسائش کو لات مار کے درویشانہ زندگی اختیار کرتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ کو لیجئے کیا انقلابی جذبہ ہے کہ کعبہ میں کھڑے ہو کر جاہلیت کو چیلنج کیا۔اور خوب مار کھائی۔ کعب بن مالک کا کردار دیکھئے۔ ابو خثیمہؓ کا رنگ ملا حظہ فرمائیے۔ لُبینہ اور سمیّہ جیسی کنیزوں کی انقلابی شجاعت و عزیمت پر نگاہ ڈالئیے، ماعز بن مالک اسلمی اور غامدیّہ پر توجہ کیجئے۔ نجاشی کے دربار میں جعفر طیارؓ کی جرأت سے سبق لیجئے، ایرانی سپہ سالار کے دربار میں ربعی بن عامر کی شان استغنا سے روح اخذ کیجئے۔اور تاروں کے اس جھرمٹ میں کون ہے جس کا ایمان لمعہ افگن نہیں ہے۔

ان ہستیوں سے وہ معاشرہ بنا اور ایسے قائدین اور کارکنوں کے ہاتھوں وہ نظامِ حق چلا جس نے اگر بندشِ شراب کی منادی کردی۔ تو ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے فوراً الگ ہو گئے۔اور بہترین شرابوں کے مٹکے گلیوں میں لنڈھا دئیے گئے۔ جس نے اگر جہاد کے لیے پکارا تو نو عمر لڑکے تک ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کریہ کوشش کرتے دکھائی دے کہ وہ لوٹا ئے جانے سے بچ جائیں۔ جس نے اگر چندہ طلب کیا توجہاں حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند تاجروں نے سامان لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں لا کر کھڑی کر دیں اور حضرت ابوبکرؓ جیسے فدائیین نے گھر کی ساری متاع تحریک کے قدموں میں ڈال دی۔ وہاں ایسے مزدور بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی مزدوری سے حاصل شدہ کھجوریں جنگی فنڈ میں دے کر دامن جھاڑ دیا۔ جس نے اگر مہاجرین کی بحالی کے لیے انصار کو پکارا تو اُنہوں نے اپنے مکان اور کھیت اور باغ آدھوں آدھ بانٹ دئیے۔اور اخوت کا ایک بے مثل سماں پیدا کر دیا۔ جس

نے اگر عہدوں کو خدمت کی روح سے بالاتر کرکے سرکاری عہدوں کے لیے کارکن طلب کیے۔ تو ایک درہم روزکے قلیل معاوضے پر گورنری کے فرائض انجام دینے والے حکام دُنیا کے سامنے نمودار کر دئیے۔ جس نے اگر مالِ غنیمت کو سپہ سالار کے پاس جمع کرانے کا حکم دیا۔ تو اس شان سے تعمیل کی گئی۔ کہ فوج ایک ایک سوئی اپنے افسر کو پیش کر دیتی تھی۔اور یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں درخشاں رہے گا۔ کہ مدائن کے اموال کا ایک قیمتی حصہ عامر نامی سپاہی کے ہاتھ میں آتا ہے اوربغیر اس کے کہ کسی کو بھی اس خزانہ زروجواہر کا علم ہو وہ رات کی تاریکی میں چپکے سے اپنے سردار کو پہنچا دیتا ہے۔

(محسن انسانیت از نعیم صدیقی صفحہ ۵۹، ۶۰)

غزوۂ احد میں حضورؐ کے مٹھی بھر رفقاء نے جس سرفروشانہ محبت اور والہانہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اُس کا تصور بھی رہتی دُنیا تک عالمِ اسلام کو اپنی روح مقدس سے مالا مال کرتا رہے گا۔ حضورؐ کے رفقا آپ کی ہستی پر رسول ہونے کی حیثیت سے بھی پروانہ وار فدا ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہ شعور رکھنے کی وجہ سے بھی کہ آپؐ کا وجود تحریک کی جان ہے۔ آپؐ کی زندگی کے تحفظ، آپؐ کی عزت کی بلندی اور آپ کے اثر و رسوخ کی توسیع کے لیے جانیں نثار کرتے تھے۔ حضورؐ کی سچی محبت کے لازوال نقوش اُنہوں نے میدان اُحد کے قرطاس پر ثبت کیے ہیں۔

دشمن کے دَل کے دَل نے جب ہجوم کیا۔ تو سرور عالمؐ کی صدا گونجی۔ ''کون مجھ پر جان قربان کرتا ہے''۔زیادؓ بن سکن چند انصاریوں کے ساتھ بڑھے اور یکے بعد دیگرے سات جان نثاروننے اپنے آپ کو نثار کر دیا۔ ان میں ایک زیادؓ ہے جن کو نیم جان حالت میں لایا گیا۔ تو آخری قوت سے کام لے کر اُنہوں نے اپنا سر آگے بڑھا کر حضورؐ کے قدموں سے مَس کرایا۔ جب حضورؐ پر وار ہوا تو ام عمارۃؓ لپک کر حضورؐ کے سامنے آگئیں اور بہت گہرا زخم کندھے پر لیا۔ اُنہی کے حائل ہونے کی وجہ سےیہ وار حضورؐ کے حق میں اوچھا ہو گیا۔ ابودجانہؓ نے آپ کو اپنے جسم سے ڈھانپ لیا۔ اور اپنی پیٹھ کو سپر بنا دیا جس پر کتنے ہی تیر آکے پیوست ہوگئے۔ طلحہؓ نے دشمن کی تلواریں ہاتھوں پر روکیں اور اُن کا ایک ہاتھ کٹ کر گر گیا۔طلحہؓ حضورؐ کے سامنے سپر لیے کھڑے رہے۔ ساتھ ہی اس جوش سے ناوک اندازی کی۔ کہ دو تین کمانیں ٹوٹ گئیں۔ پھر ایک نمونہ تھا جو سعد بن ربیعؓ نے پیش کیا۔ جنگ کے خاتمے پر جب اُن کو تلاش کیا گیا تو ایک طرف جسد جاں بلب پڑا تھا۔ آخری لمحے حضورؐ کے لیے

سلام شوق اور دُعائے محبت کا ہدیہ بھیجا۔ نیز ساتھیوں کو بطور وصیت پیغام دیا۔ کہ اگر نبیؐ تک دشمن کا ہاتھ پہنچ گیا۔ اور تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہوئی۔ تو پھر بارگاہ الٰہی میں تمہاری کوتاہی کا کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔ نہ اپنے کرب کا خیال، نہ اعزہ و اقربا کی فکر، نہ مال و جائیداد کے مستقبل پر کوئی کاوش۔لے دے کے خیال ہے تو نصب العین کا اور حضور کا۔ (ایضاً ۴۲۴، ۴۲۵)

نہ صرف مردوں بلکہ مسلم خواتین نے معرکۂ اُحد کے سلسلے میں ایمان، شجاعت، صبر اور تحریک کی وفاداری کا بے مثال مظاہرہ کیا۔
ہم نے اوپر بیان کیا کہ کس طرح اُم عمارہؓ نے ایک عورت ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضورؐکے لیے سپر بنا دیا۔ ہند نامی ایک انصاریہ کے لیے یہ آزمائش بہت کڑی تھی۔ کہ اُن کے باپ، بھائی اور شوہر سبھی اسلام پر نثار ہو گئے تھے۔ لیکن اُنہوں نے ان سارے زخموں کو حوصلہ مندی سے کلیجے پر لے کر بار بار یہی دریافت کیا ‘‘کہ کیا خدا کے رسولؐ صحیح سلامت ہیں’’ جب اُن کو ادھر سے اطمینان ہوا تو پکار اُٹھیں کل مصیبۃ بعدک جلل۔یعنی آپ سلامت ہیں تو پھر کوئی مصیبت بھاری نہیں سب گوارا ہے۔(ایضاً صفحہ ۴۲۷)

یاسرؓ جو حضرت عمارؓ کے والد تھے وہ بھی ظلم سہتے سہتے شہید ہوگئے۔

صہیبؓ بھی عمارؓ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔اُن کو اس بے دردی سے مارا جاتا تھا کہ دماغی توازن بار بار درہم برہم ہوجاتا۔ دورِ ہجرت میں قریش نے اس شرط پر مدینہ جانے کی اجازت دی۔ کہ اپنا سارا مال و اسباب دے جائیں۔ اُنہوں نے بخوشی منظور کیا اور خالی ہاتھ نکل گئے۔

ابو فکیہہؓ جہنی: صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے اور اسلام لانے میں حضرت بلالؓ کے ہم عصر۔اُمیہ کو اطلاع ہوئی۔تو پاؤں میں رسی ڈلواکر لوگوں سے کہا کہ تپتی ریت پر لٹانے کے لیے گھسیٹ کر لے جاؤ۔راستے میں ایک گبریلا دکھائی دیا۔ تو اُمیہ نے اُن سے کہا۔ کہ ‘‘یہی تو تیرا خدا نہیں’’ اُنہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ کہ ‘‘میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے’’۔ اس پر اُمیہ نے اتنے زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ لوگ یہ سمجھے کہ دم نکل گیا۔ مگر بچ گئے۔ ایک بار اتنا بھاری پتھر اُن کے سینے پر لاد دیا کہ بےحال ہو جانے کی وجہ سے زبان باہر نکل آئی۔کبھی اُن کو لوہے کی بیڑیاں پہنا کر جلتی زمین پر اُلٹا لٹایا جاتا۔اُن کو بھی حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کرادیا۔

لبینہؓ ایک کنیز تھیں حضرت عمرؓ جو اُس وقت ایمان نہیں لائے تھے۔ اُس کو نہایت ظالمانہ طریق سے مارتے،تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کھاکر نہیں بلکہ تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑ دیا ہے۔
حضرت عثمانؓ جو عمر کے لحاظ سے بھی قابل احترام تھے اور مال و جاہ رکھتے تھے۔ جب اسلام لائے تو اُن کے اپنے چچا نے رسی سے باندھ کر پیٹا۔
حضرت ابوذرؓ نے اسلام لاتے ہی کعبہ میں اعلان کر دیا۔ قریش ٹوٹ پڑے اور مارتے مارتے آپ کو زمین پر لٹا دیا۔
حضرت زبیرؓ بن العوام کو اسلام کی سزا دینے کے لیے ان کے چچاچٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتے تھے مگر وہ پوری عزیمت سے فرماتے ''میں کفر تو اب ہر گزنہیں کروں گا''۔
حضرت ام شریکؓ ایمان لائیں تو ان کے اعزہ و اقارب نے اُنہیں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کرایا۔اس حالت میں وہ اُن کو کھانے کے لیے روٹی کے ساتھ شہد دیتے اور پانی نہ پلاتے تاکہ حِدّت کا دوگونہ عذاب بھگتیں۔ تین دن مسلسل اس عالم میں گزر گئے۔ انتہائی کرب کے لمحوں میں اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ اسلام کو چھوڑ دو اُن کے حواس اس درجہ متاثر ہو چکے تھے کہ وہ اس بات کوسمجھ تک نہ سکتی تھیں۔پھر ظالموں نے آسمان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ خدائے واحد کا انکار کرو۔ جب وہ مدعا سمجھ گئیں تو کہا ''خدا کی قسم میں تو اپنے عقیدہ پر قائم ہوں''۔
حضرت خالدؓ بن العاص کے قبول اسلام پر اُن کے باپ نے اس قدر مارا کہ سر زخمی ہوگیا۔ اُن کو فاقہ کا عذاب بھی دیا گیا۔
غرضیکہ کون تھا۔ جسے اس بھٹی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ جور و استبداد کا انتہائی مظاہرہ وہ بھی تھا۔ جو اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ حضرت عمرؓ (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) نے روا رکھا۔
ایک طرف اس زہرہ گداز تشدد کو دیکھئے اور دوسری طرف حضورؐ کے رفقا کی استقامت ملاحظہ فرمائیے۔ کہ مرد، عورتیں اور غلام اور لونڈیاں جو بھی اس مئے حق سے سرشار ہوگیا۔ پھر اس کا قدم پیچھے نہیں ہٹا۔ مظالم کسی ایک فرد کو بھی ارتداد کی راہ پر نہ ڈال سکے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۴)
یوں تو اسلام کی دعوتِ عام کی ابتدا کے ساتھ ہی تشدد کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ مگر پانچ چھ برس کے اندر اندر گویا مکہ نئے نظامِ امن و رحمت کے علمبرداروں کے لیے ایک گرم بھٹی بن گیا۔ اور یہ بھٹی حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کی وفات کے بعد اپنی آنچ کے لحاظ

سے پورے جوبن پر آگئی۔ کوئی نہ تھا جو اس بھٹی میں نہ تپایا گیا ہو۔ مگر خوب اچھی طرح جل جل کر، تپ تپ کر اور پگھل پگھل کر اسلام کے یہ جانثار اور رسولؐ کے یہ رفقا کھرا سونا ثابت ہوئے۔آپؐ کے رفقا پر جو کچھ بھی بیتی ہے اُسے تاریخ کے ذریعے ہم پوری طرح کہاں جان سکتے ہیں۔ تاہم تاریخ کے پڑھنے سے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں ہم اس کا ایک بالکل ہی مجمل تذکرہ کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔

خبابؓ بن الارت تمیمی:

جاہلیت کے دور میں غلام بناکر بیچ ڈالے گئے تھے۔ اور اُمِ نَمار نے اُن کو خریدا تھا۔ یہ اُس وقت ایمان لائے۔ جب کہ خانۂ ارقم اسلامی تحریک کا مرکز تھا۔ قریش نے جلتے انگارے بچھا کر اُن کو اس بسترِ آتشیں پر لٹایا۔ اور چھاتی پر ایک شخص کھڑا ہوگیا۔ تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ انگارے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔ بعد میں خبابؓ نے حضرت عمر کو ایک مرتبہ پیٹھ دکھائی تو برص کی طرح کے سفید داغ اس پر نمایاں تھے۔

حضرت بلالؓ بن رباح حبشی:

اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب سورج ٹھیک نصف النہار پر آجاتا۔ تو عرب کی تپتی ریت پر اُن کو لٹایا جاتا۔ اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ اُمیہ اس حالت میں اُن سے کہتا کہ اسلام سے باز آجاؤ۔ ورنہ اس طرح ختم ہو جاؤگے۔ حضرت بلالؓ جواب میں صرف ''احد احد'' پکارتے۔ اُمیہ کا غصہ اور بھڑک گیا اُس نے آپؓ کے گلے میں رسی ڈال کر شہر کے لونڈوں کو ساتھ لگا دیا۔ وہ آپ کو گلی گلی گھسٹیتے پھرے لیکن یہ ''عاشق جانباز'' اُسی طرح ''احد احد'' پکارتا پھرتا۔کبھی آپ کو گائے کی کھال میں لپیٹا جاتا، کبھی آہنی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُمیہ بن خلف سے ایک غلام کے عوض میں خرید کر آزاد کر دیا۔

عمارؓ بن یاسر قحطانی الاصل تھے :

اُن کے والد یاسر یمن سے اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ ایک گم شدہ بھائی کی تلاش میں آئے تھے۔ دو بھائی تو واپس چلے گئے۔ اور یاسرؓ ابو خذیفہ مخزومی سے حلیفانہ تعلقات قائم کرے مکہ میں ہی رہ پڑے۔اور یہیں شادی کرلی۔یاسرؓ سمیت سارا ہی گھرانہ اسلام لے آیا۔ چونکہ عمار بن یاسر کا کوئی قبیلہ مکہ میں نہ تھا۔ اس لیے اُن پر خوب ستم ڈھائے جاتے۔ اور اُنہیں قبول اسلام کے جرم کی سزا یوں دی

جاتی کہ اُن کو بھی جلتی زمین پر لٹا یا جاتا۔ اور قریش اُن کو اتنا مارتے کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے۔ اُن کے والدین کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ پانی میں اُن کو غوطے بھی دئیے جاتے اور انگاروں پر بھی تڑپا یا جاتا۔ حضورؐ اُن کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر خاص دُعا کرتے اور بشارت دیتے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرماتے کہ عمارؓ سر سے پیر تک ایمان سے بھرا ہوا ہے۔

سمیہؓ جو حضرت عمارکی والدہ تھیں اُن کو اسلام لانے پر ابوجہل نے نہایت وحشیانہ طریقے سے برچھی مار کر شہید کر دیا۔ یہی اولین خاتون ہے جو راہِ حق میں شہید ہو گئی۔

حضور نے عزوۂ احد کے متصلاً بعد بنو ہذیل کے لوگوں کی خواہش پر چھ آدمیوں کا ایک وفد اسلام کی تعلیم دینے کے لیے روانہ کیا۔ راستے میں چار کو دھوکے سے شہید کر دیا گیا۔ اور حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ بن دثنہ کو قیدی بناکر مکہ لے جایا گیا۔

(سیرت ابن ہشام جلد دوئم صفحہ ۲۹۶ تا ۲۹۹)

جُحیر نے حضرت خبیبؓ کو عُتبہ بن عامر کے لیے لیا تاکہ اُن سے حارث کا بدلہ لے لے۔ جسے حضرت خبیبؓ نے میدانِ بدر میں موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اور حضرت زیدؓ بن دَثنہ کو صفوان بن اُمیہ نے اپنے باپ اُمیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنے کے لیے خریدا۔اب یہ لوگ ان بے بس قیدیوں کی جان لے کر اپنی کینہ کی آگ کو بجھانا چاہتے تھے۔

دو قیمتی جانوں کو اگر چہ شہادت کا پیالہ پلا دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر دونوں کے کرداروں کا ایسا واضح تقابل ہو گیا کہ اس کے اثرات وقت کی تاریخ کے رگوں میں پھیل گئے۔

حضرت زیدؓ بن دثنہ: کو صفوان نے اپنے غلام کے سپرد کیا۔ کہ وہ حرم کے باہر تنعیم میں جاکر اس کا کام تمام کردے۔ وہاں پہلے سےقریش کا ایک مجمع موجود تھا۔ اور اُن میں ابوسفیان بہ نفس نفیس شریک تھا۔ ابوسفیان نے قریب ہو کر زیدؓ سے پوچھا کہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے اور تم اپنے مال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہو سہو اور تمہارے بجائے ہم محمد کا خاتمہ کر دیں۔''زیدؓ جس کے سامنے موت کھڑی مسکرا رہی تھی ایمان کی کن بلندیوں سے جواب دیتا ہے:۔

واللہ! ہم لوگوں کو تو اتنی ہی بات کے عوض بھی آزاد ہو کر اپنے اہل و عیال میں جا رہنا پسند نہیں کہ اس وقت محمد جہاں ہیں وہاں بھی اُن کو ایک کانٹا تک چبھے۔ (سیرت ابن حشام ،جلد3،ص164)

ابو سفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا اور پکار اُٹھا کہ میں نے کسی کو کسی کا ایسا محبّ نہیں پایا۔ جیسا کہ محمدؐ کو اُس کے رفیق محبوب رکھتے ہیں۔پھر اس مجسمۂ صدق و وفا کو تلوار کا لقمہ بنا دیا گیا۔
حضرت خبیبؓ بعد تک قید میں رہے۔ قید میں رہ کر اُنہوں نے اپنے ایمان و اخلاق کی جو جھلک متواتر دکھائی۔ اُس کا ایک واضح نتیجہ تو یہ ہوا کہ جحیرکی لونڈی ماویہّ بعد میں اسلامی تحریک میں جذب ہوگئی۔ اور اس کے ذریعے حضرت خبیبؓ کی رودادِ اسیری سامنے آئی۔ ماویّہ کا بیان ہے کہ اُن کے قتل کا مقررہ وقت جب قریب آلگا۔تو اُنہوں نے صفائی کے لیے اُسترہ منگوایا جو بجھوا دیا گیا۔ مگر بعد میں یہ دیکھ کر زمین میرے پیروں تلے سے نکل گئی کہ اُسترہ اُن کے ہاتھ میں ہے اور چھوٹا بچہ خبیبؓ کی گود میں بیٹھا ہے۔ جس قیدی کو اس ظالمانہ طریق سے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہو۔ اور اُس کے قابو میں دشمن کا ایک بچہ آجائے اور ہتھیار بھی اُس کے ہاتھوں میں ہو تو جو اندیشے ہو سکتے ہیں ظاہر ہیں۔میرے اضطراب کو خبیبؓ نے بھانپ لیا اور اطمینان دلایا کہ میں کسی حال میں اس معصوم کی جان نہیں لینے کا۔ اُنہوں نے فوراً لڑکے کو الگ کر دیا یہ ہے بلندئ کردار۔
پھر اُن کو صلیب پر چڑھانے کے لیے تنعیم لے جایا گیا وہاں پہنچ کر اُنہوں نے اجازت لے کر آخری نفلی نماز پڑھی پھر جلد ہی فارغ ہو کر کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت کے ڈر سے نماز میں تاخیر کر رہا ہوں اور مختصر دُعا کے بعد صلیب پر لٹکا دیئے گئے۔ اور آخر میں ابومغیرہ نے حربہ مار کر اُن کو شہید کر دیا۔ عین اس آخری لمحے میں اُن کی زبان پر کچھ اشعار آئے جس میں سے مشہور ترین کا ترجمہ یہ ہے:
'' میں جب اسلام سے مالا مال ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو پھر مجھے اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ خدا کی راہ میں مجھے کس کروٹ گرنا نصیب ہو رہا ہے''۔(محسن انسانیت از نعیم صدیقی صفحہ ۳۶۴ تا ۳۶۶)

فضائل صحابہ:

اُن کی صداقتِ ایمانی پر قرآن کی فیصلہ کن شہادت:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔
(انفال۔۷۴)

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

اُن کے مقبول بارگاہ اور جنتی ہونے پر قرآن کی شہادت:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(سورہ توبہ۔۱۰۰)

"وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ اُن کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ، یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

اُن کا اخلاص فی الایمان:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(المجادلہ۔۲۲)

"تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے ، خواہ وہ ان کے باپ ہوں ، یا اُن کے بیٹے ، یا اُن کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے اُن کو قوت بخشی ہے۔ وہ اُن کو ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اِن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا ، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار ر ہو اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک بات اُصولی ہے اور دوسری امر واقعی کا بیان۔اُصولی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دین حق پر ایمان اور اعدائے دین کی محبت دو بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ جن کا ایک جگہ اجتماع کسی طرح قابل تصور نہیں ہے۔

یہ تو ہے اصولی بات۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اصول بیان کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ اس امر واقعی کو بھی مدعیان ایمان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش فرما دیا ہے کہ جو لوگ سچے مومن تھے انہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے تمام ان رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ ان کے تعلق میں حائل ہوئے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو بدر و احد کے معرکوں میں سارا عرب دیکھ چکا تھا۔ مکہ سے جو صحابہ کرام ہجرت کر کے آئے تھے وہ صرف خدا اور اس کے دین کی خاطر خود اپنے قبیلے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے لڑ گئے تھے۔ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو قتل کیا۔ حضرت مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمر نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابو بکر اپنے بیٹے عبدالرحمان سے لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن الحارث نے عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حضرت عمر نے اسیران جنگ بدر کے معاملہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کردیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔ اسی جنگ بدر میں حضرت مصعب بن عمیر کے سگے بھائی ابو عزیز بن عمیر کو ایک انصاری پکڑ کر باندھ رہا تھا۔ حضرت مصعب نے دیکھا تو پکار کر کہا " ذرا مضبوط باندھنا، اس کی ماں بڑی مالدار ہے، اس کی رہائی کے لیے وہ تمہیں بہت سا فدیہ دے گی ''۔ ابوعزیز نے کہا " تم بھائی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو؟ " حضرت مصعب نے جواب دیا " اس وقت تم میرے بھائی نہیں ہو بلکہ یہ انصاری میرا بھائی ہے جو تمہیں گرفتار کر رہا ہے "۔ اسی جنگ بدر میں خود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے داماد ابو العاص گرفتار ہو کر آئے اور ان کے ساتھ رسول کی دامادی کی بنا پر قطعاً کوئی امتیازی سلوک نہ کیا گیا جو دوسرے قیدیوں سے کچھ بھی مختلف ہوتا۔ اس طرح عالم واقعہ میں دنیا کو یہ دکھایا جا چکا تھا کہ مخلص مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہوا کرتا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد پنجم ، صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷)

اُن کے اوصاف تورات و انجیل میں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔوَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڗ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَــظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۔

(الفتح۔۲۹)

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں ، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہؓ)وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سُجود ، اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پائو گے۔ سُجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی صفت (تمثیل) توراۃ میں اور انجیل میں اُن کی مثال یُوں دی گئی ہے ،کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل (سوئی) نکالی پھر اس کو تقویّت دی، (سہارا دیا)پھر وہ گد رائی، (سخت ہوئی) پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفّار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے "۔

کفار پر اصحاب محمدؐ کے سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ درشتی اور تندخوئی سے پیش آتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں۔ وہ موم کی ناک نہیں کہ اُنہیں کا فر جدھر چاہیں۔ موڑ دیں۔ وہ نرم چارہ نہیں ہیں۔ کہ کافر انہیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں۔اُنہیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا۔ اُنہیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا۔کافروں میں یہ طاقت نہیں کہ اُنہیں اُس مقصد عظیم سے ہٹا دیں جس کے لیے وہ سردھڑ کی بازی لگا کر محمد ﷺ کا ساتھ دینے کیلیے اُٹھتے ہیں۔ اُن کی سختی جو کچھ بھی ہے دشمنان دین کے لیے ہے۔ اہل ایمان کے لیےنہیں ہے۔ اہل ایمان کے معاملے میں وہ نرم ہیں۔ رحیم و شفیق ہیں۔ہمدرد وغمگسار ہیں۔ اُصول اور مقصد کے اتحاد نے اُن کے اندر ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہم رنگی و سازگاری پیدا کردی ہے۔

تورات میں سجود کے اثرات اُن کے چہروں پر سے مراد خداترسی، کریم النفسی، شرافت اور حسنِ اخلاق کے وہ آثار ہیں جو خدا کے آگے جھکنے کی وجہ سے فطرتاً آدمی کے چہرےپر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کامنشا یہ ہے کہ محمد ﷺکے یہ ساتھی تو ایسے ہیں۔کہ اُن کو دیکھتے ہی ایک آدمی بیک نظر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہ خیر الخلائق ہیں۔کیونکہ خدا پرستی کا نور اُن کے چہروں پر چمک رہا ہے۔ یہ وہی چیز ہے۔ جس کے متعلق امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ جب صحابہ کرام کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیح کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے یہ تو اُسی شان کے لوگ ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد پنجم، صفحہ ۶۳ تا ۶۴)

ضیاء العمری "قرآن مجید نے (سورہ فتح آیت ۲۹ میں) اس انداز میں آپ کے اصحاب کی صفت بیان کی ہے۔ یہ وہ مثالی نسل ہے۔ جس نے روحانی اور اخلاقی ارتقا میں بہت بلند معیار قائم کیا۔ عبادت نے اُنہیں صیقل کیا۔ رکوع و سجود نے اُنہیں نورِ جمال سے ڈھانکا۔ عقیدے نے اُن کے مفاہیم، اقدار، اطاعت، وقار، سادگی اور معصومیت کو جلا بخشی (أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ)انہوں نے دوستی اور غیروں سے دشمنی سکھائی۔ (أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ) (المائدہ:54)یہ سعی ہے جسے آسمانی کتابوں نے دوام بخشا ہے۔ اور تورات، انجیل اور قرآن نے اس حیرت انگیز وصف کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اس کی اقدار کی وسعت، عقیدے کی اشاعت، معاونین کی کثرت، اس کے وجود کی قوت، اس کے دین کی گرفت کی مثال اس کھیتی سے دی گئی ہے۔ جو شاخیں نکالتی ہے پھیلتی ہے، بڑھتی ہے۔ اور اس کا تنا مظبوط ہو جاتاہے۔ سرور کرتی ہے بونے والے مالکوں کو، اور غصہ دلاتی ہے دشمنوں کو۔مالک بن انسؒ کے ہاں ایک شخص کا ذکر کیا گیا جو صحابہ رضوان اللہ علیھم کی عیب جوئی کر رہا تھا۔ تو امام مالک نے یہ آیات تلاوت کیں حتیٰ کہ جب وہ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ تک پہنچے تو انہوں نے کہا۔ ''لوگوں میں سے جن کے دل میں رسول اللہؐ کے اصحابؓ کے بارے میں عناد ہوا وہ اس آیت کا مصداق ٹھہرا"۔

(سیرت رحمت عالم از ضیاء العمری صفحہ ۸۲۲، ۸۲۳)

یہ وہ نسل ہے جس نے رسالت پہنچائی۔ اور اپنی امانت ادا کی۔ اور قرآن و سنت کی حفاظت کی۔ اس لیے اکثر علماء کی رائے ہے۔ کہ صحابہ کی نسل میں طعن، ان مصادر میں طعن ہے جن سے ہم نے قرآن و سنت حاصل کیا ہے۔ اور نتیجتاً وہ دین میں طعن ہے۔ یہ نسل مطلقاً دیگر تمام نسلوں سے بڑھ کر اپنی بہتری اور افضلیت کے ساتھ

موصوف ہے۔ جیسا کہ مصطفیؐ نے خبر دی ہے۔ '' لوگوں میں سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر جواس کے قریب ہے اور پھر جو اُس کے قریب ہے۔ بلاشبہ تمہارے بعد لوگ خائن ہونگے۔امانت دار نہ ہوں گے۔شاہد ہوں گے شہید نہ ہوں گے نذریں مانیں گے، پوری نہ کریں گے اور موٹاپا اُن میں ظاہر ہوگا ۔ (امام بخاری)

صحابہ کی نسل کی یہ برتری مسلمانوں کے لیے ہر زمان و مکان میں عمدہ نمونہ ہے۔وہ ان کی طرف دیکھتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں اُن کے اعمال کی پیروی کرتے ہیں اُن کی سیرتوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ جنگ و امن میں، عبادت میں، مجاہدہ اور معاملہ میں متنوع سیرتیں ہیں جو مسلمانوں کے لیے مختلف زمانوں میں صالح پیروی کیلیے یہ مختلف نمونے کافی ہیں۔ جنگ میں صحابہ کو ایمان کے ساتھ اللہ سے اجر کی امید رکھنے والے ثابت قدم مجاہد پاؤگے قرآن نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ اُن کی صفت بیان کی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔اَلَّذِيْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِيْمَانًا ڰ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (ال عمران۔۱۷۲ و ۱۷۳)

"(ایسے مومنوں کے اجر کو) جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا ۔ اُن میں جو اشخاص نیکو کار اور پرہیز گار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔جن سے لوگوں نے کہا کہ : '' تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں اُن سے ڈرو '' تو یہ سن کر اُن کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ : '' ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کار ساز ہے"۔

وہ زمانۂ امن میں رہنمائی کرنے والے مسلم اور باعمل مصلح تھے۔رسولؐ نے اُن کی تعریف کی ہے۔ کہ وہ آپ کی اُمت کے امین ہیں۔ میری اُمت کے امین کا مطلب ہے کہ وہ ان کے محافظ ہیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم رہنے والے اور اس کے اوامر کا التزام کرنے والے ہیں اور مسلمانوں کے لیے دُعا کرنے والے ہیں۔اور اُنہوں نے اپنے جان، مال اور زبان کے ساتھ دشمن کی حمایت کی ہے۔ اس لیے رسول اللہ نے ہر زمانے اور ہر مکان کے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے۔ کہ وہ اُن کی توقیر کریں۔اُن سے محبت کریں اور اُن کا احترام کریں۔ اور اُن کو ایذا دینے اور اُن کے بارے میں جارح زبان استعمال کرنے اور اُن کے خلاف جرأت کا مظاہرہ کرنے سے منع

فرمایا ہے۔ صحیحین میں ہے ‘‘ میرے اصحاب کو گالی نہ دو۔ اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کےایک مد یا اس کے نصف کے برابر بھی نہ ہوگا۔(بخاری و مسلم) یعنی ان کی فضیلت اور برتری کے ادنیٰ درجے تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔
رسول اللہ ؐ نے اپنے متعدد صحابہ کو جنت کی بشارت دی ہے اور فرمایا:
‘‘ہاں ابوبکر جنت میں، عمر جنت میں، عثمان جنت میں، علی جنت میں، طلحہ جنت میں، زبیر جنت میں، سعد بن مالک جنت میں، عبدالرحمان بن عوف جنت میں اور سعید بن زید جنت میں’’۔
(ترمذی، بخاری و مسلم)
ان کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم کی نسل کے سوا کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا لیکن صحابہ فضیلت اور مقام میں برابر نہ تھے۔ بلکہ وہ ایمان میں سبقت اور جہاد کی راہ میں کثیر خرچ کے باعث ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے تھے۔
(ایضاً صفحہ ۸۲۴ و ۸۲۵)

مواخات میں مہاجرین و انصار کا ایثار:

لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔
(حشر۔۸تا۹)

"(نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔(اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دار الہجرت میں مقیم تھے۔ یہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے اُن کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں"۔
اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مدینہ طیبہ کے انصار کی تعریف کی ہے۔ مہاجر جب مکہ اور دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے ان کے شہر

میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں یہ پیش کش کی کہ ہمارے باغ اور نخلستان حاضر ہیں، آپ انہیں ہمارے اور ان مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ لوگ تو باغبانی نہیں جانتے، یہ اس علاقے سے آئے ہیں جہاں باغات نہیں ہیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اپنے ان باغوں اور نخلستانوں میں کام تم کرو اور پیداوار میں سے حصہ ان کو دو؟ انہوں کہا سمعنا و اطعنا (بخاری، ابن جریر)۔ اس پر مہاجرین نے عرض کیا ہم نے کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جو اس درجہ ایثار کرنے والے ہوں۔ یہ کام خود کریں گے اور حصہ ہم کو دیں گے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ سارا اجر یہی لوٹ لے گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہو گے، تم کو بھی اجر ملتا رہے گا **(مسند احمد)**

(تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۳۹۵)

یہ تھے صحابہ کہ جن کی سیرتوں پر ہم سب کو ناز ہے۔ شجاعت و دلیری، بہادری و عزیمت، حیا و استغنا، انفاق و سخاوت، قربانی و ایثار، امانت و دیانت کے پیکر۔

اخوت، رفاقت اور صحبت صالح

دعوتِ حق کا منشا انسانی زندگی کو نظامِ مقسط کے سانچے میں ڈھالنا اور تمدن میں عملاً عدل و توازن پیدا کرنا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں تو بلکہ اس مقصد کے لیے آہنی اسلحہ (حدید) استعمال کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ اور اس طرح سورہ صف کی ایت ۹ میں رسول اللہ کی بعثت کی غایت کفار و مشرکین کی مخالفت کے باوجود دین کا غلبہ اور اقامت ہے۔ یہ مدعا اگر دعوتِ حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں سے آتے۔ کس مقصد کے لیے کونو انصار اللہ کی صدائے عام ہوتی۔

در حقیقت حضورؐ کو جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا اور اس کی اصلاح اُس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔حضورؐ نے انسان کو تمدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اُس کی نجی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ (محسن انسانیت نعیم صدیقی صفحہ ۴۳ تا ۵۰)

دین اسلام اور پھر اس پر عزیمت، یہ راہ مشکلات سے بھری پڑی ہے۔ انسان تنہا اس راہ میں زیادہ عرصہ استقامت نہیں دکھا سکتا۔ ہم خیال ساتھی اور رفیق اس کٹھن راہ کو طے کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ ان سے مشکلات سے گزرنے میں مدد اور معاونت حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان کی ہمت و قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب حالات نامساعد ہوتے ہیں تو دوسروں کی عزیمت و استقامت ہمت بندھاتی ہے۔ اس لیے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔

(التوبہ۔۷۱)

اور سورہ الحجرات میں تو : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

(الحجرات۔۱۰)

کہہ کر اخوت کے رشتے میں جوڑا گیا ہے۔ عقیدہ اور فکر کی یگانگت اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ مسلمانوں میں اخوت و محبت ہونی چاہیے۔ اور وہ ایک دوسرے کے لیے رحم اور مواسات کے رشتے سے جڑے ہوئے ہوں۔ چنانچہ حدیث میں اس کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔''تم اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو''۔ (مسلم)

ہم خیال ساتھیوں کی رفاقت کتنی ضروری ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ کو جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ۔

(الکھف۔۲۸)

"اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو"۔

انسان میں عزم و ہمت پیدا کرنے کے لیے مردانِ حق کی معیت اور رفاقت بہت ضروری ہے۔ یہ معیت اور رفاقت ذہنی طور پر بھی حاصل کی جاتی ہے اور عملی طور پر بھی۔ ذہنی طور پر اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ اُن لوگوں کی سیرتوں کا برابر مطالعہ کیا جاتا رہے۔ جنہوں نے راہِ حق میں مصیبتیں جھیلی ہیں جنہوں نے اعلیٰ اقدار کی طلب میں دُنیا کی جھوٹی عزتوں اور شہرتوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ جو نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کے لیے یکہ و تنہا اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے عزم و حوصلہ سے اُنہوں نے دوسروں کے لیے اس راہ پر چلنا آسان کر دیا ہے۔ جنہوں نے باطل کے غوغائے عام میں حق کا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور پھر یا تو باطل کو مغلوب کر لیا ہے۔ یا اس سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنا نقشِ قدم ایک نشانِ ہمت کی حیثیت سے یادگار چھوڑا ہے۔ اسلام میں کئی ایسے فتنے نمودار ہوئے کہ چند افراد کی استقامت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو ثابت قدم رکھا۔ علی بن المدینی ؒ فرماتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے اس دین کو فتنہ ارتداد کے موقع پر ابوبکر صدیق کے ذریعے اور فتنہ خلق قرآن کے دورِ ابتلا میں احمد بن حنبلؒ کے ذریعے عزت دی۔ (سیر اعلام النبلاء جلد ۱ صفحہ ۔۹۶)ایسے لوگوں کے حالات زندگی کا مطالعہ آدمی کے اندر ہمت پیدا بھی کرتا ہے اور پیدا شدہ ہمت کو برقرار بھی رکھتاہے۔ قرآن اولعزم پیغمبروں کی جدوجہد اور حق کی تڑپ اور اس راستے میں اُنکے صبر جمیل کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ عملی طور پر اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو ایسے لوگوں کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو اس راہ میں اُس کی راہ نمائی کر سکیں۔ اور اگر راہ نمائی نہ کر سکیں تو کم از کم رفاقت ہی کا حق ادا کر سکیں۔ جب تک یہ دُنیا قائم ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک خیر کے طالب کو ساتھی اور رہنما نہ

مل سکیں۔شرط صرف یہ ہے۔ کہ آدمی خلوص کے ساتھ تلاش کرے۔ اور جب پا جائے۔ تو ان کی معیت و رفاقت حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے لیے آدمی کو گھر بار اورملک و وطن بھی چھوڑنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔ یہ خدا کی راہ میں اُس کی ہجرت ہوگی اور ہجرت کا اصلی مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے۔ کہ ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر ایک ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر ایک سازگار ماحول تلاش کیا جائے ۔یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام تک کا یہ حال رہا ہے کہ اُنہوں نے اچھے ماحول اور اچھے ساتھیوں کے لیے دُعائیں کی ہیں۔ اور اُن کے حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی بازیاں کھیلی ہیں۔ حالانکہ انبیاء علیھم السلام اپنی عزیمت و استقامت کے اعتبار سے بجائے خود ایک عالم رہے ہیں۔ اُنہوں نے دوسروں کو اپنی حرارت سے گرمی پہنچائی ہے۔ کبھی دوسروں سے حرارت حاصل کرنے کے محتاج نہیں ہوئے۔ اور اپنی ذات سے ماحول کو روشن کیا ہے کبھی ماحول سے روشنی کی ضرورت اُن کو پیش نہیں آئی ہے۔ (تزکیۂ نفس۔امین احسن اصلاحی صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۷)

ہم سفر قوی بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی۔ لیکن ان کی قوت اور کمزوری دونوں ہی آدمی کے لیے سہارا بنتی ہے۔ جب کبھی وہ ہمت ہارنے لگتا ہے تو قوی کی عزیمت اُس کی ہمت بندھاتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اپنی خستگی اور توانائی کو دیکھکر وہ مایوس ہونے لگتا ہے۔ تو دوسرے خستگانِ راہ کو دیکھ کر اُسے تسلّی ہو جاتی ہے۔کہ تنہا وہ اس راہ کی صعوبتوں سے دوچار نہیں ہے---- بلکہ کچھ اور درماندگان راہ بھی ہیں۔ اور اس طرح وہ کبھی کسی کی قوت اور کبھی کسی کی کمزوری سے سہارا لیتا ہے۔ اور دوسروں کو سہارا دیتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

یہ رفاقت اُستاذ اور تحریکی قائد سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہم مسلک اور ہم مشرب ساتھیوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جن کو عملاً ساتھ لینا ممکن ہو اُن کو عملاً اپنے ساتھ لگائے یا اُن کو ساتھ چلے اور جن کے صرف کارناموں اور سرگزشتوں سے روحانی غذا حاصل کرنا ممکن ہو۔ اُن سے ذہنی و روحانی روابط بڑھائے۔ اس طرح وہ کبھی تنہائی یا دل شکستگی نہیں محسوس کرے گا۔

(ایضاً صفحہ ۱۲، ۱۳)

نیکی کی راہ اختیار کرنا ہے تو خدا کے نیک اور بزرگ بندوں کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔ اور حدیث کے مطابق ان نیک بندوں کی نشانی یہ ہے کہ اُن کی صحبت میں آپ کو آخرت کی یاد آئے۔ رسول

اللہ ﷺ نے ہمیں آگاہ فرمایا کہ آدمی کا دین اور طور و طریق دراصل وہی ہوتے ہیں جو اُس کے دوستوں کے ہوں۔ اس لیے آدمی کو اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے۔۔ کہ وہ کن لوگوں سے دوستی اور محبت رکھتا ہے۔حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے:

سمع النبی ﷺ یقول لا تصاحب الا مومناً۔

"کہ تم کسی مومن ہی کو اپنا ساتھی بناؤ "۔

(ترغیب و ترہیب)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ ہم نشین کیسے ہوں یعنی ہم کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں۔آپؐ نے فرمایا :

من ذکرکم اللہ رویتہ و زاد فی علمکم منطقۃ و ذکرکم بالاخرۃ عملہ۔(ترغیب)

۱) ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھو جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے،۲) جن کی گفتگو سے تمہاری دینی معلومات میں اضافہ ہو،۳) جن کا عمل تمہیں آخرت یاد دلائے۔

ارشاد رسول ہے ان من احسن الناس ناساً مفاتیح للخیر، مغالیق للشر (حسن ترمذی۔السلسلۃ الصحیحۃ) بے شک لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خیر کیلیے چابیاں اور شر کے لیے تالے ہیں۔ یعنی اُن کے ذریعے خیر اور بھلائی کھلتی اور پھیلتی ہے جبکہ شر محدود و مسدود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے صالحین اور علماء کو تلاش کرنا اور اُن کے گرد جمع ہونا دین میں استقامت میں مددگار ہوتا ہے

اسلام نے زمانۂ جاہلیت کے برعکس ولایت کو اللہ اور اُسکے رسول کے لیے اور جماعتِ مومنین یعنی اُمتِ مسلمہ کے لیے خاص کیا۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔

(مائدہ۔۵۵، ۵۶)

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں ، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔اور جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے"۔

نبی نے ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔ اور اپنے قول، عمل، اور کردار سے اس کی تاکید فرمائی۔ آپ نے تفرقے، اختلافات، تشتت اور الگ الگ ہونے سے منع فرمایا۔ اس طرح کے اقوال میں سے آپؐ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:۔

۔یدُاللهِ علیَ الجماعۃ۔ "جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے"۔ ترمذی

۔ الجماعۃ رحمۃ والفرقۃ عذاب۔ (جماعت رحمت اور تفرقہ عذاب ہے) مسند احمد

۔علیکم بالجماعۃِ و ایاکم والفرقۃَ فان الشیطان مع الواحد و ہو مع الاثنین ابعد، من اراد بحبوحۃ الجنۃِ فلیلزم الجماعۃ۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

‘‘جماعت کے ساتھ رہو اور تفرقے سے بچ کر رہو۔ کیونکہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور وہ دو آدمیوں سے دور رہتا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ جنت کے عین وسط میں اُسے جگہ ملے تو وہ جماعت کے ساتھ رہے’’۔

روح جماعت کی تخم ریزی:

جماعت اور اُمت کے ساتھ تعلق کا یہ جذبہ جو نبیؐ نے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا اُس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام ہر اُس معاملے کی طرف بھرپور توجہ دیتا ہے جس کا تعلق معاشرے اور اُمت سے ہو اور مصالح و مطالب کے درجات میں اُسے بلند مقام حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ شریعت اسلامی اپنی عبادات، معاملات، آداب، اور باقی احکام میں وہ فرد کو شریعت کے اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ معاشرے کی عمارت میں پہلی اینٹ بن جائے یا اس کے زندہ جسم میں ایک فعال عضو بن جائے۔

فرد کے لیے عمارت میں اینٹ یا جسم میں عضو ہونے کی یہ بلیغانہ تعبیر خالص نبوی تعبیر ہے ۔حدیث صحیح ہے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضًا۔ (متفق علیہ)

"مومن دوسرے مومنوں کے لیے عمارت کی (اینٹوں) کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسری کو سہارا دیتی ہیں"۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَثَلُ المؤمنين في تَوَادِّهم وتراحُمهم وتعاطُفهم: مثلُ الجسد، إِذا اشتكى منه عضو: تَدَاعَى له سائرُ الجسد بالسَّهَرِ والحُمَّى
(متفق علیہ)

"مومنوں کی مثال باہمی محبت اور رحمت و شفقت میں ایسی ہے جیسے وہ ایک جسم کے اعضاء ہوں جسم کے ایک عضو میں جب شکایت ہوتی ہے تو سارا جسم اس کے لیے بے خوابی اور بخار میں مبتلا رہتا ہے"۔

علامہ ابن جوزی مسلمانوں کے اس معاشرے میں مسلمان کے ذمے اپنے دوسرے بھائی کیلیے حقوق کے بارے میں منہاج القاصدین میں لکھتے ہیں کہ:

1. پہلا حق یہ ہے کہ اُس کی حاجتیں پوری کی جائیں اور اس کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے کئی درجے ہیں جن میں سب سے کمتر درجہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی سوال کرے اور پورا کرنے کی طاقت ہو تو اسے خوشی اور خندہ پیشانی سے پورا کرے۔ درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اس کے سوال کے بغیر اُس کا کام کیا جائے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اُس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔
2. دوسرا حق زبان پر ہے اور یہ کبھی خاموشی سے اور کبھی بولنے سے۔ خاموشی سے اس طرح کہ اس کے عیوب سے اُس کی حاضری اور غیر حاضری میں خاموش رہے۔ نیز اُس کے ایسے حالات کے متعلق سوال نہ کرے جن کا بیان کرنا اُسے ناگوار ہو۔اُس کے راز کو مخفی رکھےمعلوم ہونا چاہیے۔ کہ اگر تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرنے لگو جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ تو وہ نہیں ملے گا۔ چنانچہ جس میں برائیوں کی بہ نسبت خوبیاں زیادہ ہوں وہی مطلوب ہے۔ ابن مبارک نے کہا ‘‘مومن معذرت تلاش کرتا ہے اور منافق لغزشیں۔’’
3. نبیؐ نے فرمایا ‘‘ تم بدظنی سے بچو کہ بدظنی سب سے جھوٹی بات ہے’’ بدظنی تجسس کو دعوت دیتی ہے جس کی مخالفت ہے۔ پردہ پوش درگزر کرنا دینداروں کی علامت ہے۔ آدمی کا ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور یقیناً تم اپنے بھائی سے یہی چاہتے ہو کہ وہ تمہاری پردہ پوشی کرے۔

4. چوتھا حق زبان پر بولنے کا ہے کیونکہ بھائی چارہ (اخوت) جیسے بُری بات کہنے سے سکوت کا تقاضا کرتا ہے اس طرح اچھی بات کہنے کا تقاضا کرتا ہے بلکہ وہ اخوت کے ساتھ زیادہ مخصوص ہے۔ پس لازم ہے کہ زبان سے حجت کا اظہار کرے اُس کے حالات کی خبر گیری کرتا رہے۔ اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہو اُن پر خوشی کا اظہار کرے۔ ترمذی کی صحیح روایت میں ہے کہ جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی سے محبت رکھے تو اُسے بتا دے''۔اور اس میں یہ بھی ہے کہ اُسے اُس کے سب سے زیادہ پیارے نام کے ساتھ بلائے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا '' تین چیزیں تیرے لیے تیرے بھائی کی محبت کو خالص کر دینگی۔ جب تو اسے ملے تو سلام کہو۔ اُس کے لیے مجلس میں فراخی کر اور جو تجھے اُس کا سب سے زیادہ پیارا نام معلوم ہو اُس سے اُس کو پکار۔اگر نصیحت کرنے کی ضرورت ہو تو چاہیے۔ کہ علیحدگی میں کرو۔ ڈانٹ ڈپٹ
اور خیر خواہی میں یہی فرق ہے۔ اگر لغزش
دین میں ہو۔ تو اس کی خیر خواہی یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے
نرمی سے وعظ و نصیحت کی جائے۔
5. پانچواں حق یہ ہے کہ جو دُعا تم اپنے لیے کرو وہ اپنے بھائی کے لیے بھی کرو۔ خواہ وہ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو۔ حضرت ابوالدردا کی مسلم میں حدیث ہے کہ نبی نے فرمایا '''مسلمان کی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دُعا قبول ہوتی ہے۔اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لیے دُعائے خیر کرتا ہے تو مقررہ فرشتہ کہتا ہے آمین۔ اور تیرے لیے بھی اس طرح ہو۔
6. چھٹا حق وفا اور اخلاص ہے:۔وفا کا معنی ہے موت تک محبت پر قائم رہنا۔ اور بھائی کی موت کے بعد اُس کی اولاد اور اُس کے دوستوں سے محبت رکھنا۔ نبیؐ نے ایک بڑھیا کی عزت افزائی کی اور فرمایا '' یہ خدیجہؓ کے وقت ہمارے پاس آیا کرتی تھی''۔ عہد کو اچھی طرح نبھانا ایمان کا حصہ ہے اور وفا یہ بھی ہے کہ تواضع میں اپنے بھائی کے لیے تبدیل نہ ہو۔ اگر اس کا مرتبہ بلند ہو جائے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے۔یہ وفا میں سے نہیں ہے۔ کہ بھائی کی موافقت میں دین کی مخالفت کرے۔
7. ساتواں حق تحفیف اور ترکِ تکلف و تکلیف ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کو ایسی تکلیف نہ دے جو اُس پر شاق ہو اپنے

کام اور اپنی حاجت کے سلسلے میں اُسے تکلیف نہ دے۔ اور اُس کے مال اور مرتبے سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ اور نہ اپنی خبرگیری اور اپنے لیے تواضع کی اُسے تکلیف دے۔ بلکہ اس کا قصد صرف اللہ کی محبت، اُس کی دُعا سے برکت حاصل کرنے، ملاقات سے انس کے حصول، اُس کے حقوق کی ادائیگی کا خیال اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اور پوری تحفیف یہ ہے کہ رکھ رکھاؤ کی بسط کو لپیٹ دے۔

حضرت جعفر بن محمد نے کہا '' میرے لیے سب سے زیادہ بوجھل میرے وہ بھائی ہیں۔ جو میرے لیے تکلف کرتے ہیں اور میں اُن سے رکھ رکھاؤ کرتا ہوں اور میرے دل پر سب سے ہلکے وہ ہیں جن کے ساتھ میں ایسا ہوتا ہوں جیسا اکیلا ہوتا ہوں۔''۔ (منہاج القاصدین از عبدالرحمان ابن جوزی صفحہ ۱۳۸ تا ۱۳۲)

قرآن کریم نے اہل ایمان کی جماعت اور معاشرے کو باہم دگر محبت، نرمی، رواداری، گرم جوشی، عفوودرگزر اور اخوت و یکجائی کی صفات سے متصف جماعت قرار دیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو اہل ایمان کے اپنے رب کو رب مان کر اس پر مستقم ہو جانے اور اپنی عبادات اور قربانیوں کو صرف اللہ کے لیے خالص کر دینے کے نتیجے میں شخصیت کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ ان صفات پر مبنی جماعت جہاں آپس میں ریشم کی طرح نرم ہوتی ہے وہاں ایک محبت کرنے والے باپ کی طرح بیک وقت گرفت کرنے والی اور شفیق، اور ایک درگزر کرنے والےبھائی کی طرح نظر انداز کرنے والے معاشرے کی مثال ہوتی ہے۔

رب کریم نے سورۂ فتح آیت ۲۹ میں اس جماعت کے بارے میں یوں فرمایا''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں'' اس آیتِ مبارکہ میں اہل ایمان کی دو بنیادی صفات کو، جو اُن کی پہچان قرار دی گئی ہیں۔ نمایاں کیا گیا ہے۔ایک مثبت صفت جس کا تعلق اُن کے باہمی تعلقات اور معاملات سے ہے۔ یہ ہے کہ جب وہ آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں۔ تو اپنے جائز حق کو بھی اپنے بھائی کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔جب اُن کے ایک بھائی کو دُنیا کے کسی خطےمیں تکلیف پہنچتی ہے۔ اس کے درد کی کسک وہ نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ ایک رحیم شخصیت کی بنا پر اُس کو سکون پہنچانے،امن دینے، اُن کی جان و مال کے تحفظ میں اپنی تمام قوت صرف کر دیتے ہیں۔

یہ ایک الٰہی عطیہ ہے کہ وہ جو کل تک ایک دوسرے کے مال پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے، قبائلی تعصبات اور نسلی دشمنیوں میں

گھِرے ہوئے تھے۔ اس نے اُنہیں آپس میں رحیم بناکر اُن کےدلوں کو، اُن کی روحوں کو، اُن کی فکر کو، ان کے طرزَ عمل کو ایک اعتماد کے رشتے میں جوڑ دیا۔ اور وہ دیکھتے دیکھتے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ کفار پر سخت (اَشِدَّاءُ) ہوتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اہل ایمان اور اہل کفر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں تو پھر خون، خاندان، یا قبیلے کی محبت درمیان میں نہیں آتی۔ نظریاتی جنگ میں اہل ایمان کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ دین کے معاملے میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے اور اپنے موقف پر جم کر استقامت کے ساتھ کفر کو اس کے انجام تک پہنچاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن لاہور ستمبر ۲۰۱۴ اشارات ڈاکٹر انیس احمد صفحہ ۷ و ۸)

قرآن کریم چاہتا ہے کہ اسلامی جماعت کے افراد کی پہچان صبر، ربط باہمی اور تقویٰ ہو:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۟وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(ال عمران۔۲۰۰)

"اے لوگو ، جو ایمان لائے ہو ، صبر سے کام لو ، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھائو۔ حق کی خدمت کے لیی کمر بستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو ، امید ہے کہ فلاح پائو گے"۔

اِصبِرُوا کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اور فوری طور پر کہا گیا۔**وَصَابِرُوا** یعنی یہ ایک انفرادی صفتِ محمودہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے اجتماعی طور پر اختیار کیے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس صبر کا مفہوم نہ صرف انفرادی طور پر استقامت ہے بلکہ جماعت کا مجموعی طور پر اس طرزِ عمل کو اختیار کرنا ہے جو اس کے اخلاص، تقویٰ، بے لوثی اور صرف رضائے الٰہی کا مظہر ہو۔(ایضاً نومبر ۲۰۱۴ اشارات صفحہ ۱۳ و ۱۴)

<u>اسلام اپنے تمام احکام اور تعلیمات میں قرآن و سنت کے ذریعے مسلمان کے دل میں اجتماعیت کے احساس کا بیج بوتا ہے۔</u>

نماز با جماعت، جمعہ، عیدین، اذان اور مسجد میں حاضری کو لازم کیا گیا ہے رسول اللہؐ نے اذان سننے کی صورت میں ایک اندھے کو بھی گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اور آپؐ نے ایسے لوگوں کے گھر وں کو آگ لگانا چاہی جو جماعت سے غائب رہتے ہیں۔

پھر مسجد میں ایک مسلمان کے لیے یہ بات ناپسند کی گئی کہ وہ صفوں کے پیچھے اکیلے نمازپڑھےکیوں کہ اس میں انفرادیت اور بظاہر جماعت سے الگ ہونے کی صورت نظر آتی ہے۔

حضرت رابعہؓ بن معبد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھ رہا ہے تو آپ نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنی نماز دہرائے۔

(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ترمذی نے اسے حسن کہا ہے)

مسلمان کو چاہیے کہ جب مسجد میں داخل ہو اور وہ دیکھے کہ صفیں پوری ہو گئی ہیں تو وہ اُن میں خالی جگہ تلاش کرے اور اس میں گھس جائے اگر خالی جگہ نہ ملے تو اگلی صف سے ایک آدمی کو پیچھے (نرمی سے)کھینچ کر اپنے برابر کھڑا کردے۔ مگر اکیلے کھڑا نہ ہو۔جس آدمی کو وہ کھینچتا ہے۔اُس کو بھی چاہیے کہ نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کے ساتھ پیچھے آجائے۔ اس میں اُسے بھی ثواب ملے گا۔

یہ جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام شکل و صورت کے لحاظ سے بھی جماعت اور وحدت کو اہمیت دیتا ہے اور حقیقی اعتبار سے بھی اس کو اہم قرار دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسلمان جب اکیلے نماز پڑھتا ہے اس وقت بھی وہ اپنے دل میں مسلمان جماعت کا نمائندہ ہوتا ہے۔وہ جب اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس سے مناجات کرتا ہے تو وہ جماعت کی طرف سے گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً وہ پڑھتا ہے ایاک نعبدُ و ایاکَ نستعین، اھدنا الصراط المستقیم۔(الفاتحہ۔۴،۵) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ،ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔(دین میں ترجیحات از مولانا یوسف القرضاوی صفحہ ۲۱۳ تا ۲۲۰)

اس طرح قرآن کی اکثر دُعاؤں پر آپ غور کریں۔ تو زیادہ تر دُعائیں اجتماعی نوعیت کی ہیں۔

مثلاً سورہ بقرہ کی آخری آیت :

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (البقرہ:286)

"اے ہمارے رب!ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال ، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار ، جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں

نہیں ہے ، وہ ہم پر نہ رکھ ہمارے ساتھ نرمی کر ، ہم سے در گزر فرما ، ہم پر رحم کر ، تو ہمارا مولیٰ ہے ، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

(البقرہ:201)

اور پھر لطف یہ ہے کہ تمام امت اور دوسرے بھائیوں کے لیے دُعا کرنے سے اُن سب کو ثواب اور اجر عطا ہوتا ہے اور آپکا اجر بھی کم نہیں ہوتا۔

چند مزید ارشادات رسول ﷺ:

جماعت سازی :

عن الحارث الأشعري رضی الله عنہ قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم آمرکم بخمس الله أمرني بهن بالجماعة وبالسمع والطاعة والهجرة والجهاد۔

(مشکوٰۃ۔ مسند احمد۔ترمذی)

حارث اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں پانچ اُمور کا حکم دیتا ہوں۔ جماعت کا، سننے کا، اطاعت کا، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔

نبی ﷺ اپنی امت کو درج ذیل پانچ اُمور کا حکم دیتے ہیں:

1. جماعت بنو، جماعتی زندگی گزارو۔
2. تمہارے اجتماعی معاملات کا جو ذمہ دار ہو اُس کی بات غور سے سنو۔
3. اُس کی اطاعت کرو۔
4. اگر دین کا مطالبہ یہ ہو کہ اپنا وطن چھوڑو تو وطن کی محبت پر قینچی چلاؤ۔جو بھی تعلق دین کی راہ میں حائل ہو اُسے توڑ ڈالو۔
5. اللہ کی بتائی ہوئی راہ میں اپنی تمام تر کوشش خرچ کر ڈالو۔اُس کے دین کے قائم کرنے میں اپنا پورا زور لگاؤ۔ زبان کے ذریعے، قلم کے ذریعے، ہتھیار کے ذریعے جیسا موقع ہو اور جو بھی ذرائع میسر ہوں اُن سے کام لو۔

اجتماع اور اجتماعی کام:

ترغیب کتاب الذکر والدعا حدیث نمبر۲۳۳۴، ۲۳۳۵ کا ترجمہ یوں ہے۔

’’عمرو بن عبسہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ قیامت کے دن خدائےرحمان کی دائیں جانب کچھ ایسے لوگ بیٹھے ہوں گے جو نہ نبی ہوں گے اور نہ شہید۔ لیکن اُن کے چہروں کانور دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرتا ہوگا۔ اُن کے مقام و مرتبہ کو دیکھ کر انبیا اور شہدا نہایت خوش ہو رہے ہونگے۔لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسولؐ! وہ کون لوگ ہوں گے آپؐ نے فرمایا وہ مختلف قبائل اور مختلف بستیوں کے لوگ ہونگے جو دُنیا میں اسلام لائے۔ اور قرآن سیکھنے سکھانے اور اللہ کو یاد کرنے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ بہترین اور پاکیزہ باتیں چنتے

تھے جس طرح کھجور کا کھانےوالا بہترین اور لذیذ ترین کھجوروں کا انتخاب کرتا ہے''۔
ایک اور روایت میں جو الفاظ آئے ہیں اُن کا ترجمہ یہ ہے''یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے ہیں۔یہ مختلف قبائل کے لوگ ہیں۔ مختلف علاقوں کے ہیں۔خدا کو یاد کرنے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے۔
اس حدیث میں بہت بڑی بشارت بیان ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو مختلف بستیوں اور علاقوں کے ہیں لیکن دین اور دعوت دین نے اُن کو اکٹھا کیا ہے۔ اور وہ سب مل کر نماز کی شکل میں، قرآن پڑھنے پڑھانے کی شکل میں اور دین کودوسروں تک پہنچانے کی حیثیت میں اجتماعی طور پر مشغول ہوتے ہیں۔انبیا اور شہداء کے رشک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اونچے درجے کے لوگ اُن کے مقام و مرتبے کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ یہ لوگ نہ نبی ہیں نہ شہید لیکن اتنے اونچے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔۔حدیث میں ذکر اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی اللہ کو یاد کرنے کے ہیں۔

اجتماعی معاملات میں حصہ لینا:

حضرت ابو قلابہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے کچھ لوگ نبی کے پاس پہنچے اور اپنے ایک ساتھی کی تعریف کرنے لگے کہ ہم نےاس فلاں ساتھی کی طرح کسی آدمی کو نہیں دیکھا۔ سفر کے دوران یہ شخص برابر قرآن پڑھتا رہتا ہے اور جب کسی جگہ ہم پڑاؤ ڈالتے تو یہ شخص نفل پڑھنے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ نبی نے فرمایا تو پھر اُس کی سامان کی حفاظت کون کرتا اور اُس کے اونٹ کو کون کھلاتا تھا۔لوگوں نے کہا ہم اسُ کے سامان کی حفاظت کرتے اور اُس کے اونٹ کو چارہ دیتے۔ آپؐ نے فرمایا تب تو تم لوگ اُس سے بہتر ہو۔(ترغیب و ترہیب حدیث نمبر۴۰۲۲)
اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں متعلقہ تمام افراد کو حصہ لینا چاہیے۔۔

جماعتی زندگی کی برکتیں:

عن زید بن ثابت قال سمعت رسول اللہ لاَ يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مسلم : إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ ، ومناصحۃ وُلاَةِ الامر، وَلُزُومُ جَمَاعَتِهِ ، فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ ، تُحِيطُ مِنْ وَرَائِهِمْ.
(ترغیب و ترہیب بحوالہ ابن حبان، بیہقی،ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

‘‘حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کے دل میں نفاق نہیں پیدا ہو سکتا۔ایک یہ کہ جو بھی عمل کرے اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے۔ دوسری یہ کہ جو لوگ اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں اُن کے ساتھ خیر خواہانہ معاملہ کرے۔ تیسری چیز یہ کہ جماعت سے چمٹا رہے۔ جماعت کے افراد کی دعائیں اُس کی حفاظت کریں گی۔’’

اجتماعی معاملات کے ذمہ داروں کے ساتھ خیر خواہانہ رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اُن کے خلاف دل میں کینہ و عداوت نہ ہو۔ بلکہ خلوص اور خیرخواہی کا جذبہ ہو۔ تمام اُمور میں اُن کی مدد کی جائے اور اگر غلطی کریں تو تنہائی میں خلوص کے لہجے میں اُنہیں ان کی غلطی پر متنبہ کیا جائے۔ یہ تینوں صفتیں نفاق کی ضد ہیں۔ منافقین اللہ کی خوشنودی کے لیے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جماعت میں ظاہراً شامل تھے۔ لیکن اس جماعت سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔بلکہ ہر وقت ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔جماعت میں رہنے کا اور اجتماعی زندگی کا ایک فائدہ اور بھی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ سب ایک دوسرے کے خیر خواہ لوگ ہونگے اور ایک دوسرے کے لیے استقامت علی الحق کی دُعا کریں گے۔ تو یہ اجتماعی دعا بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔ اور اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کی برکت سے اجتماعی افراد کو بہت سی خرابیوں سے محفوظ رکھے گا۔ جیسا کہ اجتماعی زندگی گزارنے والوں کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ (زادِ راہ از جلیل احسن ندوی صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۱)

قرآن مجید، احادیث و اسوۂ حسنہ و سیرت صحابہؓ کا مطالعہ بنیادی طور پر اور عام دینی کتابوں کا مطالعہ ذیلی طور پر ایک مسلمان کے اسلام کے لیے بھی ضروری ہے اور اس کے ایمان کے لیے بھی۔ اِس مطالعہ کے بغیر اُسے نہ صحیح معنوں میں اسلام میسر آسکتا ہے اور نہ صحیح نوعیت کا زندہ و توانا قسم کا ایمان حاصل ہوسکتا ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ آپ سے آپ واضح ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام عمل کا یعنی احکامِ دین و شریعت کی مخلصانہ پیروی کا نام ہے، اور عمل کے لیے خواہ وہ دین کا ہو یا دُنیا کا، علم ضروری ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فلاں کام کا کرنا اُس کے لیے ضروری ہے وہ اُسے انجام دینے کا خیال تک ذہن میں نہیں لاسکتا چہ جائیکہ اُسے عملاً انجام دے۔ اِس لیے اسلام یعنی احکام دین کی پیروی کے لیے ان احکام کا علم شرطِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس علم کی تعیین، تفصیل، اور تفصیل در تفصیل کے تحریری ریکارڈ کا نام قُرآن، حدیث، سیرت، اور پھر صالح دینی لٹریچر ہے۔

اب دوسری بات یعنی خود ایمان کے لیے اِس مطالعہ کے مسئلہ کو لیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ اصل کے اعتبار سے ایمان ایک بسیط شے ہے۔ اور جب وجود میں آتا ہے تو جزو جزو کرکے نہیں آتا، بلکہ پورے طور پر آتا ہے۔ لیکن ایسا سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں کہ ایمان کا یہ سادہ وجود نہ اب کسی تفصیلی واقفیت کامحتاج رِہ جاتا ہے نہ کسی فکرواہتمام کا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کےایمان و یقین کے لیے اِس مطالعہ کی ضرورت و اہمیت بہت زیادہ ہے، ہمارے نزدیک اِس اہمیت و ضرورت کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو یہ کہ کہ اسلام کا اجمالی وجود صرف قانون کی حدتک کافی ہوتا ہے، جو شخص کلمۂ توحید صدق دل سے کہہ رہا ہو اُس کا شمار اہل اسلام کے زمرے میں لازماً رہے گا، لیکن ایمان کا یہ اجمالی اعلان اُس کی ایمانی اور اسلامی زندگی کے لیے ہرگز کافی نہیں ہوسکتا کیونکہ جب تک یہ اجمالی ایمان، تفصیل کا رنگ نہیں اختیار کرتا اُس کی ایمانی اور اسلامی زندگی کے لیے ہرگز کافی نہیں ہوسکتا اُس کے اندر عقیدے کے ایسے نقائص اور جاہلیت کے ایسے داغ دھبے باقی رہ سکتے ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے ایمان کوئی قیمت پا ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر توحید ہی کے عقیدے کو لے لیجئے، اگر اِس کے صحیح مفہوم اور اِس کے سارے لازمی تقاضوں کو اچھی طرح نہ سمجھا جائے اور خدائے واحد کے حقوق و اختیارات، اُس کی ذات اور

صفات سے متعلق تفصیلی معلومات نہ ہوں تو عقیدے میں جھول کے رہ جانے کے امکانات ہیں۔
دوسرا پہلو کیفیتِ ایمان کی برقراری کا ہے۔ اہل ایمان کے قلب کو اگر اللہ کی کتاب، رسولِ خدا کے ارشادات، انبیأ کے اسوے، صلحا کی سیرت، اور دین وشریعت کی شارح و ترجمان کتابوں کے مطالعہ سے برابر زندگی کی حرارت نہ پہنچائی جاتی رہے تو وہ اپنی توانائی کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر اُس سے درست عمل کی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ یہی مطالعہ وہ مؤثر ترین تدبیر ہے جو اس قلب کے اندر پائی جانے والی دولتِ ایمان کی حفاظت کرتی ہے اور اُسے تازگی بخشتی رہتی ہے۔
اِس لیے اُس کے لیے صالح دینی لٹریچر کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ کتابیں دراصل قُرآن و سنت ہی کے معانی و مطالب کے اجزا کی ترجمانی یا شرح ہیں۔
(دین کا مطالعہ کیسے کریں۔ صدرالدین اصلاحی ص۵ تا ۹، ۳۶)
یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اُس نے اُمت مسلمہ میں ایسے علماء و فقہا اور محدثین پیدا فرمائے جنہوں نے ہر کڑے وقت میں مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔ (ہم آگے امت کے ان علماء اور زعما کی کاوشوں کا تذکرہ کرینگے) اِن علماء نے عقائد کی توضیح کی۔ بدعت کی مخالفت کی اور اور اس کو ردّ کرنے کے دلائل دیئے۔ اُمت میں تفرقہ و انتشار کی مذمت کی اور قرآن و حدیث کی عام فہم انداز میں تشریح کی اور آج اِن کاوشوں کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم صداقتِ اسلام پر ایمان رکھتا ہے۔
البتہ اِس لٹریچر کے مطالعہ کے ضمن میں چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔
ایک تو یہ کہ کسی بڑے سے بڑے شیخِ وقت اور عبقری عالم کی تصنیف کے مطالعہ کو بھی قُرآن و سنت کے مطالعہ کا قائم مقام ہرگز نہ سمجھ لیا جائے۔ اور یہ صرف کہنے ہی کی حدتک نہیں بلکہ فی الواقع بھی۔ لہٰذا اِن کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے کسی صورت میں قرآن و حدیث کے مطالعہ سے لاتعلق نہیں ہونا چاہیے۔کیونکہ یہی دونوں سرچشمے ہیں، اور ایمانیات کی بنیاد اور اصل ہیں۔ لٹریچر کے ضمن میں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ کہ وہ کتابیں بااعتماد علماء کی تحریر کردہ ہوں اور جو اُمت کے اندر تفرقہ بازی اور باہم نفرت کے مندرجات سے خالی ہوں اور صراطِ مستقیم اور دعوت دین اور اقامت دین کی طرف لوگوں کو ترغیب دینے والی ہوں۔

صالح لٹریچر کے مطالعہ کے اندر تحریکِ اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ بھی شامل ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ اِس لٹریچر کا مطالعہ بھی اس طرح کیا جائے جس طرح کسی اور لٹریچر کا کیا جانا چاہیے۔۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اس لٹریچر کے کچھ بنیادی نکات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں، کیونکہ حالات اور زمانہ کے لحاظ سے وہ خصوصی اہمیت کے حامل بن چکے ہیں، اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کچھ اچھوتے نکات ہیں اور کچھ اس تحریک کی اپنی دریافت ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاتأمل ردّ کیے جانے کے مستحق ہوتے۔ اِس کے برخلاف یہ اسلام کے مسلمہ حقائق ہیں، اور الفاظ کے فرق اور اندازِبیان کے اختلاف کے ساتھ دوسری اسلامی کتب میں بھی جابجا مذکور ہیں، لیکن جس چیز نے اِن نکات کو تحریک کے لٹریچر کا امتیازی وصف بنادیا ہے، وہ عملی زندگی سے اِن نکات کا ربط قائم کرنے کی سرگرم وکالت اور پیہم سعی و کوشش ہے۔ یہ نکات مدت سے کتابوں کی زینت بن کر رہ گئے تھے اور تحریک اسلامی بڑے ذہنی غوروفکر اور عملی ریاض کے بعد ان نکات کو اُبھارکر دُنیا کے سامنے لا سکی ہے۔ اب اِن کا حق یہی ہے کہ انہیں از سرِ نو ذہنوں میں ماند پڑنے سے بچایا جائے جس کی حالت موجودہ کار گر شکل یہ ہے کہ اِن نکات کو شرح وتفصیل اور دلائل کے ساتھ پیش کرنے والی کتابوں کا خصوصی توجہ سے مطالعہ کیا جائے اور کیا جاتا رہے۔ اِس سلسلے میں ایک بات کا تذکرہ مناسب ہی رہے گا اور وہ یہ کہ خود بانی تحریک مولانا مودودیؒ کوا یک بار یہ کہتے سُنا گیا کہ تحریک کی کتابوں کو باربار پڑھتے رہنا چاہیے۔۔ میں اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو خود بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ (ایضاً ص۳۸)

توفیق الٰہی

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دُنیا میں ایک امتحان کے لیے بھیجا ہے۔ یہ زندگی ہمارے لیے دارالامتحان ہے۔اس امتحان میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کہ ہم حسنِ عمل کی روش اختیار کرتے ہیں یا بدعملی کی ۔شکر کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں یا ناشکری کی۔ ایمان لانا چاہتے ہیں یا کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اطاعت کرنا چاہتے ہیں یا سرکشی و طغیانی، صرف اللہ کی بندگی کرنا چاہتے ہیں یا اس کے علاوہ دوسری معبودوں کی۔ یعنی ان سب باتوں میں ہمارا امتحان مقصود ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۔(الملک۔۲)

"جس نے موت اور زندگی کو اِیجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی"۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔
(الدھر۔۳)

"ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ، (راہ سجھا دی) خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"۔

اب ظاہر ہے جب امتحان مقصود ہے تو اس کے لیے اختیار اور آزادئ عمل بھی حاصل ہے۔ یہ اختیار دینا ضروری تھا کیونکہ ایک مجبور و مقہور کا امتحان ایک بے معنی کام ہوتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عدل سے بعید تھا۔ کہ وہ ایسا کرتا۔

پھر یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عدل سے بعید ہے کہ وہ اس امتحان اور اس راہ کو اتنا مشکل بنا دے کہ کوئی اس پر نہ چل سکے۔ اور یہ بات بھی بعید تر ہے کہ وہ ہمیں امتحان میں ڈالتا اور اس طرح ڈالتا کہ ہم ناکام ہو جائیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِـيْمًا۔
(النساء۔۱۴۷)

"آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے"۔

اور تیسری بات یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ کی رحمت اور عدل سے یہ بات بھی بعید ہے کہ وہ ہمیں کوئی ایسا حکم دیں جس کو بجا لانے

کی ہم میں سکت نہ ہو۔ یا ہمیں ایسے امتحان اور آزمائش میں ڈالیں کہ جس میں پورا اُترنے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔
چنانچہ بنیادی اصول بیان کرکے یہ انتہائی اہم سنت الٰہی واضح کر دی گئی۔ ارشادِ ربانی ہے:
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ البقرہ۔۲۸۶)
"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے ، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے ، اس کا وبال اسی پر ہے "۔
یہ اُصول متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے۔جبر و اکراہ کے عالم میں زبان سے کلمۂ کفر کہنا پڑے مگر دل ایمان پر مطمئن ہو تو کوئی گناہ نہیں۔بھول چوک کے گناہ معاف ہیں۔کہ اُن پر اختیار نہیں بلکہ اگر گناہ کی خواہش پیدا ہوئی اور پھر آدمی اس کے کرنے سے رُک گیا تو نیکی کے اجر کی بشارت ہے۔
اور یہ بھی ہدایت فرمائی:
اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ۔ (آل عمران۔۱۰۲)"اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے"۔
یہ سن کر صحابہ کانپ اُٹھے کس کے بس میں ہے کہ اللہ سے تقویٰ کا حق ادا کر سکے چنانچہ تشریح فرما دی گئی:
فَاتَّقُوا اللہ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (التغابن : ١٦) (اللہ سے تقویٰ کرو جتنا بس میں ہے)
آپ جب اطاعت و جہاد کی بیعت لیا کرتے تھے تو خاص طور پر ‘‘حد استطاعت’’ کے الفاظ اضافہ فرمایا کرتے تھے۔
پس حقیقت یہ ہے کہ حسن عمل کے جس امتحان میں ہمیں ڈالا گیا ہے اُس کے لیے ہمیں اپنے عمل کے علاوہ کسی اور چیز پر کوئی حقیقی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔لہٰذا اسی اختیار اور حسن عمل کے امتحان کا لازماً تقاضا یہ ہوا۔ کہ ہمیں جو کچھ بھی ملے وہ صرف ارادہ اور ہمارے عمل کرنے کے بدلے میں ملے۔
اگر ہم خود نیک بننے کا ارادہ اور کوشش نہ کریں تو کسی دوسرے کی تعلیم، صحبت اور توجہ ہمیں نیک نہیں بنا سکتی۔ اور بد بننے سے روک نہیں سکتی۔ آپؐ کو بھی یہ اختیار نہیں بخشا گیا نہ یہ ذمہ داری دی گئی کہ کسی کو اُس کی مرضی کے خلاف زبردستی ہدایت کے راستے پر چلا دیں۔
اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ۔ (القصص۔۵۶)

"اے نبی ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے"۔

یہ ارشادات بھی ہیں:
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَي الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (شوریٰ۔۱۳)
"اُس نے تمہارے لیے ، دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوح ؑ کو دیا تھا ، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ، ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے ، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم ؑ اور موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ کو دے چکے ہیں ، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جائو یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمد) تم اِنہیں دعوت دے رہے ہو ۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے ، وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے ، جو اُس کی طرف رجوع کرے"۔
وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۔
(الفرقان۔۷۱)
"جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے"۔
وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى
(طہٰ۔۸۲)
"البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے ، پھر سیدھا چلتا رہے ، اُس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں"۔
وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔
(ابراہیم۔۷)
"اور یاد رکھو ، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگرشکر گذار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق کا انحصار ارادہ اور سعی پر ہے:

پس اللہ تعالیٰ کو جو مطلوب ہے وہ نہ کمال ہے، نہ عمل کی تکمیل ہے۔ نہ عمل میں کامیابی ہے کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں اُسے صرف ہمارے عمل کے لیے مقدور بھر

کوشش اور سعی مطلوب ہے جو ہمارے اختیار میں ہے۔ ساری کامیابی قدردانی اور اجر و انعام صرف اسی سعی پر عطا کرنے کا وعدہ ہے۔
(خرم مراد کی کتاب "اپنی تربیت کیسے کریں؟"سے رہنمائی لی گئی)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔

(یونس۔۱۰۰)

"کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا ، اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے"۔

یعنی جس طرح نعمتیں تنہا اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اور کوئی شخص کسی نعمت کو بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہ خود حاصل کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے شخص کو بخش سکتا ہے۔ اس طرح یہ نعمت بھی کہ کوئی شخص صاحبِ ایمان ہو اور راہِ راست کی طرف ہدایت پائے اللہ کے اذن پر منحصر ہے۔ کوئی شخص نہ اس نعمت کو اذن الٰہی کے بغیر خود پا سکتا ہے اور نہ کسی انسان کے اختیار میں ہے کہ جس کو چاہے یہ نعمت عطا کردے۔پس نبی اگر سچے دل سے یہ چاہے بھی کہ لوگوں کو مومن بنادے تو نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے اللہ کا اذن اور اس کی توفیق درکار ہے۔

یہاں صاف بتا دیا گیا کہ اللہ کا اذن اور اُس کی توفیق کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے کہ بغیر کسی حکمت اور بغیر کسی معقول ضابطے کے یونہی جس کو چاہا نعمت ایمان پانے کا موقع دیا۔ اور جسے چاہا اس سے محروم کردیا۔ بلکہ اس کا نہایت حکیمانہ ضابطہ ہے اور وہ یہ کہ جو شحص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقے سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے تو اللہ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی و طلب کے تناسب سے مہیا کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق بخشی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جوطالبِ حق ہی نہیں ہیں اور جو اپنی عقل کو تعصبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں یا سرے سے تلاش حقیقت میں اُسے استعمال ہی نہیں کرتے تو اُن کے لیے اللہ کے خزانۂ قسمت میں جہالت اور گمراہی اور غلط بینی و غلط کاری کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اُنہی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں اور یہی اُن کے نصیب میں لکھی جاتی ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵)

ارشاد ربانی ہے :
الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَي النُّوْرِ ڏ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰي صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ
(ابراہیم۔۱)

"آ ۔ لٓ ۔ رٓ ۔ اے نبیؐ ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ ، ان کے رب کی توفیق سے ، اس خدا کے راستے پر ، جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

یہ جو فرمایا کہ تم ان کو اپنے رب کے اذن یا توفیق سے خدا کے راستے پر لاؤ تو اس میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ راہِ راست پیش کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس راستہ پر لے آنا اُس کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا انحصار سراسر اللہ کی توفیق اور اس کے اذن پر ہے۔ اللہ کسی کو توفیق دے تووہ ہدایت پا سکتا ہے۔ ورنہ پیغمبر جیسا کامل مبلغ اپنا پورا زور لگاکر بھی اس کو ہدایت نہیں بخش سکتا۔

رہی اللہ کی توفیق تو اس کا قانون بالکل الگ ہے جسے قرآن میں مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اُس کو ملتی ہے جو خود ہدایت کا طالب ہو۔ ضداور ہٹ دھرمی اور تعصب سے پاک ہو۔ اپنے نفس کا بندہ اور اپنی خواہشات کا غلام نہ ہو۔ کھلی آنکھوں سے دیکھے کھلے کانوں سے سنے، صاف دماغ سے سوچے سمجھے اور معقول بات کو بے لاگ طریقے سے جانے۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۶۹)

<u>اللہ کے نور سے فیض یاب ہونے کے لیے مطلوبہ صفات:</u>

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۽ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ
(النور۔۳۷ تا ۳۸)

"جنہیں تجارت اور خریدو فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی، (اور وہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں)(تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان

کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے ،اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے"۔

اللہ کے ہاں سے یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی جو اللہ کے نورِ مطلق کا ادراک کرنے اور اُس کے فیض سے بہرہ ور ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کہ یونہی جسے چاہا مالامال کر دیا اور جسے چاہا دھتکار دیا۔ وہ جسے دیتا ہے کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے۔ اور نعمتِ حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اُس کی محبت اور اُس سے دلچسپی اور اس کا خوف اور اس کے انعام کی طلب اور اُس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دُنیا پرستی میں گم نہیں ہے بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اُس کے دل میں اپنے خدا کی یاد بسی رہتی ہے۔ وہ پستیوں میں پڑا نہیں رہنا چاہتا بلکہ اس بلندی کو عملاً اختیار کرتا ہے جس کی طرف اُس کا مالک اُس کی رہنمائی کرتے۔ یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے ورنہ اُس کے دَین کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۴۱۰)

جو لوگ بندگئی رب کی راہ اختیار کرتے ہیں تو ہر آن اُن کی آزمائش ہوتی ہے۔ راہ حق کی ان آزمائشوں، مشکلات اور تکالیف میں صبر و استقامت صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور استعانت ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو،خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اللہ کی مدد اور اُس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی ﷺ حق و صداقت کے مؤقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلاب بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

اللہ تعالیٰ سورہ ابراہیم آیت نمبر۴ میں فرماتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِه لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

‘‘ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اُس نے اپنی قوم کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ اُنہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھا جائے پھر اللہ جسے چاہتا ہے۔ بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور وہ بالادست اور حکیم ہے’’

یعنی باوجود اس کے کہ پیغمبر ساری تبلیغ و تلقین اُسی زبان میں کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے۔ پھر بھی اُسے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ کسی کلام کے محض عام فہم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب سننے والے اُسے مان جائیں۔ ہدایت و ضلالت کا سرشتہ بہر حال اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے اپنے اس کلام کے ذریعے سے ہدایت عطا کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے اس کلام کو اُلٹی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے۔
اور یہ بھی یاد رہے کہ لوگوں کا بطور خود ہدایت پالینا یا ٹھیک ہوجانا تو اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ وہ کاملاً خود مختار نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ کی بالادستی سے مغلوب ہیں۔ لیکن اللہ اپنی اس بالادستی کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا کہ یونہی بغیر کسی معقول وجہ کے جسے چاہے ہدایت بخش دے اور جسے چاہے خواہ مخواہ بھٹکا دے۔ وہ بالادست ہونے کے ساتھ حکیم و دانا بھی ہے۔اُس کے ہاں سے جس کو ہدایت ملتی ہے۔ معقول وجوہ سے ملتی ہے۔ اور جس کو راہِ راست سے محروم کرکے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنی ضلالت پسندی کی وجہ سے اس سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔
(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۷۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔
(التغابن۔۱۱)
"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اِذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے ، اللہ کو ہر چیز کا علم ہے"۔
فرمایا گیا کہ دنیا میں جو تکلیف اور مصیبت کسی پر آتی ہے خواہ وہ بیماری کی شکل میں ہو یا دوسرے نقصانات کی شکل میں ہو وہ اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی قوم یا بحیثیت مجموعی سارے انسانوں پر کوئی آفت ہوتی ہے تو اُس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیرظہور میں آئے۔یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ ایمان لانے والے کوصبر کی ہدایت دیتا ہے اُس کی توفیق بخشتا ہے اُس کو عدل اور حق پر قائم رہنے کی ہدایت دیتا ہے۔اور اس کے مطابق اس کو عظم اور ہمت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔یہ ساری ہدایات اللہ تعالیٰ اس شخص کو دیتا ہے جو اُس کے اوپر ایمان لاتا ہے۔وہ اس کے قلب میں وہ روشنی پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ اپنا راستہ ٹھیک

ٹھیک دیکھ سکے۔ اس کےبعد اس کو توفیق دیتا ہے کہ اس کے سامنے جو حقیقت واضح ہوکر سامنے آ چکی ہے وہ اس کو اختیار کرے اور مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔یہ سب ہدایت قلب کے معنی ہیں۔
اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان ہی نہ لائے تو اس کے قلب کو کوئی روشنی نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔اُس کا نفس اس کو جدھر لے جاتا ہے ادھر ادھر وہ جاتا ہے۔اللہ تعالی اس کی راہ نمائی اسی وقت کرے گا جب کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرے اس پر ایمان لائے اپنے اپ کو اسکے حوالے کردے اور اس کی راہ نمائی قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے تب اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیتا ہے۔
(ترجمان القرآن لاہور جنوری ۲۰۱۱درس قرآن سورہ التغابن از مولانا مودودی صفحہ نمبر ۲۶، ۲۷)

اللہ اپنی راہ میں مجاہدہ کرنے والوں کی خود ہی رہنمائی کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَـنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔
(العنکبوت۔۶۹)

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقینا اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔
سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۶ میں فرمایا گیا تھا کہ جو شخص مجاہدہ کریگا وہ اپنی ہی بھلائی کیلیے کرے گا۔ اور یہاں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دُنیا بھر سے کش مکش کا خطرہ مول لے لیتے ہیں۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ اُن کے حال پر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ وہ اُن کی دستگیری و رہنمائی فرماتا ہے۔ اور اپنی طرف آنے کی راہیں اُن کے لیے کھول دیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر اُنہیں بتاتا ہے کہ ہماری خوشنودی تم کس طرح حاصل کر سکتے ہو۔ ہر موڑ پر اُنہیں روشنی دکھاتا ہے کہ راہِ راست کدھر ہے اور غلط راستے کون سے ہیں۔ جتنی نیک نیتی اور خیر طلبی اُن میں ہوتی ہے اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق اور ہدایت بھی اُن کے ساتھ رہتی ہے۔
(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۷۲۱)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ (سورہ یونس۔۹)

"اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے اُن صداقتوں کو قبول کرلیا جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک

اعمال کرتے رہے انہیں ان کا ربّ ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا، نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی"۔
اس آیت کے مضمون کی ترتیب گہری توجہ کی مستحق ہے:

- ان لوگوں کو آخرت کی زندگی میں جنت کیوں ملے گی۔اس لیے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں سیدھی راہ پر چلے۔ہرکام اور ہر شعبہ زندگی میں، انفرادی اور اجتماعی معاملے میں اُنہوں نے برحق طریقہ اختیار کیا اور باطل طریقوں کو چھوڑ دیا۔
- یہ ہر ہر قدم پر زندگی کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اُن کو صحیح و غلط، حق اور باطل، راست اور ناراست کی تمیز کیسے حاصل ہوئی۔پھر اس تمیز پر راست روی پر ثبات اور کجروی سے پرہیز کی طاقت اُنہیں کہاں سے ملی۔اُن کے رب کی طرف سے۔ کیونکہ وہی علمی رہنمائی اور عملی توفیق کا منبع ہے۔
- اُن کا رب اُنہیں یہ ہدایت اور یہ توفیق کیوں دیتا رہا؟---اُن کے ایمان کی وجہ سے۔
- یہ نتائج جو اوپر بیان ہوئے ہیں کس ایمان کے نتائج ہیں---اُس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنی میں ہو۔ بلکہ اُس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے۔ اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہو۔جسمانی زندگی کی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت یابی، راست بینی، راست روی اور بالاخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح عقائد پرموقوف ہے۔مگر یہ نتائج اُن عقائد کے نہیں ہیں۔ جو محض زبان پر جاری ہوں۔ یا دل و دماغ کے کسی گوشے میں بے کار پڑے ہوئے ہوں بلکہ اُن عقائد کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر انداز فکر، اور مذاقِ طبع اور افتادِ طبع بن جائیں اور سیرت و کردار اور رویۂ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۶۸)

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے پوری سعی و کوشش کرے لیکن اس کا بھروسہ اپنی قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو۔بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے۔ اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ صرف اس صورت میں مستحق ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ اس کی رضا کو

مقصود بناکر اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے۔(تفہیم القرآن جلد ۔چہارم صفحہ ۔۵۰۷)

باب چہارم

اہل عزیمت کا قافلہ۔تاریخ سے چند درخشاں مثالیں

خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کی قیادت کی تقسیم

تاریخ حق و باطل کی کشمکش اور چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے بھری پڑی ہے۔ انبیاء اور رُسل، صحابہ کرام اور اہل بیت حضرات نے عزیمت کی اس راہ میں کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔اور کیسی کیسی آزمائشوں سے دو چار ہوئے۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اُنہوں نے بڑی پامردی، استقامت اور عزیمت سے ان سب سختیوں کا مقابلہ کیا اور کسی بھی لمحہ کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائی۔ بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دست بدعا رہے کہ اگر اس راہ میں اُن سے کوئی اسراف، یا زیادتی ہوئی ہے تو اپنے خاص فضل و کرم سے اُس سے درگذر فرما۔اور ہمیں ان گمراہوں اور کافروں پر نصرت عطا فرما۔صرف ایک ہی ارشادِ ربانی پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔وَمَا كَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ١٤٧فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ ضالدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران۔۱۴۶،۱۴۸،۱۴۷)

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی ۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں اُن سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے ، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی وہ(باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔اُن کی دعا بس یہ تھی کہ : '' اے ہمارے رب ، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا ہو اُسے معاف کر دے ، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر''۔آخر کار اللہ نے اُن کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔

ان برگزیدہ ہستیوں کی زندگی کی تفصیلات بیان کرنے سے یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ اُن کی سعی و جدوجہد سے عام طور پر مسلمان بخوبی واقف ہیں۔ لیکن چونکہ بعد کی تاریخ سے لوگوں کی عدم واقفیت کہیں یہ تاثر نہ دے۔ کہ عالمِ اسلام میں اُن کے بعد پھر اس طرح کی جدوجہد اور حکمرانوں کی گمراہیوں کے بالمقابل

حق کی آواز اُٹھانے والے شاید نہ رہے۔ اسی وجہ سے میں یہاں مختصر طور پر اہل بیت کے بعد کچھ چیدہ چیدہ مثالیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرونگا جن کے دم قدم سے آج اسلام زندہ ہے۔ ہمارے عقائد محفوظ ہیں۔

خلافت راشدہ کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کی مکمل نیابت تھی۔خلیفۂ راشد محض راشد (راست رو) ہی نہ ہوتا تھا بلکہ مرشد (راہ نما) بھی ہوتا تھا۔اُس کا کام محض مملکت کا نظم و نسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہیں تھا۔ بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا۔۔۔۔۔جس طرح اسلام ہر پہلو کا جامع ہے اسی طرح یہ قیادت بھی ہر پہلو کی جامع تھی۔ اور مسلمان پورے اعتماد کے ساتھ اپنی اجتماعی زندگی اس کی رہنمائی میں بسر کر رہے تھے۔

اس خلافت کے بعد جب ملوکیت آئی تو نہ وہ اس جامع قیادت کی اہل تھی نہ مسلمان ایک دن کے لیے بھی اُس کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار ہوئے۔۔۔بادشاہ گردنیں زبردستی جھکا سکتے تھے۔ اور وہ اُنہوں نے جھکا لیں۔ وہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو خوف و طمع کے ہتھیاروں سے اپنی اغراض کا خادم بھی بنا سکتے تھے۔ اور اُنہوں نے بنا لیا۔ مگر وہ دل نہیں جیت سکتے تھے کہ لوگ اُن کو اپنے دین کا امام بھی بنا لیں۔

بنی امیہ کی حکومت کے پورے ۹۲ سالہ دورِ حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے ڈھائی سال تاریکی میں روشنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں سیاسی اقتدار سے کام لے کر لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی سے کافی حد تک جاہلیت کے اثرات نکال دئیے تھے۔ انہوں نے فاسد عقیدوں کی اشاعت کو روکا۔اتباعِ شریعت کی روح کو تازہ کیا اور عیش و عشرت کی بیماریاں جو شاہی نظام کی بدولت پیدا ہو چکی تھیں اُن کا انسداد کیا۔صرف انتالیس سال کی عمر میں یہ خادمِ دین و ملت دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزکی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا جیسا کہ اس سے پہلے بہتا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول از ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۶۸)

اگرچہ اُن کی وفات کے بعد سیاسی پہلو میں اس پورے کام پر پانی پھر گیا جو اُنہوں نے انجام دیا۔ مگر اسلامی ذہنیت میں جو بیداری اُنہوں نے پیدا کردی تھی وہ بنی امیہ اور بنو عباس کے سیاسی استبداد اور حکومت کے اثر و رسوخ کے باوجود دب نہ سکی۔''اس زمانے میں مسلمانوں میں اقتدار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون اور فقہ کی تدوین اور نظام قضا پر علماء کی دسترس، ملوکیت کی انحرافی رو کے مدِ مقابل معاشرے میں ایک ایسے خودکار نظام کو فروغ دینا ایسا تاریخی کارنامہ تھا جس کے نتیجے میں معاشرے اور تہذیب و تمدن پر اسلام غالب رہا اور ریاست بھی اسلام کے گرفت میں رہی۔ سید مودودی نے اس تاریخی کارنامے کو خلافت و ملوکیت میں پیش کیا۔اس میں ہماری تاریخ اور تدوین فقہ کی تحریک کا ایک ایسا پہلو سامنے آیا ہے جسے مورخین اور مفکرین نے بالعموم نظر انداز کر دیا تھا۔(ترجمان القرآن لاہور مئی ۲۰۰۴ صفحہ ۱۹۴) اس کارنامے کی کچھ تفصیلات ہم آئندہ صفحات میں حضرت امام ابوحنیفہ کے عنوان کے تحت پیش کر رہے ہیں۔

بہرحال یہ نئی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

سیاسی قیادت

ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا۔ اور چونکہ اُسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جا سکتا تھا، نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی۔ اس لیے اُمت نے بادل ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔۔۔اس کے چلانے والے مسلمان تھے۔ جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے۔۔۔۔عام معاملات اُن کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔ صرف اُن کی سیاست دین کے تابع نہ تھی۔ اور اُس کی خاطر وہ اسلام کے اُصول حکمرانی سے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے اُمت نے اُن کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کرلی کہ اُن کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے۔امن و امان قائم رہے۔سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے۔ اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے۔ جمعہ و جماعت اور حج قائم ہوتا رہے۔ اور عدالتوں کے ذریعے اسلامی قوانین کا اجرا برقرار رہے۔ ان مقاصد کے لیے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے۔کہ اب اُمت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں۔

دینی قیادت:

دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا۔ جسے بقایائے صحابہ، تابعین و تبع تابعین، فقہا و محدثین، اور صلحائے اُمت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اور اُمت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ اُن کی امامت تسلیم کر لی۔ یہ قیادت اگر چہ منظم نہ تھی۔ اگر چہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا جسے سب نے اپنامرشد مان لیا ہو۔ اگرچہ اس کی کوئی بااختیار کونسل نہ تھی۔ کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں۔اُن کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کردے۔ اور وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے۔ یہ لوگ اپنی انفرادی حیثیت میں الگ الگ کام کر رہے تھے۔ اور ان متفرق افراد کے پاس اخلاقی اثر و وقار کے سوا کوئی طاقت نہ تھی۔لیکن چونکہ یہ سب ایک ہی چشمۂ ہدایت ۔کتاب اللہ و سنت رسول اللہ۔ سے فیض یاب تھے۔اور نیک نیتی کے ساتھ دینی رہنمائی کر رہے تھے۔ اس لیے جزئیات میں مختلف الرائے ہونے کے باوجود مجموعی طور پر اُن کا مزاج ایک ہی تھا۔۔۔اور اس طرح اُن کا پورا گروہ مسلمانوں کو ایک ہی فکری و اخلاقی قیادت، فراہم کر رہا تھا۔

<u>دونوں قیادتوں کا باہمی تعلق</u>:

ان دونوں قسم کی قیادتوں میں تعاون کم اور تصادم یا کم از کم عدم تعاون زیادہ رہا۔۔۔سلاطین سے بے نیازی، اور اُن کے قہر و غضب کے مقابلے میں ثابت قدمی، مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کا معیار بن گئی تھی۔ اس معیار سے ہٹ کراگر کوئی اللہ کا بندہ چلا تو قوم بڑی کڑی نگاہوں سے اُس کا جائزہ لیتی رہی۔ اور اُس کی بزرگی کو اُس نے صرف اُس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جاکر بھی اُس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔عام مسلمان تو درکنار، خود وہ لوگ بھی جو سیاسی قیادت کے ہاتھ بِک چکے تھے۔اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کہ دین کا امام و پیشوا کسی ایسے شخص کو مان لیں جو انہی کی طرح بِک جانے والا ہو، یا طاقت سے دب کر احکام دین میں تحریف کرنے لگے۔

اس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔ علمائے امت نے تفسیر، حدیث، فقہ، اور دوسرے علومِ دینیہ کی تدوین اور درس و افتاء کا جتنا کام کیا۔حکومت سے آزاد رہ کر، اُس کی مدد کے بغیر، بلکہ بارہا اُس کی مزاحمت کے باوجود اور اُس کی بے جا مداخلتوں کا سخت مقابلہ کرتے ہوئے کیا۔ صلحاءِاُمت نے مسلمانوں کے ذہن اور اُن کے اخلاق و کردار کی تربیت و تہذیب کے لیے جو کام کیا وہ بھی سیاسی قیادت سے پوری طرح غیر متاثر رہا۔ اور اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر انہی بزرگوں کی بدولت ہوئی۔ (خلافت و ملوکیت از مولانا

مودودی صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۴) جو حضرات تفصیلات میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ وہ تاریخ دعوت و عزیمت از مولانا ابوالحسن علی ندوی، (پانچ حصے) تجدید و احیائے دین از مولانا مودودی، ابن الاثیر الطبری، ابن خلدون وغیرہ ملاحظہ فرمائیں)

اسلام کا اصل منشا:

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہو کر اپنی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں۔وہ بلاشبہ نہایت قابل قدر ہیں۔۔۔مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ اس امت کو ایک ایسی سیاسی قیادت میسر ہو جو حلافتِ راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی۔ جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے بلکہ اس اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)

آئمہ اربعہ:

دوسری صدی کے آغاز سے تقریباً چوتھی صدی تک دینی قیادت، جن میں آئمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) نمایاں ہیں۔اور جن کی طرف آج فقہ کے چاروں مذاہب منسوب ہیں نے اصولِ دین سے اسلام کے قوانین کی تفصیلی شکل مرتب کی۔ اور ایک وسیع نظام تمدن کو اسلام کے طرز پر چلانےکے لیے جس قدرضوابط و مناہج عمل کی ضرورت تھی وہ تقریباً سارے کے سارے اپنی تمام جزئیات کے ساتھ مدون کر ڈالے۔

ان لوگوں نے یہ سارا کام شاہی نظامِ حکومت کی امداد کے بغیر، اس کی مداخلت سے آزاد ہو کر بلکہ اُس کی دراندازیوں کا سخت مقابلہ کرکے انجام دیا۔ اور اس سلسلے میں وہ تکلیفیں اُٹھائیں کہ جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ جن کا ذکر آگے آرہا ہے، نے بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کے زمانے میں کوڑوں کی مار اور قید کی سزائیں بھگتیں۔ امام مالک کو منصور عباسی کے زمانے میں ۷۰ کوڑوں کی سزا دی گئی اور اس بُری طرح اُن کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اُکھڑ گیا۔ (امام شافعی پر علویوں کی حمایت کا الزام لگا کر باقی ۹ دیگر علماء و فقہا کے ساتھ خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور خلیفہ کے پاس لانے سے پہلے وہ

گورنر یمن کے عتاب کا شکار بھی ہوئے۔یہ تو اللہ بھلا کرے امام محمد کا کہ اُن کی سفارش اور حمایت سے وہ قتل کی سزا سے بچ گئے۔ لیکن اُن کی حق گوئی اور بے باکی برقرار رہی۔(اس ضمن میں تفصیلات کیلیے امام شافعی از ابوزھرہ سے رجوع کریں۔مرتب) امام احمد بن حنبل پر ماموں، معتصم اور واثق تینوں کے زمانے میں مسلسل مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ اور پھر متوکل کے زمانے میں شاہی انعام و اکرام اور عقیدت و تعظیم کی وہ بارش اُن پر کر دی گئی کہ وہ گھبرا کر پکار اُٹھے۔''یہ مجھ پر اس مار اور قید سے زیادہ سخت مصیبت ہے'' مگر ان سب باتوں کے باوجود ان اللہ کے بندوں نے علم دین کی ترتیب و تدوین میں نہ صرف خودشاہی نفوذ و اثر کو گُھسنے کا راستہ نہ دیا بلکہ کچھ ایسی طرح ڈال گئے کہ اُن کے بعد بھی سارا اجتہادی و تدوینی کام درباروں کے دخل سے بالکل آزاد ہی رہا۔ (تجدید و احیائے دین از مولانا مودودی صفحہ ۶۱ تا ۶۳)

طوالت کے خوف سے اب ہم دینی قیادت کے نمائندوں کے طور پر آئمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے کارناموں کا اپنے موضوع کے لحاظ سے مختصر جائزہ پیش کریں گے۔(فقہ اور حدیث کے سلسلے میں ان آئمہ اربعہ کے کام کی تفصیل ہماری کتاب '' مبادیات اصول فقہ'' میں ملاحظہ فرمائیں)

امام ابوحنیفہؒ

اُن کا اسم گرامی نعمان بن ثابت تھا۔ معتبر روایات کے مطابق کوفہ میں اُن کی پیدائش ۸۰ھجری (۶۹۹ ؁) میں ہوئی۔ عبدالملک بن مروان اُس وقت اموی خلیفہ تھا اور حجاج بن یوسف عراق کا گورنر۔خلیفہ المنصور کے عہد میں ۱۵۰ ھجری (۷۶۷ ؁) میں اُنہوں نے وفات پائی۔ (طوالت کے خوف سے اُن کی تعلیمی زندگی اور دوسری تفصیلات سے صرف نظر کر رہے ہیں)۔

وہ اپنی شخصی زندگی میں انتہائی پرہیزگار اور دیانت دار آدمی تھے۔ اُن کے ہم عصر اُن کی پرہیز گاری کے بارے میں غیر معمولی طور پر رطب اللسان ہیں۔مشہور امام حدیث عبداللہؒ بن مبارک کا قول ہے ''میں نے ابوحنیفہؒ سے زیادہ پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے گا جس کے سامنے دُنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی اور اُس نے ٹھکرا دیا۔ کوڑوں سے اُسے پیٹا گیا۔ اور وہ ثابت قدم رہا۔ اور وہ مناصب جن کے پیچھے لوگ دوڑتے پھرتے ہیں۔کبھی قبول نہ کیے۔ (الذھبی، مناقب الامام ابوحنیفہؒ صفحہ ۱۱۵ بحوالہ خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۲۷) حسن بن زیاد کہتے ہیں۔''خدا کی قسم! ابوخنیفہ نے کبھی کسی امیر کا عطیہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا''۔

عقیدہ اہل سنت کی توضیح:

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت اور بنواُمیہ کے آغازِ سلطنت میں مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے تھے۔اُن سے چار بڑے فرقے وجود میں آگئے تھے۔گوکہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم کا مسلک اگرچہ معین تھا۔ کیونکہ عام مسلمان اس پر چل رہے تھے تاہم امام ابو حنیفہ کے وقت تک کسی نے اس کو دوٹوک طریقے سے ایک واضح تحریر کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''الفقہ الاکبر'' لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل سنت و الجماعت کوثبت کیا۔ اس میں اہم سوالات تین ہیں۔(۱) خلفائے راشدین کی پوزیشن (۲) جماعتِ صحابہ کی پوزیشن (۳) ایمان کی تعریف۔

امام ابوحنیفہ نے ان مسائل کے متعلق اہل سنت کا جو مسلک ثبت کیا ہے وہ مختصر طور پر حسبِ ذیل ہے۔

خلفائے راشدین کے بارے میں:

رسول اللہ کے بعد افضل الناس حضرت ابوبکر صدیقؓ پھر حضرت عمرؓ بن خطاب، پھر حضرت عثمانؓ بن عفان، پھر حضرت علیؓ بن ابی طالب، یہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ رہے۔
عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے:۔
''ہم رسول اللہ کے بعد ابوبکر صدیقؓ کو تمام اُمت پر افضل قرار دیتے ہوئے سب سے پہلے خلافت اُن کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ پھر عمرؓ بن الخطاب کے لیے، پھر عثمان، پھر علیؓ بن ابی طالب کے لیے۔ اور یہ خلفاء راشدین و ائمۂ مہدیین ہیں۔(شرح الطحاویہ از ابن ابی العز الحنفی صفحہ ۴۰۳ تا ۴۱۶، خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۳۲۔

صحابہ کرام کے بارے میں:

''ہم صحابہؓ کا ذکر بھلائی کے سوا اور کس طرح نہیں کرتے۔(ملا علی قاری صفحہ ۸۷ بحوالہ خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۳۲)
عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تفصیل ہے۔
''رسول اللہ کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں۔ اُن میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گزرتے۔ اور نہ کسی سے تبّری کرتے ہیں۔ ان سے بُغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں۔ اور اُن کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے (ابن ابی العز صفحہ۳۹۸ بحوالہ خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۳۳)

تعریف ایمان:

''ایمان نام ہے اقرار اور تصدیق کا'' (ملا علی قاری صفحہ ۱۰۳)
الوصیّہ میں اس کی تشریح امام نے اس طرح کی ہے۔''نہ اقرار اکیلا ایمان ہے اور نہ محض معرفت ہی کو ایمان کہا جا سکتا ہے''۔ آگے چل کر اس کی مزید تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں''۔ عمل ایمان سے الگ ایک چیز ہے اور ایمان عمل سے الگ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بسا اوقات مومن سے عمل مرتفع ہو جاتا ہے مگر ایمان اُس سے مرتفع نہیں ہوتا۔۔۔مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقیر پر زکواۃ واجب نہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر ایمان واجب نہیں''۔ اس طرح اُنہوں نے خوارج کے اس خیال کی تردید کر دی کہ عمل ایمان کی حقیقت میں شامل ہے اور گناہ لازماً عدم ایمان کا ہم معنیٰ ہے۔

گناہ اور کفر کا فرق:

''ہم کسی مسلمان کو کسی گناہ کی بنا پر خواہ وہ کیسا ہی بڑا گناہ ہو، کافر نہیں قرار دیتے جب تک کہ وہ اس کے حلال ہونے کا قائل نہ ہو۔

ہم اس سے ایمان کا نام سلب نہیں کرتے بلکہ اُسے حقیقتاً مومن قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسا ہو سکتا ہے کہ مومن شخص فاسق ہو اور کافر نہ ہو''۔
(ملا علی قاری صفحہ ۸۶ تا ۸۹)

الوصیّہ میں امام اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

''اُمتِ محمد کے گناہ گار سب مومن ہیں، کافر نہیں ہیں''۔ (ملاّ حسین صفحہ ۶)

عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح یہ ہے:۔

''بندہ خارج از ایمان نہیں ہوتا مگر صرف اس چیز کے انکار سے جس کے اقرار نے اُسے داخلِ ایمان کیا تھا''۔
(ابن ابی العِز صفحہ ۲۶۵)

۔گناہ گار مومن کا انجام:

''ہم یہ نہیں کہتے کہ مومن کے لیے گناہ نقصان دِہ نہیں ہے اور ہم نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اگر وہ فاسق ہو''۔۔۔۔۔اور ہم مُرجئہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں ضرور مقبول اور ہماری بُرائیاں ضرور معاف ہو جائیں گی''۔
(ملا علی قاری صفحہ ۹۲، ۹۳)

عقیدۂ طحاویہ اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہے:۔

''ہم اہل قبلہ میں کسی کے نہ جنتی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں نہ دوزخی ہونے کا۔ اور نہ ہم اُن پر کفر یا شرک یا منافقت کا حکم لگاتے ہیں۔ جب تک کہ اُن سے ایسی کسی بات کا عملاً ظہور نہ ہو اور اُن کی نیتوں کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں'' (ابن ابی العِز صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳)

اس عقیدے کے نتائج:

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

''اس طرح امام نے شیعہ و خوارج اور معتزلہ و مُرحبۂ کی انتہائی آرا کے درمیان ایسا متوازن عقیدہ پیش کیا جو مسلم معاشرے کو انتشار اور باہمی تصادم و منافرت سے بھی بچاتا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی بے قیدی اور گناہوں پر جسارت سے بھی روکتا ہے۔جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدہ اہل سنت کی یہ وضاحت پیش کی تھی۔ اُس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اُن کا بڑا کارنامہ تھا جس سے اُنہوں نے اُمت کو راہِ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی تھی۔

اس عقیدے کے معنی یہ تھے۔ کہ اُمت اُس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبی نے قائم کیا تھا۔ اُس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کیے تھے اُمت اُن کو تسلیم کرتی ہے۔ جن اصحاب کو اُنہوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اُن کی خلافت کو بھی اور اُن کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے۔ اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی وہ قبول کرتی ہے۔ جو اُس معاشرے کے افراد یعنی صحابہ کرامؓ کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔ یہ عقیدہ اگر چہ امام ابوحنیفہؒ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا۔ بلکہ اُمت کا سوادِاعظم اُس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا مگر امام نے اسے تحریری شکل میں مرتب کرکے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ متفرق گروہوں کے مقابلہ میں اُن کا امتیازی مسلک کیا ہے۔
(خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۳۶)

قانونِ اسلامی کی تدوین:

امام ابوحنیفہ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انہیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی یہ تھا کہ اُنہوں نے اُس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر بھر دیا۔ جو خلافتِ راشدہ کے بعد شوریٰ کا سدِ باب ہو جانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا--- اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکام اور قاضی سب محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روزمرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو ہر وقت حل کر لینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہ تھا----اس صورتِ حال میں امام ابوحیفہؒ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع قانون (private legislature)قائم کریں---اُنہوں نے ایک کمال درجہ کے دانا اور دوراندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کر لیا کہ وہ اس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے بھر سکتے ہیں اور اس کے بھرنے سے یہ خلا واقعی بھر جائے گا۔

اس مجلس کے شرکاء امام کے اپنے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک اُنہوں نے اپنے مدرسۂ قانون میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی---امام نے خود ایک مرتبہ اپنی گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبہ کو لوگ تھے:۔

''یہ ٣٦ آدمی ہیں جن میں سے ٢٨ قاضی ہونے کے لائق ہیں۔ ٦ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور ٢ اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں''------
''اس مجلس کا طریق کار یہ تھا کہ ''اُن کے شاگرد ایک مسئلہ پر خوب دل کھول کر بحث کرتے اور ہر فن کے نقطہ نظر سے گفتگو کرتے۔ اس دوران میں امام خاموشی کے ساتھ اُن کی تقریریں سنتے رہتے تھے۔ پھر جب امام زیر بحث مسئلے پر اپنی تقریر شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سکوت ہوتا جیسے یہاں ان کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا ہے''۔
اس مجلس میں ٨٣ ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے تھے۔ اور اُن کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابو حنیفہؒ کی زندگی میں کر دیا گیا تھا۔(ہم نے مختصر طور پر بیان کیا ہے۔تفصیلات کے لیے ملا حظہ فرمائیں۔ مبادیات اصول فقہ از عبدالطیف خان گنڈا پور و محمد خان منہاس، امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی، امام ابو حنیفہ از ابوزہرہ، خلافت و ملوکیت از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)
اس باقاعدہ تدوین قانون (codification) کا اثر یہ ہوا۔ کہ انفرادی طور پر کام کرنے والے مجتہدوں، مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا گیا---عوام اور حکام، اور قضاۃ سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوگئے۔ کیونکہ یہ وقت کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اس چیز کے حاجت مند تھے--- اور یوں معاملات کا چلن اس پر ہوگیا-----
اسی طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رونما ہوا۔ کہ ایک شخص واحد کی قائم کردہ نجی مجلس وضع قوانین کا مرتب کیا ہوا قانون اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہوا کہ اس نے مسلم مفکرین قانون کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے وہ اپنے طرزِ اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں۔ مگر اُن کے لیے نمونہ یہی تھا۔ جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی۔ (خلافت و ملوکیت صفحہ ٢٣٤ تا ٢٤٣)
یہاںہمارے موضوع سے متعلق بعض اہم مسائل کے سلسلے میں اُن کی آرا کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ سیاست کے باب میں امام ابوحنیفہ ایک نہایت مفصل رائے رکھتے تھے جو ریاست و امارت کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھی۔

حاکمیت کا مسئلہ:

اس حاکمیت کے باب میں اُن کا نظریہ وہی تھا۔ جو اسلام کا مسلّم بنیادی نظریہ ہے یعنی اصل حاکم اللہ ہے۔ رسول اس کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع ہیں اور اللہ اور رسول کی شریعت وہ قانونِ برتر ہے جس کے مقابلے میں اطاعت و اتباع کے سوا اور کوئی طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ابن حزم کا بیان ہے۔''تمام اصحاب ابوحنیفہ اس پر متفق ہیں کہ ابوحنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے'' (الذہبی صفحہ ۲۱)۔ اُن پر جب یہ الزام لگا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ تو اُنہوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔''بخدا اُس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نصّ پر مقدم رکھتے ہیں۔بھلا نصّ کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے''۔ (الشعرانی، کتاب المیزان جلد ۱ صفحہ۶۱)

خلافت کا انعقاد:

خلافت کے متعلق امام ابوحنیفہ کی رائے یہ تھی کہ پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔ اس رائے کو اُنہوں نے ایک ایسے نازک موقع پر بیان کیا۔ جبکہ اسے زبان پر لانے والے کا سر اس کی گردن پر باقی رہنے کا احتمال نہ تھا۔

المنصور کے حاجب ربیع بن یونس کا بیان ہے کہ منصور نے امام مالک، ابن ابی ذئب اور امام ابو حنیفہ کو بلایا۔اور اُن سے کہا۔'' یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس اُمت میں مجھے عطا کی ہے۔اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟کیا میں اس کا اہل ہوں؟''

امام مالک نے کہا'' اگر آپ اس کے اہل نہ ہوتے تو اللہ اسے آپ کے سُپرد نہ کرتا''۔

ابن ابی ذئب نے کہا'' دُنیا کی بادشاہی اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے مگر آخرت کی بادشاہی اُس کو دیتا ہے جو اس کا طالب ہو۔ اور جسے اللہ اُس کی توفیق دے۔ اللہ کی توفیق آپ سے قریب ہو گی اگر آپ اس کی اطاعت کریں ورنہ اس کی نافرمانی کی صورت میں وہ آپ سے دور رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقویٰ کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے۔ اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرے اس کے لیے کوئی تقویٰ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کے مددگار توفیق سے خارج اور حق سے منحرف ہیں۔ اب اگر آپ اللہ سے سلامتی مانگیں اور پاکیزہ اعمال

سے اس کا تقرب حاصل کریں تو یہ چیز آپ کو نصیب ہوگی ورنہ آپ خود ہی اپنے مطلوب ہیں''
امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جس وقت ابن ابی ذئب یہ باتیں کر رہے تھے میں نے اور مالک نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ شاید ابھی اُن کی گردن اُڑا دی جائے گی۔ اور اُن کا خون ہمارے کپڑوں پر پڑے گا۔ اس کے بعد منصور امام ابو حنیفہ کی طرف متوجہ ہوا۔اور بولا آپ کیا کہتے ہیں۔اُنہوں نے جواب دیا ''اپنے دین کی خاطر راہِ راست تلاش کرنے والا غصے سے دور رہتا ہے۔اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے۔ بلکہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کے منشا کے مطابق بات کہیں اور وہ عوام کے علم میں آجائے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہلِ فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا۔ حالانکہ خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے''۔
یہ باتیں کرکے تینوں صاحب اُٹھ گئے۔ پیچھے منصور نے ربیع کو تین توڑے درہموں کے دے کر ان تینوں اصحاب کے پاس بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اگر مالک لے لیں تو اُن کو دے دینا لیکن اگر ابوحنیفہ اور ابنی ابی ذئب انہیں قبول کر لیں۔تو اُن کا سر اُتار لانا۔امام مالک نے یہ عطیہ لے لیا۔ ابن ابی ذئب کے پاس جب ربیع پہنچا تو اُنہوں نے کہا میں اس مال کو خود منصور کے لیے بھی حلال نہیں سمجھتا۔ اپنے لیے کیسے حلال سمجھوں۔<u>ابو حنیفہ نے کہا۔ خواہ میری گردن ہی کیوں نہ مار دی جائے میں اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔</u>
منصور نے یہ رُوداد سن کر کہا۔''اس بے نیازی نے ان دونوں کا خون بچا دیا''۔

<u>فاسق و ظالم کی امامت:</u>

دو چیزیں ایسی تھیں جو اُس زمانے میں اہلیت خلافت کی شرائط کی حیثیت میں زیر بحث آچکی تھیں۔ اور جن کے متعلق صراحت مطلوب تھی۔ ایک یہ کہ ظالم و فاسق جائز خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ خلافت کے لیے قرشی ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ہم یہاں اپنے موضوع کے لحاظ سے پہلی شرط سے بحث کریں گے۔ کیونکہ دوسری شرط اس وقت ہمارے موضوع سے متعلق نہیں۔

<u>پہلی چیز کے متعلق امام کی رائے کے دو پہلو ہیں:</u>جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔۔ جس زمانے میں انہوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے وہ عراق میں خصوصاً اور دُنیائے اسلام میں

عموماً دو انتہا پسندانہ نظریات کی سخت کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک طرف یہ کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق کی امامت قطعا ناجائز ہے اور اس کے تحت مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق خواہ کسی طرح بھی ملک پر قابض ہو جائے اُس کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد اس کی امامت و خلافت پوری طرح جائز ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان امام اعظمؒ نے ایک نہات متوازن نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل یہ ہے -

الفقہ الاکبر میں وہ فرماتے ہیں:۔''مومنوں میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے''۔

(ملا علی قاری صفحہ ۹۱)

اور عقیدہ طحاویہ میں امام طحاوی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اور حج و جہاد مسلمانوں کے اولی الامر کے ماتحت قیامت تک جاری رہیں گے۔ خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ان کاموں کو کوئی چیز باطل نہیں کرتی اور نہ ان کا سلسلہ منقطع کر سکتی ہے''۔

(ابن ابی العِز صفحہ ۳۲۲)

یہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امام کے نزدیک خلافت کے لیے عدالت شرطِ لازم ہے۔ کوئی ظالم و فاسق آدمی جائز خلیفہ یا قاضی یا حاکم یا مفتی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بن بیٹھا ہو تو اس کی امامت باطل ہے۔اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے عملاً قابض و متصرف ہو جانے کے بعد مسلمان اس کے تحت اپنی اجتماعی زندگی کے جو کام صحیح شرعی طریقے سے انجام دیں گے وہ جائز ہوں گے۔ اور اس کے مقرر کیے قاضی عدل کے ساتھ جو فیصلے کریں گے۔ وہ نافذ ہو جائیں گے۔ اس مسئلے کو امام ابوبکر جصاص نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تفصیل کے لیے اُن کی کتاب احکام القرآن جلد نمبر۱ صفحہ۸۰ تا ۸۱ اورنسرفی کی البسوط جلد نمبر۱۰ صفحہ ۱۳۰ ملاخظہ فرمائیں۔

امام ذہبی اور الموفّق المّکی دونوں امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''جو امام فَے (یعنی پبلک خزانے) کا ناجائز استعمال کرے یا حکم میں ظلم سے کام لے اُس کی امامت باطل ہے۔ اور اس کا حکم جائز نہیں ہے''۔ (الذہبی صفحہ۱۷ المکی جلد نمبر۲ صفحہ ۱۰۰)

مولانا مودودی ان کی اس رائے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ موجودہ زمانے کی قانونی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے تبصرہ فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

‘‘ان بیانات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ امام ابوحنیفہ خوارج اور معتزلہ کے برعکس بالحق (dejure) اور بالفعل (defacto) میں فرق کرتے ہیں۔ خوارج و معتزلہ کے مسلک سے لازم آتا تھا کہ اگر امام عادل و صالح یعنی امام بالحق (dejure)موجود نہ ہو تو مسلم معاشرے اور ریاست کا پورا نظام معطل ہو جائے۔ نہ حج ہو سکے، نہ جمعہ و جماعت ہو، نہ عدالتیں قائم ہوں۔ نہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی کام یا سیاسی و معاشرتی کام جائز طور پر انجام پائے۔ امام ابوحنیفہ اس غلطی کی اصلاح یو نکرتے ہیں۔ کہ بالحق امام (dejure)اگر میسر نہ ہو تو بالفعل (defacto)جو بھی مسلمانوں کا امام ہو اُس کے ماتحت مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی کا نظام جائز طور پر چلتا رہے گا، خواہ بجائے خود اس امام کی امامت جائز نہ ہو۔

معتزلہ و خوارج کی اس انتہا پسندی کے مقابلہ میں جو دوسری انتہا مرجیۂ اور خود اہل سنت کے بعض آئمہ نے اختیار کی تھی۔ امام ابوحنیفہ نے مسلمانوں کو اس سے اور اس کے نتائج سے بچایا ہے۔ وہ لوگ بھی بالفعل اور بالحق کے درمیان خلط ملط کر گئے تھے۔ اور اُنہوں نے فاسق کی بالفعل امامت (defacto) کو اس انداز سے جائز ٹھہرایا تھا کہ گویا وہی بالحق (dejure)بھی ہے۔ اس کالازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمان جابر و ظالم اور بدکردار رہنماؤں کی حکومت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں اور اسے بدلنے کی کوشش تو درکنار، اس کی فکر تک چھوڑ دیں۔ امام ابوحنیفہ نے اس غلط خیال کی اصلاح کے لیے پورے زور سے اس حقیقت کا اعلان و اظہار کیا کہ ایسے لوگوں کی امامت قطعا باطل ہے۔’’(خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۵۰ تا ۲۵۴)

۔بیت المال کے سلسلے میں اُن کی حق گوئی اور بے باکی:۔اپنے وقت کے خلفاء کی جن باتوں پر امام سب سے زیادہ معترض تھے۔ ان میں سے ایک سرکاری خزانے پر اُن کے بے جا تصرفات اور لوگوں کی املاک پر اُن کی دست درازیاں تھیں۔اُن کے نزدیک حکم میں جَور اور بیت المال میں غُلول (خیانت) ایک امام کی امامت کو باطل کر دینے والے افعال تھے---وہ اس کو بھی جائز نہ رکھتے تھے۔ کہ بیرونی ممالک سے جو تحفے اور ہدیے خلیفہ کے پاس آئیں اُن کو وہ اپنی ذاتی مِلک بنالے۔

اُن کے نزدیک یہ چیزیں پبلک کے خزانے کا حق تھیں نہ کہ خلیفہ اور اس کے خاندان کا۔ کیونکہ اگر وہ مسلمانوں کا خلیفہ نہ ہوتا اور بین الاقوامی دُنیا میں ان کی اجتماعی قوت و سعی کی بدولت اس کی دھاک قائم نہ ہوئی ہوتی تو کوئی اُس کو گھر بیٹھے ہدیے نہ بھیجتاوہ بیت

المال سے خلیفہ کے بے جا مصارف اور عطیات پر بھی معترض تھے۔ اور یہ اُن وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ تھی جن کی بنا پر وہ خود خلیفہ کے عطیے قبول نہ کرتے تھے۔
(سرخسی جلد نمبر ۱ صفحہ ۹۸)
جس زمانے میں اُن کے اور خلیفہ منصور کے درمیان سخت کشمکش چل رہی تھی۔منصور نے اُن سے کہا تم میرے ہدیے کیوں نہیں قبول کرتے؟اُنہوں نے جواب دیا ''امیر المومنین نے اپنے مال میں سے مجھے کب دیا تھا کہ میں نے اسے ردّ کیا ہو۔ اگر آپ اس میں سے دیتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ آپ نے تو مسلمانوں کے بیت المال سے مجھے دیا۔ حالانکہ ان کے مال میں میرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے نہ اُن کے لیے لڑنے والا ہوں۔ کہ ایک سپاہی کا حصہ پاؤں، نہ اُن کے بچوں میں سے ہوں۔ کہ بچوں کا حصہ مجھے ملے۔ اور نہ فقرا میں سے ہوں کہ جو کچھ فقیر کو ملنا چاہئے وہ مجھے ملے۔
(المکی جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۱۵)
<u>پھر جب المنصور نے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر اُنہیں ۳۰ کوڑے</u> مارے اور ان کا سارا بدن لہو لہان ہو گیا تو خلیفہ کے چچا عبدالصمد بن علی نے اُس کو سخت ملامت کی--- منصور نے اس پر نادم ہو کر فی تازیانہ ایک ہراز درہم کے حساب سے ۳۰ ہزار درہم امام کو بھجوائے۔ لیکن اُنہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا کہ لے کر خیرات کر دیجئے۔ جواب میں فرمایا ''کیا ان کے پاس کوئی مال حلا ل بھی ہے'' (ایضاً صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶)
اس کے قریب زمانے میں جب پے درپے تکلیفیں سہتے سہتے <u>ان کا آخر وقت آگیا۔ تو انہوں نے وصیت کی کہ بغداد کے اُس حصے میں دفن نہ کیا جائے جسے شہر بسانے کے لیے منصور نے لوگوں کی املاک میں سے غصب کر لیا تھا</u>۔ منصور نے اس وصیت کا حال سنا تو چیخ اُٹھا کہ ''ابوحنیفہ زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے کون مجھے بچائے۔(ایضاً جلد نمبر۲ صفحہ ۱۸۰)
<u>عدلیہ کی انتظامیہ سے آزادی اور قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرنے سے انکار</u>:-
عدلیہ کے متعلق اُن کی قطعی رائے یہ تھی کہ اسے انصاف کرنے کے لیے انتظامیہ کے دباؤ اور مداخلت سے نہ صرف آزاد ہونا چاہیے۔ بلکہ قاضی کو اس قابل ہونا چاہیے۔ کہ خود خلیفہ بھی اگر لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرے تو وہ اُس پر اپنا حکم نافذ کر سکے---بنی اُمیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں حکومت کے مناصب اور خصوصاً قضا کا عہدہ قبول کرنے سے اُنکے انکار کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی

کہ وہ ان دونوں حکومتوں میں قضا کی یہ حیثیت نہ پاتے تھے۔۔۔بلکہ اُنہیں اندیشہ تھاکہ کہ اُنہیں آلۂ ظلم بنایا جائے گا۔ اُن سے غلط فیصلے کرائے جائیں گے اور اُن کے فیصلوں میں نہ صرف خلیفہ بلکہ اُس سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ بھی مداخلت کریں گے۔
سب سے پہلے بنی اُمیہ کے عہد میں عراق کے گورنر یزید بن عمر بن ہبیرہ نے اُن کو منصب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اُس نے بڑے بڑے فقہا کو بلاکر اہم مناصب دیئے۔مگر امام نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا۔ تو اُس نے اُنہیں قید کردیا۔اور کوڑے لگوانے کی دھمکی دی۔ دوسرے فقہا نے امام کو سمجھایا کہ اپنے اوپر رحم کرو، ہم سب اس خدمت سے ناخوش ہیں مگر مجبوراً اسے قبول کیا ہے تم بھی مان لو۔ امام نے جواب دیا۔''اگر وہ مجھ سے چاہے کہ اس کے لیے واسط کی مسجد کے دروازے گنوں تب بھی میں قبول نہ کروں گا۔ کجا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی آدمی کے قتل کا حکم لکھے اور میں اس فرمان پر مہر لگاؤں۔ خدا کی قسم میں اس ذمہ داری میں شریک نہ ہونگا''۔ اس سلسلے میں ابن ہبیرہ نے اُن کے سامنے اور خدمات پیش کیں پھر اُس نے اُن کو قاضی کوفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پر قسم کھائی کہ اگر امام انکار کریں۔ تو میں اُنہیں کوڑے لگاؤنگا۔ '' ابو حنیفہ نے بھی جواب میں قسم کھائی اور کہا ''دُنیا میں اس کے کوڑے کھالینا میرے لیے آخرت کی سزا بھگتنے سے زیادہ سہل ہے۔ خدا کی قسم میں ہر گز قبول نہ کرونگا۔ خواہ وہ مجھے قتل ہی کر دے۔ آخر کار اُس نے ان کے سر پر ۲۰ یا ۳۰ کوڑے لگوائے۔ اور بعض روایات یہ ہیں کہ دس گیارہ روز تک وہ روزانہ دس کوڑے لگواتا رہا مگر ابوحنیفہ اپنے انکار پر قائم رہے۔
اس کے بعد عباسی عہد میں المنصور نے عہدۂ قضا کے لیے اصرار شروع کیا۔ نفس زکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم کے خروج میں امام نے اُن کا کھلم کھلا ساتھ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے منصور کے دل میں اُن کے خلاف گرہ بیٹھی ہوئی تھی مگر ان جیسے بااثر آدمی پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔ اس لیے وہ اُسے سونے کی زنجیروں سے باندھ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے اُس کے سامنے باربار قضا کا منصب اسی نیت سے پیش کیا۔ یہاں تک کہ اُنہیں تمام سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کرنے کی پیش کش کی۔ مگر وہ ایک مدت تک طرح طرح کے حیلوں سے اس کو ٹالتے رہے۔(المکی جلد نمبر۲ صفحہ ۱۷۳،۱۷۳، ۱۷۸) آخر کارجب وہ بہت ہی زیادہ مُصِر ہوا۔ تو امام نے اُس کو صاف صاف اپنے انکار کے وجوہ بتائے۔ ایک مرتبہ کی گفتگو میں اُنہوں نے بڑے نرم انداز میں

معذرت کرتے ہوئے کہا‘‘قضا کے لیے نہیں موزوں ہو سکتا وہ شخص جو اتنی جان رکھتا ہو کہ آپ پر اور آپکے شاہ زادوں اور سپہ سالاروں پر قانون نافذ کر سکے۔ مجھ میں یہ جان نہیں ہے مجھے تو جب آپ بلاتے ہیں۔ تو واپس نکل کر ہی میری جان میں جان آتی ہے۔‘‘ ایک اور موقع پر زیادہ سخت گفتگو ہوئی۔جس میں اُنہوں نے خلیفہ کو مخاطب کرکے کہا:۔

‘‘خدا کی قسم میں تو اگر رضامندی سے بھی یہ عہدہ قبول کروں تو آپ کے بھروسے کے لائق نہیں ہوں۔ کجا کہ ناراضی کے ساتھ مجبوراً قبول کروں۔ اگر کسی معاملے میں میرا فیصلہ آپ کے خلاف ہوا۔ اور پھر آپ نے مجھے دھمکی دی۔ کہ یا تو میں تجھے فرات میں غرق کردونگا۔ورنہ اپنا فیصلہ بدل دے۔ تو میں غرق ہو جانا قبول کر لوں گا۔ مگرفیصلہ نہ بدلوں گا پھر آپ کے بہت سے اہل دربار بھی ہیں۔ اُنہیں تو کوئی ایسا قاضی چاہیے۔ جو آپ کی خاطر ان کا بھی لحاظ کرے۔

(ایضاً جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۱۵ و جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۷۰)

ان باتوں سے جب منصور کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ شخص سنہری پنجرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں۔ تو وہ عریاں انتقام پر اُتر آیا۔ اُنہیں کوڑوں سے پٹوایا۔جیل میں ڈال کر کھانے پینے کی سخت تکلیفیں دیں۔ پھر ایک مکان میں نظر بند کر دیا جہاں بقول بعض طبعی موت سے اور بقول بعض زہر سے اُن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ (ایضاً جلد نمبر۲ صفحہ ۱۷۳ تا ۱۸۲ ابن خلکان جلد ۵ صفحہ ۴۶)

اظہار رائے کی آزادی کا حق:

امام کے نزدیک مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست میں قضا کی آزادی کے ساتھ آزادی اظہار رائے کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ جس کے لیے اسلام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ امام ابو حنیفہ کو اس حق اور اس فرض کی اہمیت کا سخت احساس تھا۔ کیونکہ اُن کے زمانے میں سیاسی نظام میں مسلمانوں کا یہ حق سلب کر لیا گیا تھا۔ اور اس کی فرضیت کے معاملے میں بھی لوگ مذبذب ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک طرف مرجیۂ اپنے عقائد کی تبلیغ سے لوگوں کو گناہ پر جرأت دلا رہے تھے۔ دوسری طرف حشویہ اس بات کے قائل تھے۔ کہ حکومت کے مقابلے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک فتنہ ہے۔ اور تیسری طرف بنی امیہ و بنی عباس کی حکومتیں طاقت سے مسلمانوں کی اس روح کو کچل رہی تھیں۔ کہ وہ امرا کے فسق و فجور اور ظلم و جور کے خلاف آواز اُٹھائیں۔

اس لیے امام ابوحنیفہ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے اس روح کو زندہ کرنے کی اور اس کے حدود واضح کرنے کی کوشش کی ۔

الجصاص کابیان ہے کہ ابراہیم الصائغ (خراسان کے ایک مشہور اور با اثر فقیہ) کے سوال پر امام نے فرمایا۔ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔ اور اُن کو عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے رسول اللہ کا یہ ارشاد سنایا۔ (یہ ہم اس کتاب میں پہلے بھی باب اول میں نقل کر چکے ہیں) کہ ''افضل الشہدا ایک تو حمزہ بن عبدالمطلب ہیں۔ دوسرے وہ شخص جو ظالم امام کے سامنے اُٹھ کر اسے نیک بات کہے اور بدی سے روکے اور اس قصور میں مارا جائے''۔ ابراہیم پر امام کی اس تلقین کا اتنا زبردست اثر ہوا۔ کہ جب وہ خراسان واپس گئے۔ تو اُنہوں نے عباسی سلطنت کے بانی ابو مسلم خراسانی کو اُس کے ظلم و ستم اور ناحق کی خون ریزی پر برملا ٹوکا اور باربار ٹوکا۔ یہاں تک کہ آخرکار اُس نے اُنہیں قتل کر دیا۔ (احکام القرآن جلد نمبر ۱ صفحہ ۸۱)

نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کے خروج کے زمانے میں امام ابوحنیفہ کا اپنا طرز عمل یہ تھا کہ وہ علانیہ اُن کی حمایت اور منصور کی مخالفت کرتے تھے۔

۱۴۸ ہجری، ۷۶۵ ء میں اہل موصل نے بغاوت کی۔ منصور اس سے پہلے ایک بغاوت کے بعد اُن سے یہ عہد لے چکا تھا۔ کہ آئندہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو اُن کے خون اور مال اس پر حلال ہوں گے۔ اب جو اُنہوں نے خروج کیا۔ تو منصور نے بڑے بڑے فقہا کو، جن میں ابو حنیفہ بھی تھے۔ بُلا کر پوچھا کہ معاہدے کی رو سے اُن کے خون اور مال مجھ پر حلال ہو گئے ہیں یا نہیں؟ دوسرے فقہا نے معاہدے کا سہارا لیا۔ اور کہا کہ آپ اُنہیں معاف کر دیں تو یہ آپ کی شان کے مطابق ہے۔ ورنہ جو سزا ابھی دنیا چاہیں دے سکتے ہیں۔ ابو حنیفہ خاموش تھے۔ منصور نے کہا یا شیخ! آپ کیا کہتے ہیں۔اُنہوں نے جواب دیا:۔

''اہل موصل نے آپ کے لیے وہ چیز مباح کی ہے جو اُن کی اپنی نہ تھی۔(یعنی اُن کے خون)اور آپ نے اُن سے وہ شرط منوائی جسے آپ منوانے کا حق نہ رکھتے تھے''۔بتائیے اگر کوئی عورت اپنے آپ کو نکاح کے بغیر کسی کے لیے حلال کردے۔ تو کیا وہ حلال ہو جائے گی۔اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ مجھے قتل کر دے۔تو کیا اُس کا قتل اُس کے لیے مباح ہوگا؟'' منصور نے کہا نہیں، امام نے کہا تو آپ اہل موصل سے ہاتھ روک لیجئے۔اُن کا خون بہانا آپ کے لیے حلال نہیں ہے''۔

یہ بات سن کر منصور نے ناراضی کے ساتھ فقہا کی مجلس برخاست کردی۔پھر ابو حنیفہ کو الگ بلا کر کہا ''بات تو وہی صحیح ہے جو آپ

نے کہی ہے۔ مگر تم ایسے فتوے نہ دیا کرو جن سے تمہارے امام پر حرف آئے۔ اور باغیوں کی ہمت افزائی ہو''۔ (ابن الاثیر جلد نمبر ۵ صفحہ ۲۵)

۔ظالم حکومت کے خلاف خروج کا مسئلہ:۔اُس زمانے میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کا امام ظالم و فاسق ہو تو آیا اُس کے خلاف خروج کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ تھا کہ ظالم کی امامت نہ صرف یہ کہ باطل ہے بلکہ اس کے خلاف خروج بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا جانا چاہئے۔ بشرطیکہ ایک کامیاب اور مفید انقلاب ممکن ہو، ظالم و فاسق کی جگہ عادل و صالح کو لایا جا سکتا ہو اور خروج کا نتیجہ محض جانوں اور قوتوں کا ضیاع نہ ہو۔

اُن کے زمانے میں حروج کے دو اہم واقعات ہوئے۔ پہلا واقعہ زید بن علی کا ہے یہ امام حسینؓ کے پوتے تھے۔

اس خروج میں امام ابو حنیفہ کی پوری ہمدردی اُن کے ساتھ تھی۔ اُنہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو اُن کا ساتھ دینےکی تلقین بھی کی۔ لیکن جب زید کا پیغام اُن کے نام آیا۔ تو اُنہوں نے قاصد سے کہا کہ اگر میں جانتا کہ لوگ اُس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور سچے دل سے اُن کی حمایت میں کھڑے ہونگے تو میں ضرور اُس کا ساتھ دیتا اور جہاد کرتا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اُسی طرح اُن سے بے وفائی کریں گے جس طرح اُن کے دادا (سیدنا حسینؓ) سے کر چکے ہیں۔ البتہ میں روپے سے اُن کی مدد ضرور کرونگا۔ یہ بات ٹھیک اُس مسلک کے مطابق تھی۔ جو آئمۂ جَور کے خلاف خروج کے معاملے میں امام نے اصولاً بیان کیا تھا۔ کیونکہ اُنہیں ظاہری آثار کو دیکھتے ہوئے یہ توقع نہ تھیکہ زید کے خروج سے کوئی کامیاب انقلاب رونما ہو سکے گا۔ دوسرے امام کے نہ اُٹھنے کی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ وہ خود اُس وقت تک بااثر نہیں ہوئے تھے۔ کہ اُن کی شرکت سے اس تحریک کی کمزوری کا مداوا ہو سکتا۔

دوسرا خروج نفس ذکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کا تھا۔ جو امام حسنؓ کی اولاد سے تھے۔ یہ ۱۴۵ ھ کا واقعہ ہے۔ جب امام ابوحنیفہ اپنے پورے اثرو رسوخ کو پہنچ چکے تھے۔ جب نفس ذکیہ نے مدینہ سے عملاً خروج کیا۔ تو منصور سخت گھبراہٹ میں بغداد کی تعمیر کو چھوڑ کر کوفہ پہنچا۔ کیونکہ اُس کی سلطنت کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ اس خروج کے موقع پر امام ابو حنیفہ کا طرز عمل پہلے خروج سے مختلف تھا۔ اُس زمانے میں جبکہ منصور کوفہ میں خود موجود تھا۔ امام نے بڑے زور شور سے کھلم کھلا اس تحریک کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ اُن کے شاگردوں کو خطرہ پیدا

ہوگیا۔ کہ ہم سب باندھ لیے جائیں گے۔ اور سب سے زیادہ اہم اور خطرناک اقدام یہ تھا۔ کہ اُنہوں نے منصورکے سپہ سالار اعظم حسن بن قحطبہ کو ان کے خلاف جنگ پر جانے سے روک دیا۔ یہ طرز عمل بھی ٹھیک ٹھیک امام کے اس نظریے کے مطابق تھا۔ کہ ایک کامیاب اور صالح انقلاب کے امکانات ہوں۔ تو ظالم حکومت کے خلاف خروج جائز ہی نہیں واجب ہے۔ اس معاملے میں امام مالک کا طرزِ عمل بھی امام ابوحنیفہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ نفس ذکیہ کے خروج کے موقع پر جب اُن سے پوچھا گیا کہ ہماری گردنوں میں تو خلیفہ االمنصور کی بیعت ہے۔ تو اب ہم دوسرے مدعی خلافت کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں۔تو اُنہوں نے فتویٰ دیا کہ عباسیوں کی بیعت جبری تھی۔ اور جبری بیعت، قسم، طلاق جو بھی ہو۔ باطل ہے۔ اس فتوے کی وجہ سے بکثرت لوگ نفس ذکیہ کے ساتھ ہو گئے۔ اور بعد میں امام مالک کو اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑا۔ کہ مدینہ کے عباسی گورنر جعفر بن سلیمان نے اُنہیں کوڑے لگوائے اور اُن کا ہاتھ شانے سے اُکھڑ گیا۔(تفصیل الطبری جلد نمبر٦ ابن خلکان جلد ٣۔ابن کثیر البدایہ و النہایہ جلد نمبر ١٠ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی''میں ملاخظہ فرمائیں) مزید تفصیل مولانا مودودی کی کتاب تفہیمات حصہ سوم اور تفہیم القرآن سورہ حجرات حاشیہ نمبر١٧) میں دیکھیں۔

(یہ مضمون مولانا مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت صفحہ ١٨٧ تا ٢٧۵ کی تلخیص ہے)

امام احمد بن حنبلؒ

آپ کا نام احمد بن محمد بن حنبل اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ آپ دادا کی نسبت سے ‘‘ابن حنبل’’ مشہور ہوئے آپ کی پیدائش ۱۶۴ ھجری کو بغداد میں ہوئی۔ آپ کو حدیث سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ حفظ کر لیاتھا۔ آپ کی اس کتاب کا نام ‘‘مسند احمد’’ ہے۔

امام احمد بن حنبل اپنے وقت کے امام اور عظیم محدث تھے۔عقیدہ خلقِ قرآن کے اُس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا۔محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور مدمقابل تھے۔ اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبل اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔ مامون الرشید کے بعد اُن کے جانشین معتصم نے اُن کی پالیسی پر من و عن عمل کیا۔اور اس عقیدہ اور مسلک پر نہ صرف قائم رہے بلکہ اس سلسلے میں بدترین قسم کے تشدد سے بھی گریز نہ کیا۔

امام احمد کو رقہ سے بغداد لایا گیا ۔چار چار بیڑیاں اُن کے پاؤں میں پڑی تھیں۔ تین دن تک اُن سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا۔ لیکن وہ اپنے عقیدہ سے نہیں ہٹے۔ چوتھے دن والئی بغداد کے پاس اُن کو لایا گیا ۔اُس نے کہا کہ خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا۔ لیکن اُس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اُس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا۔ جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا۔ اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور اُنکو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے۔ ایک تازہ جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا۔ پھر دوسرا جلاد بلا لیا جاتا تھا۔ امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:

اَعطُونی شیاً من کتابِ اللہ اوسُنَّتہ رسولہ حتَّی اقول بہ۔

"میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اُس کے رسول کی سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اُس کو مان لوں"۔

امام احمد نے اس کی تفصیل خود بیان کی ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک چھوٹا اقتباس تاریخ الاسلام للذہبی سے طواساطت مولانا ابوالحسن علی ندوی تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول سے نقل کرتا ہوں۔

‘‘امام فرماتے ہیں’’ جب مناظرہ میں میری آواز سب پر غالب رہی تو معتصم نے کہا میری بات مان لو۔ میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کرونگا ۔ میں نے پہلاجواب دیا۔ جس پر اُس نے برہم ہو کر کہا۔ کہ ان کو پکڑو اور کھینچو اور اُن کے ہاتھ اُکھیڑدو۔ جلادوں سے کہا آگے بڑھو اور

کوڑے لگاؤ۔اُنیس کوڑوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آیا۔ کہ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔اسی طرح مجھے کوڑے لگتے رہے کہ پھر اس اثنا میں میرے حواس جاتے رہے۔ جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں کھول دی گئی ہیں اور حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تمہیں اوندھے منہ گرا دیا۔ تم کو روندا۔احمد کہتے ہیں مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا''

اس کے بعد اُن کو گھر پہنچایا گیا۔ جب سے وہ گرفتار ہوئے رہائی کے وقت تک ۲۸ مہینے اُن کو حبس میں گزرے ۳۳ یا ۳۴ کوڑے لگائے گئے۔ ابراہیم بن مصعب جو سپاہیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ میں نے اُن سے زیادہ جری اور دلیر شخص نہیں دیکھا۔اُن کی نگاہ میں لوگوں کی حقیقت بالکل مکھی کی سی تھی۔ محمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتاتو چیخ مار کر بھاگ جاتا۔ ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے۔ میں نے کہا آپ روزے سے ہیں اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لیے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش ہے لیکن اُنہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا۔

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے۔ ابوالعباس الرّقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقہ میں محبوس تھے۔ تو لوگوں نے اُن کو سمجھانا چاہا۔ اور اپنے بچاؤ کی حدیثیں سنائیں اُنہوں نے فرمایا کہ خبابؓ کی حدیث کاکیا جواب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض لوگ ایسے تھے جن کے سر پر آرہ رکھ کر چلا دیا جاتا پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹتے نہیں تھے۔

امام احمد کی بے نظیرثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کیلیے ختم ہو گیا۔ اور مسلمان ایک بڑے خطرے سے محفوظ ہو گئے۔ اور اُنکی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی۔

امام احمد حدیث میں امامِ وقت تھے۔ وہ بڑے زاہد و عابد تھے۔ یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلّم ہیں لیکن اُن کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز اُن کی عزیمت اور استقامت اس فتنہ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا۔اس مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ انتقال کے وقت سارا شہر اُمڈ آیا۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول از مولانا ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۰۷ تا ۱۲۸)

مولانا امین احسن اصلاحی امام احمد کے سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے لکھتے ہیں:۔

‘‘اس امت میں سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے صحابہ کے بعد میرے نزدیک سب سے اونچا درجہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ اُن کی زندگی سراپا سنت ہے۔ اور اُن کا ایک ایک قول و فعل بدعت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت۔ جب آدمی اُن کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو سنت کی حمایت اور بدعت کی مخالفت کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہیں۔میں اُن کو حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے حالاتِ زندگی کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دوں گا۔ (تزکیہ نفس از امین احسن اصلاحی صفحہ ۲۱۹)

امام غزالیؒ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔اُمت کی باگ ڈور بنو اُمیہ، بنو عباس اور ترکی النسل بادشاہوں کے ہاتھ میں آگئی۔ ان ادوار میں مسلمانوں میں یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفوں کو دولت و طاقت کے زور پر شائع کیا گیا۔دُنیا پرست علماء نے اُن کو مذہبی مناظروں کی چاٹ لگا دی۔اور پھرشاہی سرپرستی میں یہ مرض اتنا پھیلا کہ اُس نے تمام مسلم ممالک میں فرقہ بندی، اختلاف، اور سرپھٹول کی وبا پھیلا دی۔ جس نے مسلمانوں کی دینی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ پانچویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا۔ کہ

1. یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔
2. جاہل فرمانرواؤں کے اثر سے، اور علوم دینی کو مادی وسائل کی تائید بہم نہ پہنچنے کے سبب سے تقلید جامد کی بیماری پھیل گئی۔ اور مذہبی اختلافات نے نئے نئے فرقے پیدا کر دئیے۔
3. مسلم ممالک میں ہر طرف اخلاقی انحطاط رونما ہو گیا جس کے اثر سے کوئی طبقہ خالی نہ رہا۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی قرآن اور نبوت کی روشنی سے بڑی حد تک خالی ہو گئی۔
4. شاہی درباروں خاندانوں اور حکمران طبقوں کی عیاشانہ زندگی اور خود غرضانہ رویّوں کی وجہ سے عموماً رعایا تباہ حال ہو رہی تھی۔ ناجائز ٹیکسوں کے بارنے معاشی زندگی کو نہایت خراب کر دیا تھا۔ اور اُن فنون کا زور تھا جو شاہی درباروں میں قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اخلاق و تمدن کے لیے غارت گر تھے۔ (تجدید و احیائے دین، از سید مودودی صفحہ٦٣ تا ٦٨)

یہ حالات تھے جب پانچویں صدی کے وسط میں ۴۵۰ھجری بمطابق ۱۰۵۵ ؁ امام غزالی پیدا ہوئے۔

<u>مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک اُن کے تجدیدی کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔</u>

(i)فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے اُن کی بنیادوں پر حملہ

(ii)زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور اُنکی تنقید و اصلاح ۔

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول صفحہ۱٤۲)

ہم یہاں اس کارنامے کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

اولاً۔ اُنہوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کرکے اس پر تنقید کی اور اتنی زبردست تنقید کی کہ اس کا وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا کم ہو گیا۔ اور لوگوں پر اُن کی اصلیت بارے آگاہی ہوئی۔

ثانیاً۔ اُنہوں نے اُن غلطیوں کی اصلاح کی جو فلاسفہ اور متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حمایتی کر رہے تھے جو علومِ عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔امام غزالی نے مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے عقائد دینی کے اثبات کے لیے معقول دلائل موجود ہیں لہٰذا غیر معقول باتوں پر اصرار فضول ہے۔

ثالثاً۔اُنہوں نے نہ صرف اسلام کے عقائد کی معقول تعبیر پیش کی بلکہ احکام شریعت اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کیے۔ اور اس معاملے میں لوگوں کے سامنے اسلام کا صحیح تصور رکھا۔

رابعاً۔اُنہوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور اُن کے اختلافات پر نظر ڈالی۔ اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا۔ کہ اسلام اور کفر کی سرحدیں کیا ہیں۔اور کن حدود سےرائے اور تاویل میں تجاوز کرنے کے معنی اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کر لیا گیا ہے۔اسطرح اُنہوں نے لوگوں کے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔

خامساً۔اُنہوں نے دین کے فہم کو تازہ کیا۔تقلید جامد کی سخت مخالفت کی۔اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف پھر سے توجہ دلائی۔

سادساً۔اُنہوں نے فرسودہ نظام تعلیم پر تنقید کی۔ اور تعلیم کا ایک نیا نظام تجویز کیا۔ اُس وقت رائج نظام تعلیم میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ایک یہ کہ علوم دنیا اور علوم دین الگ الگ تھے۔ جس کا نتیجہ دین و دُنیا کی تفریق تھا۔ جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ شرعی علوم کی حیثیت سے بعض ایسی چیزیں داخلِ درس تھیں جو شرعی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔اور اُن کو غیر ضروری اہمیت دینے کی وجہ سے فرقے بندیاں پیدا ہو رہی تھیں۔امام غزالیؒ نے ان خرابیوں کو دور کرکے ایک سمویا ہوا نظام بنایا جس کی اُس وقت سخت مخالفت کی گئی مگر بعد میں جتنے نظامات تعلیم بنے وہ تمام تر انہی خطوط پر بنے جو امام نے کھینچ دئیے تھے۔ اس وقت مدارسِ عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔اُس کی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہین منت ہے۔

(تجدید و احیائے دین مولانا مودودی صفحہ ٦٨ تا٦٩)
سابعاً۔اُنہوں نے اخلاقِ عامہ کا پورا جائزہ لیا اور اس کا نتیجہ اُن کی کتاب احیاء العلوم ہے جو مولانا ندوی کے نزدیک اُن کے قلبی تاثرات، علمی تجربات،اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیت کا آئینہ ہے(دعوت و عزیمت جلد اول صفحہ ١٨٢) اس میں اُنہوں نے ہر طبقہ۔علماء، مشائخ، امراء، سلاطین اور عوام کی اخلاقی حالت پر براہ راست تنقید کی ہے۔اور اسلام کا صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

امام غزالی کی حق گوئی و بے باکی:

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے جو اُن کے نزدیک امت کا نمک ہیں اگر نمک بگڑ جائے تو اُس کو کونسی چیز درست کر سکتی ہے۔ اُن کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے۔ اُن کو علماء سے شکایت ہے کہ وہ علمائے سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فریضہ انجام نہیں دیتے۔ اُن کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دُنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں۔
امام غزالی کے نزدیک علماء سوء کے بعد دوسرا طبقہ جو عالمگیر فساد،اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا۔ وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا۔ امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبداللہ بن مبارک نے انہی دونوں علماء و سلاطین کے گروہوں کو دین کا بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔
وَ هَل افسد الدّین اِلاَّ الملوک وَ احبار سوٴ وَ رهبانها۔
امام غزالی نے ایک ایسے زمانے میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے اور اُن پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا۔ اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور اُن پر آزادانہ تنقید کی۔ اُن کے زمانے میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج تھا۔ امام غزالیؒ نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہ اور حرام بتلایا۔ اور مزید یہ کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز ہیں۔اس لیے کہ اس میں کثرت سے دینی مفاسد ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

‘‘آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق اُن کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اُن سے کام لے سکیں گے۔ ان سے اُن کو سہارا حاصل ہوگا، وہ اُن سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے۔ اُن سے اُن کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی اور وہ ہمیشہ دُعا گوئی، ثنا خوانی اور حاضر و غائب اُن کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے،دوسرا خدمت کے لیے آمدورفت کا، تیسرا تعریف و دُعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ وقت ضرورت اُنکے اغراض میں مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور درباداری جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت،دوستی اور حریفوں کے مقابلے میں اُن کی امداد و نصرتْ ساتواں اُن کے عیوب اور بداعمالیوں کی پروہ پوشی اگر کوئی شخص ان میں سےکسی درجہ کے لیے تیار نہیں تو خواہ وہ امام شافعی کے درجہ کا ہو، یہ سلاطین ایک پیسہ بھی اُن پر خرچ کرنا گوارا نہیں کرینگے۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے اس لیے کہ اس کے وہ نتائج جن کا ذکر اوپر ہوا ہے ظاہر ہیں۔ اس مال کا تو کیا ذکر، جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے۔ تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہا روں پر قیاس کرتا ہے۔

(احیاء علوم الدین جلد ۲ صفحہ۱۲۳ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول صفحہ ۱۹۳ تا ۲۰۰)

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خودمختار وزراء اور حکام کے اُس دور میں جب کہ پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی۔ اور جب شبہ پر قتل عام ہو سکتا تھا۔ امام غزالیؒ کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظامِ مالیات، آمد و رفت پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے علطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ(جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک اچھا خاصا جہاد تھا۔جس کی نزاکت کااندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری و دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جا سکتا۔ امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی بلکہ جب اُن کو بادشاہِ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں اُنہوں نے کلمۂ حق بلند کیا۔ ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان

کا فرمانروا تھا۔ امام غزالیؒ نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کرکے کہا:
''افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوق ہائے زرّیں کے بار سے''
محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا جس میں اُس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا، اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔
(مکتوبات امام غزالی بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ۲۰۰تا ۲۰۱)

امام ابن تیمیہؒ:

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔امام غزالی نے مسلمانوں کے ذہن پر سے فلاسفہ یونان، روم و عجم کا رعب خاصا کم کیا تھا۔اور کوشش کی تھی کہ دین کے فہم کو تازہ کریں اور لوگوں کو دوبارہ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کی طرف پھیر دیں۔اور ساتھ ہی ساتھ سلاطین، امرا، علماء وغیرہ کو رعایا کی تباہ حالی کی طرف توجہ دلائی اور اپنی اصلاح کی طرف ترغیب کے لیے خطوط بھی لکھے۔ تاہم سیاسی انقلاب کے لیے اُنہوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اُٹھائی اور نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اُن کے بعد مسلمان قوموں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ایک صدی بعد تاتاری طوفان کے دروازے ممالک اسلامیہ پر ٹوٹ پڑے اور اس نے اُن کے پورے تمدن کو تباہ کرکے رکھ دیا۔امام غزالی کے کام میں کمزوریوں سے بچ کر امام موصوف کے اصل کام یعنی اسلام کی ذہنی و اخلاقی روح کو زندہ کرنے اور بدعت و ضلالت کی آلائشوں کو نظام فکر و نظام تمدن سے چھانٹ چھانٹ کر نکالنے کے کام کوجس شخص نے آگے بڑھایا وہ ابن تیمیہ تھا۔
(تجدید و احیائےدین از سید مودودی صفحہ۴۲ تا ۴۳)
مسلمانوں کے اندر اُس دور میں جہاں فلاسفہ نے گمراہی پھیلائی ہوئی تھی تو دوسری طرف علمی اور درسی حلقوں میں صدیوں سے ایک جمود طاری تھا کہ اپنے گروہ کے فقہی دائرہ سے سرِمو قدم نکالنا جرم سمجھا جاتا تھا اور قرآن و حدیث کو ان فقہی مسلکوں اور اپنے

گروہ کے عمل کی عینک سےدیکھنے کا عام رواج تھا۔ اور قدیم فقہی ذخیرہ میں اضافہ ناممکن سمجھا جانے لگا تھا۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے ایک ایسے محدث، فقیہہ اور اُصولی کی ضرورت تھی جو پورے اسلامی علمی ذخیرہ کا جائزہ لے چکا ہو۔ جو قرآن و حدیث کا انتہائی گہرا علم رکھتا ہو اور فقہاء کے اختلافات اور اُن کے ماخذ و دلائل اُس کو ہر وقت مستحضر رہیں۔ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اُن کی جزئیات سے اُن مذاہب کے اہل درس اور اہل فتویٰ سے زیادہ باخبر ہو۔ اس کے ساتھ وہ زندگی کے عملی میدان کا بھی شہسوار ہو، صاحبِ قلم بھی ہو، اور صاحب سیف بھی، سلاطین وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے اُسے باک نہ ہو۔ اور تاتاری جیسے خونخوار دشمن کے مقابلہ میں لشکر اسلام کی قیادت کرنے سے اُسے عذر نہ ہو۔درس کے حلقوں، کتب خانوں کے گوشوں، مسجد کی خلوتوں، مناظرہ کی مجلسوں سے لے کر جیل خانہ کی کال کوٹھڑی اور میدانِ کار زار تک اُس کی یکساں پرواز و فاتحانہ ترکتاز ہو اور ہرجگہ اُس کی ذات محترم اور اُس کی امامت مسلّمہ ہو۔

آٹھویں صدی کے لیے ایک ایسے مردِ کامل کی ضرورت تھی جو زندگی کے تمام میدانوں کا مجاہد ہو اور جس کی جدوجہد اور اصلاحات کسی ایک شعبے تک محدود نہ ہوں۔ یہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ذات تھی جس نے عالمِ اسلام میں ایک ایسی علمی و عملی حرکت اور زندگی پیدا کردی جس کے اثرات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قائم ہیں(تاریخِ دعوت و عزیمت جلد دوم ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۲۳ تا ۲۵) ہم یہاں اُن کے جذبۂ جہاد اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے اُن کی جرأت و بے باکی، حق گوئی اور دلیری و شجاعت کے چند واقعات پیش کریں گے۔

امام غزالی کے ڈیڑھ سو برس بعد ساتویں صدی کے نصف آخر میں ٦٦١ھجری بمطابق ۱۲٦۲ ؁ امام ابن تیمیہ پیدا ہوئےیہ وہ زمانہ تھا کہ دریائے سندھ سے فرات کے کناروں تک تمام مسلمان قوموں کو تاتاری غارت گر پامال کر چکے تھے۔اور شام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسلسل پچاس برس کی ان شکستوں نے دائمی خوف اور بدامنی کی حالت نے اور علم و تہذیب کے تمام مرکزوں کی تباہی نے مسلمانوں کو اس مرتبۂ پستی سے بھی بہت نیچے گرا دیا تھا جس پر امام غزالی نے اُن کو پایا تھا۔تقلید جامد اس حد کو پہنچ گئی تھی۔ کہ مختلف فقہی اور کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے۔ اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا۔بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کر لی۔ جاہل و گمراہ عوام، دنیا پرست یا تنگ نظر علماء اور جاہل و ظالم حکمرانوں

کی ایسی ستگت بن گئی تھی۔ کہ اس اتحاد ثلاثہ کے خلاف کسی اصلاح کے لیے اُٹھنا اپنی گردن کو قصاب کی چھری کے سامنے پیش کرنے سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گو اُس وقت صحیح الخیال وسیع النظر حقیقت شناس علماء ناپید نہ تھے۔نہ اُن سچے اور اصلی صوفیوں کی کمی تھی جوجادۂ حق پر گامزن تھے مگر جس نے اس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اُٹھانے کی جرات کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔ (تجدیدو احیائے دین صفحہ ۷۵ تا ۷٦)

امام ابن تیمیہ قرآن میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ حدیث کے امام تھے۔ تفقہ کی شان یہ تھی کہ بلاشبہ اُن کو مجتہد مطلق کا مرتبہ حاصل تھا۔علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ اور کلام پر گہری نظر تھی۔ یہود و نصاریٰ کے مذہبی لٹریچر اور اُن کے مذہبی فرقوں کے اختلافات پر اُن کی نظر اتنی وسیع تھی کہ گولڈ زیہر کے بقول کوئی شخص جو تورات کی شخصیتوں سے بحث کرنا چاہے وہ ابن تیمیہ کی تحقیقات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اب سب علمی کمالات کے ساتھ ساتھ اس شخص کی جرات و ہمت کا یہ حال تھا کہ اظہارِ حق میں کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہ ڈرا۔ حتیٰ کہ متعدد مرتبہ جیل بھیجا گیا اور آخر کار جیل ہی میں جان دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امام غزالی کے چھوڑے ہوئے کام کو اُن سے زیادہ خوبی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیاب ہوا۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ٧٦)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت میں جو اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ اگر چہ بہت سے علمی و عملی شعبوں پر حاوی ہے لیکن اُن کو چار حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے جواُن کی تاریخ اصلاح و تجدید میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ چار اہم شعبے مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱)عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال

(۲)فلسفہ و منطق اور علم کلام کی تنقید اور کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی ترجیح

(۳)غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید اور اُن کے عقائد و رسوم کے اثرات کا مقابلہ

(۴)علوم شریعت کی تجدید اور فکر اسلامی کا احیاء۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم از مولانا ندوی صفحہ ۱۰۷)

اُن کے کارناموں کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱)اُنہوں نے یونانی منطق و فلسفہ پر امام غزالی سے زیادہ گہری اور زبردست تنقید کی۔ اور اس کی کمزوریوں کو یوں نمایاں کرکے دکھایا کہ عقلیت کے میدان پر اس کا تسلط ہمیشہ کے لیے ڈھیلا ہو گیا۔اور اس تنقید کے اثرات مشرق ہی تک محدود نہ رہے۔ بلکہ مغرب بھی پہنچے۔ چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور یونان زدہ فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز امام ابن تیمیہ کے ڈھائی سو برس بعد اُٹھی۔

(۲)انہوں نے اسلام کے عقائد احکام اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کیے جو امام غزالی کے دلائل سے زیادہ معقول بھی تھے۔ اور اسلام کی اصل روح کے حامل ہونے میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ابن تیمیہ کے زمانے میں جو دین کے علمبردار تھے وہ فقط احکام نقل کر دیتے تھے۔تفہیم نہ کر سکتے تھے۔ اور فلسفہ اور اصطلاحی معقولات کو ذریعۂ تفہیم بنانے کی وجہ سے کتاب و سنت کی اعلیٰ سپرٹ کو کم و بیش کھو دیتے تھے۔ ابن تیمیہ نے عقائد و احکام کو ان کی اصل سپرٹ کے ساتھ بے کم و کاست بیان بھی کیا۔ اور پھر تفہیم کا وہ سیدھا سادھا ڈھنگ اختیار کیا جس کے سامنے عقل کو سر جھکانے کے سوا چارہ نہ تھا۔اس زبردست کارنامے کی تعریف امام حدیث علام ذہبی نے ان الفاظ میں کی ہے '' ابن تیمیہ نے خالص سنت اور طریقۂ سلف کی حمایت کی اور اس کی تائید میں ایسے دلائل اور ایسے طریقوں سے کام لیا جن کی طرف ان سے پہلے کس کی نظر نہ گئی تھی''۔

(۳) اُنہوں نے تقلید جامد کے خلاف نہ صرف آواز اُٹھائی۔ بلکہ قرون اولیٰ کے مجتہدین کے طریقہ پر اجتہاد کرکے دکھایا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اور اُن کے جلیل القدر شاگرد حافظ ابن قیم نے حکمتِ تشریع اور شارع کے طرزِ قانون سازی پر اتنا نفیس کام کیا۔ جس کی مثال ان سے پہلے کے شرعی لٹریچر میں نہیں ملتی۔یہ وہ مواد ہے جس سے اُن کے بعد اجتہادی کام کرنے والوں کو بہترین رہنمائی حاصل ہوئی اور ہوتی رہے گی۔

(۴) انہوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اُٹھائیں۔اس تنقید و تنقیح میں اس شخص نے کسی کی رو رعایت نہ کی۔اس آزاد خیالی اور صاف گوئی کی وجہ سے ایک دُنیا اُن کی دشمن ہو گئی۔ اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ اُن کے عہد میں تھے۔اُنہوں نے مقدمات قائم کرکے کئی بار جیل بھجوایا۔اور جو بعد میں آئے اُنہوں نے تکفیر و تضلیل کرکے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلامِ

خالص کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا۔ اُس کی آوازِ بازگشت اب تک بلند ہورہی ہے۔
اس کام کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے تاتاری وحشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد
کیا۔اُس وقت مصر و شام اس سیلاب سے بچے ہوئے تھے ۔امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور
رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی۔ اور اُنہیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ اُن کے ہم عصر شہادت
دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ اُن کا نام سن کر کانپ اُٹھتے تھے۔ اور
اُنکے مقابلے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مگر ابن تیمیہ نے اُن میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی
سوئی ہوئی روح کو بیدار کردیا۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ۷۷ تا ۷۹)

ابن تیمیہ کا جذبۂ جہاد اور اُن کی جرأت و بیباکی:

تاتاریوں کے قازان کے ہاتھوں سلطانِ مصر کے مسلمان لشکر کی شکست کے بعد سلطانی افواج نے مصر کا رُخ کیا۔ اور اہلِ دمشق نے دمشق میں پناہ لی۔ مسلمانوں میں اس شکست سے شدید بدحواسی پھیلی اور بڑے بڑے علماء اور سرکردہ اشخاص شہر چھوڑ چھوڑ مصر کا رخ کر رہے تھے۔ قیدیوں نے جیل خانہ توڑ کرشہر میں لوٹ مچا دی۔ کوئی ذمہ دار حاکم اور منتظم شہر میں موجود نہ تھا۔ اُدھر قازان کی آمد کا غلغلہ تھا۔جس سے رہے سہے حواس پراگندہ تھے۔
یہ حالات دیکھ کر اعیانِ شہر اور ابن تیمیہ نے مشورہ کیا۔ کہ ابن تیمیہ چند علماء اور رفقا کی میت میں قازان سے ملاقات کریں۔اور دمشق کے لیے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔
٦٩٩ہجری میں ابن تیمیہ اور تاتاریوں کے جبار بادشاہ قازان کی ملاقات ‘‘بسک’’میں ہوئی۔شیخ کمال الدین جو اس وفد میں شامل تھے۔ اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔
‘‘میں شیخ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ سلطان قازان کو عدل و انصاف کی آیات و احادیث اور اللہ و رسول کے ارشادات و احکام سناتے تھے اُن کی آواز بلند ہو جاتی تھی اور برابر سلطان کے قریب ہوتےجاتے تھے۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ اُن کے گھٹنے اُس کے گھٹنےسے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہ ہوئی اور وہ بڑی توجہ سے کان لگائے اُن کی گفتگو سن رہا تھا۔ اور ہمہ تن متوجہ تھا۔اس پر اُن کا ایسا رعب طاری تھا اور وہ اُن سے ایسا متاثر

تھا کہ اُس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ عالم کون ہیں میں نے آج تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا۔ مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔ لوگوں نے ان کا تعارف کرایا اور ن کے علمی اور عملی کمالات کا ذکر کیا۔

ابن تیمیہ نے قازان سے کہا کہ تمہارادعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور مؤذنین بھی رہا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے مسلمانوں پر حملہ کیا حالانکہ تمہارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز رہے۔ اُنہوں نے جوکچھ عہد کیا تھا وہ پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا وہ توڑ دیا اور جو کچھ کہا تھا اُس کو پورا نہیں کیا اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا''۔

شیخ کمال الدین کہتے ہیں کہ ایسی سخت گفتگو کے باوجود شیخ بڑے اعزاز و اکرام سے واپس آئے۔ تاتاریوں کے ہاتھ جو مسلمان قید تھے اُن کی بڑی تعداد اُن کی حسنِ سفارش سے چھوڑ دی گئی۔ شیخ کہا کرتے تھے کہ غیر اللہ سے تو وہ ڈرے گا جس کے دل میں کوئی بیماری ہے۔ امام احمدبن حنبل سے کسی نے حکام سے اپنے اندیشہ اور خوف کا اظہار کیا، فرمایا ''اگر تم تندرست ہوتے تو کسی سے نہ ڈرتے۔''

ایک دوسرے ہمراہی قاضی القضاء ابوالعباس اتنا اور اضافہ کرتے ہیں۔

''اس مجلس میں ابن تیمیہ اور اُن کے رفقاء کے سامنے کھانا رکھا گیا۔ اور سب شریک ہو گئے۔ لیکن ابن تیمیہ دست کش رہے دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں شرکت نہیں کرتے؟ فرمایا کہ یہ کھانا کب جائز ہے۔ یہ تو غریب مسلمانوں کی بھیڑ بکریوں کے گوشت سے تیار کیا گیا ہے۔ اور لوگوں کے درختوں کی لکڑی کے ایندھن سے پکایا گیا ہے۔ قازان نے اُن سے دُعا کی درخواست کی۔شیخ نے ان الفاظ کے ساتھ دُعا کی کہ خدایا اگر آپ کے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما اور اگر سلطنت دُنیا اور حرص و ہوس ہے تو اُس سے سمجھ لے۔ حیرت کی بات یہ کہ قازان امین کہہ رہا تھا۔ ہمارا حال یہ تھا کہ ہم کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ اب جلاد کو اُن کی گردن مارنے کا حکم ہوگا۔اُن کے خون کی چھینٹیں ہمارے دامن پر کیوں آئیں''۔

ابوالعباس کہتے ہیں:

‘‘جب مجلس برخاست ہوئی اور ہم دربار کے باہر آئے تو ہم نے کہا کہ آپ نے تو ہماری ہلاکت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔اُنہوں نے کہا کہ میں خود تمہارے ساتھ نہیں جاؤنگا چنانچہ ہم لوگ تو روانہ ہو گئے۔اور وہ ذرا دیر ٹھہر کر واپس ہوئے۔خوانین دارا کو جب اس واقعہ کی اطلاع اور اُن کی موجودگی کا علم ہوا تو ہر طرف سے اُنہوں نے ہجوم کیا اور برکت و حسن اعتقاد میں چاروں طرف سے اُن کو گھیر لیا اور اس شان سے دمشق واپس ہوئے کہ تین سو (۳۰۰) سوار اُن کی رکاب میں تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہم پر یہ گزری کہ ہم راستہ میں تھے کہ ایک گروہ حملہ آور ہوا اور اُس نے ہمارے کپڑے اُتار لیے۔ (ایضاً صفحہ ۵۱ تا ۵۵)

تاتاریوں کی دوبارہ آمد کی خبر پر شہر میں جہاد کا اعلان عام ہوگیا۔ لوگوں کو تسلی دی گئی۔ سلطانِ مصر جو افواج کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ سلطان نے فسخ عزیمت کر دی۔ یہ سن کر جمے ہوئے قدم اُکھڑ گئے۔اور لوگ اپنے اہل و عیال کو مصر اور دوسرے محفوظ مقامات کی طرف منتقل کرنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر ابن تیمیہ نائب الشام سے ملاقات کے لیے (جو دمشق سے باہر تاتاریوں کو روکنے کے لیے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا) تشریف لے گئے۔اُنہوں نے اس کو بہت اطمینان دلایا۔اور فرمایا کہ ہم مظلوم ہیں۔ ہم کو ضرور فتح حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ

(الحج۔۶۰)

"یہ تو ہے ان کا انجام، اور جو کوئی بدلہ لے ، ویسا ہی جیسا اُس کے ساتھ کیا گیا ، اور پھر اُس پر زیادتی بھی کی گئی ہو، تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا ۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے" ۔

اور پھر ابن تیمیہ خود سلطانِ مصر کو قائل کرنے کے لیے مصر تشریف لے گئے۔ اور اُن کی ایمان افروزتقاریر اور مخلصانہ ساعی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ سلطان مدد کیلیے تیار ہوکر روانہ ہوا۔ جس سے لوگوں کی ڈھارس بندھی۔ اس عرصہ میں ابن تیمیہ مصر سے واپس آگئے۔ اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ سلطانِ تاتار نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ اور دریائے فرات عبور کرکے عراق پہنچ گیا:

وکفی اللہ المومنین القتال (البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ صفحہ ۱۶)

تاتاریوں نے دوبارہ رجب ۷۰۲ھجری میں شام کی طرف قصد کیا۔ اور روانہ ہوئے۔ اور حسب معمول دمشق میں افراتفری اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ابن تیمیہ نے لشکر کی ہمت بندھائی اور اُنکو سورہ الحج کی مندرجہ بالا آیت کے حوالے سے یقینی فتح کا یقین دلایا۔ اس وقت ایک سوال چھیڑا گیا کہ تاتاری بہر حال مسلمان ہیں۔ اس لیے اُن سے جنگ کرنے کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ وہ نہ کافر ہیں نہ باغی ہیں۔ باغی اس لیے نہیں ہیں کہ کبھی وہ مسلمان امیر کی اطاعت میں داخل ہی نہیں ہوئے اس لیے بغاوت کا بھی سوال نہیں۔پھر اُن سے جنگ کس بنیاد پر کی جائے۔علماء کو اس بارے میں تردد ہوا۔ ابن تیمیہ نے کہا کہ وہ خوارج کے حکم میں ہیں۔ خوارج نے سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔وہ اپنے کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ حق و انصاف کو قائم کر سکتے ہیں۔ وہ مسلمانوں پر گناہوں اور مظالم کا الزام لگاتے ہیں اور خود اس سے کہیں بڑھ کر افعال شنیعہ اور ناشائستہ حرکات کے مرتکب ہیں۔ اِن کی توضیح سے علماء کو اطمینان ہو گیا اور یہ نکتہ سمجھ میں آگیا۔اُن کو اس بارہ میں اتنا وثوق اور اطمینان تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تم مجھے اس حال میں تاتاریوں کی صف میں دیکھو کہ قرآن مجید سر پر رکھا ہے۔ تب بھی مجھے قتل کر دینا۔ اس سے لوگوں کا تردد دور ہوا۔ اور اُن کے حوصلے بلند ہوئے۔

ابن تیمیہ نے سلطان سے ملاقات کی۔ ابن تیمیہ کی گفتگو سے اُن کا عزم پختہ ہوگیا اور وہ ابن تیمیہ کی معیت میں لشکر گاہ آئے۔اس جنگ سے پہلے ابن تیمیہ نے حدیث کا حوالہ دے کر لوگوں کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اپنے روزے کھول دیں۔ اور دشمن کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔ بہرحال مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

اُن کی اس جرأت و بے باکی سے جاہ پسند علماء اور درباری امراء اُن کے مخالف ہو گئے اُن کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُنہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔اور پھر اُن سے رہائی کے بدلے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا کہ وہ اپنے بعض فتاویٰ سے رجوع کریں۔ لیکن وہ نہ مانے۔۴ مہینے کے بعد خود حکام کی جانب سے اُن کی رہائی کی کوشش کی گئی۔ اور قاضی القضاۃ نے خود اُن سے ملاقات کی اور دیر تک گفتگو رہی۔ لیکن وہ نکلنے پر راضی نہ ہوئے۔بالاخر امیر حسام الدین نے قسم دے کر اُن سے درخواست کی کہ وہ جیل سے باہر آجائیں۔ یوں حکومت خود بخود مجبور ہوگئی اور اُنہیں رہا کرنا پڑا۔

اس عرصہ میں ابن تیمیہ کی سیرت کی بلندی اور نمایاں ہوئی۔اُنہوں نے کسی طاقت کے سامنے گردن خم نہیں کی۔ اور نہ کسی دُنیاوی

ترغیب یا مالی منفعت سے اُن کا دمن داغدار ہوا۔ اُنہوں نے سلطانی خلعت اور عطا یائے سلطانی کے قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور اُنکا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے جیل سے باہر آتے ہی اپنے تمام مخالفین اور اُن تمام لوگوں کو جنہوں نے ایذا رسانی کی کوشش کی تھی۔ بلا استثنا معاف کردیا۔ اور اس کا صاف اعلان کر دیا۔ کہ ان کو کسی سے کوئی شکایت نہیں اور نہ وہ کسی سے مواخذہ کریں گے۔
(ایضاً صفحہ ۹۸)

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام

ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار، دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا۔ ان میں سب سے زیادہ باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین ابن عبدالسلام (م ۶۶۰ہجری)کی ہے جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرۂ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

ایک مرتبہ جب سلطان ملک الاشرف بیمار ہوئے اور اُنہوں نے دُعا کی درخواست کی تو عیادت اور دُعا کے بعد اُنہیں نصیحت کی کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کو اس بات سے شہہ ملی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دُشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں۔ اس وقت آپ کا رُخ الملک العادل سے جنگ کرنے کی طرف ہے۔ اور آپ اُن کے مقابلہ کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں آپ سے صرف یہ عرض کرونگا کہ آپ اپنا رُخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹاکر دشمنانِ اسلام کی طرف پھیر دیں۔اور اس اخر وقت اپنا رشتہ نہ توڑیں۔ اور اللہ کے دین کی سربلندی اور مدد کی نیت کریں۔ سلطان نے اُسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رُخ بجائے مصر کے تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے چنانچہ دن کے دن اُس کی تعمیل ہوئی۔اور لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔ مزید نصیحت کی کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نائبین سلطنت اور اہل کارانِ حکومت رنگ رلیانمنا رہے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ نئے نئے ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں۔آپ کے لیے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں۔ اور تمام ظالمانہ کاروائیاں روک دیں۔اور اہل معاملہ کی داد رسی کریں۔ سلطان نے اُسی وقت ان سب چیزوں کی محالفت کے احکام جاری کیے اور بعد میں ایک ہزار مصری دینار بھی نذر کیے۔ جسے شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا کہ میری ملاقات خالصتہً لوجہ اللہ تھی۔ میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول صفحہ ۳۷۷ تا ۳۸۱)

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت:

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل نے بادشاہ مصر نجم الدین ایوب کے مقابلے میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی۔ اور حق الخدمت کے طور پر شہرصیدا اور ثقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا۔ اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر اُن سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں۔تاجران اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا۔ شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے۔ شیخ کی گرفتاری ہوئی اورپھر کچھ عرصہ محبوس رہنے کے بعدبادشاہ کی طرف سے ایلچی آئے کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیازمندانہ مل لیں۔ اور اس کی دست بوسی کرلیں۔ تو یہ قصہ رفع دفع ہو جائے گا۔ اور آپ سابقہ خدمات و مناصب پر پورے اعزاز کے ساتھ واپس آجائیں گے۔ شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔اُنہوں نے فرمایا '' ارے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں، خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔''

یہ سن کر اُن کو گرفتار کرکے بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا گیا۔ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے ہو! اُنہوں نے کہا ہاں۔ کیا جانتے ہو یہ مسمانوں کا بڑا پادری ہے (ھذا اکبر قسوس المسلمین) میں نے اس کو اس لیے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعے سپرد کرنے کے خلاف تھا اور اس پر معترض تھا میں نے اس کوعہدوں سے معزول کرکے دمشق سے شہر بدرکر دیا۔ اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے۔ عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھوتے۔(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد۵ صفحہ ۱۰۰ تا ۱۱۱ بروایت شیخ شرف الدین عبداللطیف فرزند شیخ عزالدین ابن عبدالسلام۔ایضاً صفحہ ۳۸۱ تا ۳۸۳)

اُن کی جرأت کا ایک حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا۔ بادشاہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا۔اور دو رویہ افواج شاہی کمر بستہ کھڑی تھیں۔امرا حاضر ہو کر تسلیمات بجالاتے تھے اور زمین بوس ہوتے تھے۔ اس بھرے دربار میں دفعتہً

شیخ نے بادشاہ کو نام لے کرخطاب کیا اور کہا کہ ‘‘ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے۔ جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لیے دی تھی۔ کہ شراب آزادی سے پی جائے۔ بادشاہ نے کہا کیا یہ واقعہ ہے۔ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا۔ ہاں فلاں مے خانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو۔ بادشاہ نے کہا جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں۔ یہ میرے والد کے زمانے سے ہو رہا ہے۔ شیخ نے فرمایا۔ پھر تم بھی اُنہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے۔

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ "یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آرہا ہے"۔

سلطان نے فوراً اس شراب خانے کی بندش کا حکم جاری کیا۔شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا واقعہ ہے؟فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت سے اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے۔ میں نے اس کی اصلاح کے لیے یہ بات کہی۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیئت و جلال اس وقت ایسا مستحضر تھا اور پیش ِنظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ ایک بلّے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

(ایضاً بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول صفحہ ۳۸۴ تا ۳۸۵)

فرنگیوں سے جہاد:

ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہنچ گئیں اور مسلمانوں نے اُن پر غلبہ حاصل کر لیا۔ شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ شیخ مستجاب الدعوات تھے۔ اللہ نے فتح دی۔ ہوا کا رخ بدل گیا۔ اور فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے۔

مصارفِ جہاد کیلیے شیخ کا انتظام:

تاتاری عالمِ اسلام پر جابجا سے یورش کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں اُنہوں نے مصر کا رخ کیا۔ مصر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ سلطانِ مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی۔ شیخ الاسلام نے ہمت دلائی اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو میں فتح کی ضمانت دیتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانے میں روپیہ کم ہے میں تاجروں سے قرض لینا چاہتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ اپنے محل کے جواہرات اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو۔ارکان سلطنت اور امراءِ دربار اپنی

اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں۔ اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جا سکتا ہے لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں۔ شیخ کا تنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء نے بے چون و چرا جواہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے اور اُن سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے۔ اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔(ایضاً صفحہ ۳۸۶)

شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی

ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے ہندوکش سے اُس پار کی دُنیا کو تو بالکل تاخت و تاراج کر دیا۔ مگر ہندوستان اُس کی دست بُرد سے بچ گیا تھا۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ کہ ''اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دُنیا کو لاحق ہوتی

ہے۔ بہانوہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان و عراق میں تھیں۔وہی بادشاہوں کی خداوندی، وہی امرا اور اہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل طریقوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا۔ وہی جبر و ظلم کی حکومت، وہی خدا سے غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے بُعد۔رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔(تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۸۰)

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ کسی مہذب و شائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ و جنت، ہر چیز کا مذاق اُڑایا جانے لگا۔ ذات نبوی پر اعتراضات کیے جاتے۔ دیوان خانۂ شاہی کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا۔ کہ محمد کی بعثت ہر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اوراس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی۔ اس لیے اب وہ منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکّوں کے ذریعے پھیلا یا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں نشر و اشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی۔ جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملاکر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے۔ تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔

اس دین کا کلمہ ''لا الہ الا اللہ اکبر خلیفہ اللہ''تجویز کیا گیا۔ اس نئے دین '' الٰہی اکبر شاہی'' میں داخل ہونے سے پہلے اسلام سے توبہ کرایا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل دیا گیا۔ سلام کرنے والا ''اللہ اکبر'' اور جواب والا ''جل جلالہ'' کہتا، یا درہے کہ بادشاہ کا نام جلال الدین اور لقب اکبر تھا۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اُس کے سامنے سجدہ بجا لایا جاتا۔ علماء کرام اور صوفیائے باصفا دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات اور کعبۂ مُرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے۔ اور اس صریح شرک کو ''سجدۂ تحیّہ'' اور زمین بوسی جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔

سب سے زیادہ نظر عنایت ہندویت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثریت کا مذہب تھا۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا ہندو تہوار پورے ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی گائے کی تعظیم کی جاتی۔ اور پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ عقیدۂ تناسخ تسلیم کیا گیا۔ اسلام کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ بادشاہ

اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ علماء اسلام اگر کسی گمراہی کے خلاف بات کرکے تو اُنہیں ''فقیہ''کے نام سے موسوم کیا جاتا جس کے معنی اُن کی اصطلاح خاص میں احمق اور ناقابل التفات آدمی کے ہوگئے تھے۔سُود جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا۔ بادشاہ کعبہ کی توہین کی خاطر قبلہ کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے۔ اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے وہ اسلامی تعلیم و تربیت کے خاص انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ اس مرکب کا نام ''اسلامی تمدن'' تھا اس میں شرک بھی تھا۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ اوہام و خرافات بھی تھے۔نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔دُنیا پرست علماء و مشائخ اس کی سرپرستی کرتے لوگوں کی طرف سے نذرانے پہنچتے اور ان کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

پیران طریقت نے ایک ایسے تصوف کو اسلام کے اعتقادی اور اخلاقی نظام میں ٹھونس دیا تھا۔ جس میں شریعت و طریقت کو جدا کر دیاگیا تھا۔ اور اس باطن کوچہ کا قانون یہ تھا کہ جس چیز کو چاہے فرض بنا دے اور جس فرض کو چاہے ساقط کردے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے۔ اور پھر وحدت الوجود کے تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بے کار کر دیاتھا۔

(تلخیص از تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۸۰ تا ۸٦)۔

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے (۹۷۵ ہجری بمطابق ۱۵٦۳ ء)۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اُن کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے---- خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا تھا۔ جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال یہ تھا کہ جب حضرتِ موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اُسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے۔

''حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ ہی اس کی

نشست و بر خاست ہوئی ہے اسی دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اُس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دُنیا کو روشن کرے گا'' تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۸۶ تا۸۷)

سجدہ تعظیمی سے انکار اور گوالیار کی اسیری:

۱۰۱۴ھجری میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال ہوا اور نورالدین جہانگیر تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ جہانگیر کے دور میں آپ نے ہندوستان سے اکبر کے دور کے بد اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ یہ انقلاب انگیز کام شروع کریں۔ کہ گوالیار کی اسیری کا واقعہ پیش آگیا۔ جو کئی حیثیتوں سے حضرت مجدد کی حیات اور اس عہد کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں ''چونکہ مجدد صاحب تشیع کے ان اعتقادی اور عملی اثرات کا مقابلہ کرتے تھے جو ایرانی عنصر کے ہندوستان میں آنے اور دربار پر حاوی ہو جانے کے بعد مسلم معاشرہ پر چھائے چلے جا رہے تھے۔ اور عقائد اہل سنت کی صاف صاف تبلیغ فرماتے تھے۔ اگر دربار کے بارسوخ ایرانی عنصر نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا تو تعجب نہیں۔مسئلہ کو سیاسی رنگ دینے کے بعد اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اور جہانگیر نے اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔۔۔۔ مغل سلاطین مشائخ سے عوام کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت، رجوع عام اور ان کے اردگرد لوگوں کے پروانہ وار جمع ہو جانے سے ہمیشہ خائف رہے۔۔۔۔

بہرحال جہانگیر نے حضرت مجدد کو اپنے مستقر پر طلب کیا۔۔۔ بادشاہ نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو اُمراء کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ اپنے محل کے قریب خیمہ نصب کرایا۔ اور ملاقات کے لیے آپ کو دربار میں طلب کیا۔ آپ دربار میں تشریف لے گئے۔ تو آداب شاہی جو خلاف شرع تھے۔ آپ نے ادا نہیں کیے۔ ایک نا خدا ترس درباری نے بادشاہ کو متوجہ کیا اور کہا کہ جہاں پناہ شیخ نے آداب سلطنت کی کوئی رعایت نہیں کی۔ بادشاہ نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے آج تک خدا اور رسول کے بتائے ہوئے آداب و احکام کی پابندی کی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا ''مجھے سجدہ کرو'' آپ نے فرمایا میں نے سوائے خدا کے نہ کسی کو سجدہ کیا اور نہ کرونگا۔ بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرنے کا حکم دیا۔

اس واقعہ سے پہلے شاہ جہان نے علامہ افضل خان اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ اور اس پیغام کے ساتھ حضرت مجدّد کے

پاس بھیجا تھا۔ کہ سجدۂ تحیّہ سلاطین کے لیے آیا ہے۔ اگر آپ سجدہ کر لیں تو میں اس بات کا ضامن اور ذمہ دار ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ محض رخصت ہے عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے--- قید کرنے کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں ضبط کر لی گئیں اور متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم صفحہ ۱۵٦ تا ۱٦۳)

ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب Preaching of Islam میں ہے ''شہنشاہ جہانگیر (۱٦۰۵ تا ۱٦۲۸) کے عہد میں ایک سُنی عالم شیخ احمدمجدّد نامی تھے جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے۔شیعوں کو اُس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانے سے اُنہیں قید کردیا۔ دو برس قید میں رہے اور اس مدت میں اُنہوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سینکڑوں بت پرستوں کو حلقہ بگوش بنا لیا۔''(صفحہ ۳۱۲ طبع ثالث بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ۱٦۳)

<u>مولانا مودودی اُن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔</u>''یہ پیشن گوئی (یعنی حضرت باقی باللہ نے جو فرمایا تھا) پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اس وقت موجود تھے۔ مگر ان سب کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا۔ جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اُٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاءِ دین کی جدوجہد کی۔اس بے سروسامان فقیر نے علی الاعلان اُٹھ کر اُن گمراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی۔اور اُس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا۔مگر بالاخر وہ فتنہ کا منہ پھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیّہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیجوا دیا تھا۔ آخر کار شیخ کا مقصد پوراہو گیا۔ اور اپنے بیٹے خرم کو جو بعد میں شاہ جہان کے لقب سے تخت نشین ہوا اُن کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔''دین الٰہی اکبر شاہی'' ان تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا۔ جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھی۔اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی۔ وہ خود منسوخ ہو گئی۔ حکومت اگر چہ شاہی حکومت ہی رہی مگر کم ازکم اتنا ہوا کہ

علوم دینی اور احکامِ شرعی کی طرف اس کا رویہ کافرانہ کےبجائے عقیدتمندانہ ہو گیا۔
شیخ کی وفات کے تین چار سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جس کی بدولت تیموری خاندان کے اس شہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پرپوتا خادم شریعت ہوا۔
شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ اُنہوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل کفر کی گود میں چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیئے ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو ان آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اس میں سرایت کر گئی تھیں پاک کرکے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ ان تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں۔
---یہی کام ہے جس کی وجہ سے شیخ سرہندی کا شمار مجدّدین ملت میں ہوتاہے۔
(تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۸۷ تا ۸۸)

حضرت شاہ ولی اللہؒ

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی اُن چند اصحاب فکر علماء میں سے ہیں جنہوں نے بارہویں صدی ہجری میں دُنیائے اسلام کی جو فکری اور

ذہنی کیفیت تھی اُس کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔اور اُس وقت کے سیاسی حالات کو پورے غور و تعمیق سے دیکھا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاہ صاحب نے افراد اور جماعتوں کی حیا ت کیلیے ایک قابل غور و فکر نقشہ دینِ اسلام کی سرحدی اور لاہوتی روشنی میں مرتب فرمایا اور نہ صرف مرتب فرمایا بلکہ اُسے پوری جرأت و ہوشمندی کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش بھی کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر گوشہ سے اس کی مخالفت ہونا ہی تھی۔ ہوئی اور خوب ہوئی۔ شاہ صاحب کو اس کی وجہ سے بہت سی تکالیف سے گزرنا پڑا۔ حق تو یہ ہے کہ بلامخالفت کے صداقت نمایاں کہاں ہوتی ہے۔

اہل حق پر مخالفتوں کے پہاڑ ٹوٹا ہی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب پر بھی ٹوٹتے رہے۔ لیکن یہ اپنے کام میں لگے رہے۔ اور ایسے لگے رہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں نے ان کے پیغام کو رہنما تسلیم کر ہی لیا۔ اور شاہ ولی اللہ کو آج ہماری ذہنی اور فکری دُنیا میں وہ مقام حاصل ہے جو برصغیر کےکسی دوسرے عالم کو نہیں۔

(تذکرہ شاہ ولی اللہ از مناظر احسن گیلانی صفحہ ۔۱۱)

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اُس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنہوں نے عالمگیرکی حمایت و حفاظت اسلام، احیائے دین اور اجرائے سنت کی پالیسی کو نہ صرف یکسر ختم کردیا۔ بلکہ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور عالمگیر نے اپنی بیدارمغزی، مستعدی اور فرض شناسی سے ہندوستان کے نظم و نسق کو جو استحکام بخشا تھا۔ عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب و اثر قائم کیا تھا۔ ان کمزور جانشینوں نے وہ اپنی تعیش پسندی، کاہلی و نا اہلی، اندرونی اختلاف و کشمکش، خود غرض و جاہ پسند ارکان سلطنت و وزراء پر کلی اعتماد اور اُمور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ سے تباہ کر دیاشاہ ولی اللہ کے عہد (۱۱۱۴ ہجری تا ۱۱۷۶ ھجری) میں اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے کسی کی مدتِ حکومت صرف دس مہینے، کسی کی چار مہینے، کسی کی سلطنت برائے نام، کسی کی چند دن کی حکومت رہی۔ غرض یہ کہ بارہویں صدی ہجری کا ہندوستان سیاسی، انتظامی، اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط و پستی، بدنظمی و طوائف الملوکی اور انتشار و اضطراب کے اس نقطہ پر پہنچ گیا تھا۔ جس کو کسی معاشرہ و نظام کا دمِ واپسیں یا حالتِ احتضار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(تاریخ دعوت و عزیمت از سید ابوالحسن علی ندوی حصہ پنجم صفحہ ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۲۷۵)۔

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے بعد اور اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے (۱۷۰۳ء) نواحِ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے۔ ایک طرف اُن کے زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف اُن کے کام کو جب آدمی بالمقابل کرکے دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر،ان خیالات اور اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانہ میں نشوونما پاکر ایک ایسا آزاد خیال مفکر و مبصّر منظر عام پر آتا ہے۔ جو زمانہ اور ماحول کو ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ اور ایسا لٹریچر چھوڑ جاتا ہے جس کی زبان، اندازِ بیان، خیالات، نظریات، موادِ تحقیق اور نتائج مستخرجہ (اخذ کردہ نتائج) کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ حتٰی کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گردو پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و غارت، جبر وظلم اور بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

(تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۸۹ تا ۹۰)

شاہ صاحب کے کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں:

ایک عنوان تنقید و تنقیح کا اور دوسرا عنوان تعمیر کا

تنقیدی کام:

مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اُصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی ہے۔ اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے فقد و تبصرہ کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے--- ازالۃ الخفا کی فصل ششم میں انہوں نے صفحہ ۱۲۲ سے ۱۵۸ تک مسلسل تاریخ مسلمین پر تبصرہ کیا ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانہ کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی اُن پیشن گوئیوں کو بھی نقل کرتے گئے ہیں جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس تبصرہ میں قریب قریب اُن تمام جاہلی

آمیزشوں کی نشاندہی ہو گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں۔
پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن سے باقی تمام خرابیوں کا شجرۂ نسب ملتا ہو اور آخر کار دو چیزوں پر اُنگلی رکھ دی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت ہے بادشاہت کی طرف منتقل ہونا اور دوسرے رُوح اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔
پہلی خرابی پر اُنہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔خلافت اور بادشاہی کے اُصول اور اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں اُنہوں نے بیان کیا ہے۔ اور جس طرح احادیث سے اس کی تشریح کی ہے۔ اس کی مثال اُن سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی۔
(تجدید و احیائے دین صفحہ۹۳)۔
''شاہ صاحب نے جن کی نظر کتاب و سنت، عقائد اور علمِ کلام اور سیرت و تاریخ پر نہایت گہری اور وسیع تھی اور وہ مقاصد شریعت کے رمز آشنا تھے۔ خلافت کی ایسی جامع و مانع تعریف کی ہے۔ جس سے بہتر پیش کرنی مشکل ہے۔ اس تعریف کا ہر لفظ اپنے ساتھ معانی و مطالب اور مثالوں کا ایک دفتر رکھتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں '' خلافت اس عمومی سربراہی اور ریاست عامہ کا نام ہے جو ''اقامتِ دین'' کے کام کی تکمیل کے لیے وجود میں آئے۔ اس اقامتِ دین کے دائرہ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکانِ اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام، مثلاً لشکروں کی تربیت، جنگ میں حصہ لینے والوں کے حصص و مالِ غنیمت میں اُن کا حق، نظام قضا کا اجرا، حدود کا قائم کرنا، مظالم و شکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے۔ اور یہ سب آنحضرت□ کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیے۔۔ (دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲٦۲ تا ۲٦۳)۔
اسی طرح ازالۃ الخفا جلد اول صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۴ میں لکھتے ہیں:
''ارکانِ اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا۔۔۔ حضرت عثمانؓ کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا۔ بلکہ اپنے نائب ہی مقرر کرکے بھیجتے رہے۔ حالانکہ اقامت حج خلافت کے لوازم میں سے ہے جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہانِ گزشتہ کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کیلیے علامتِ بادشاہی تھا اس طرح حج خود اپنی امارت میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے۔''

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۹۳ تا ۹۴)
مزید ازالۃ الخفا جلد اول صفحہ ۱۵۷ پر لکھتے ہیں:
''ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند ہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔معلوم نہیں آگے خداتعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ۹۴)

رہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدورِ بازغہ میں، تفہیمات میں، مسوی میں، اور مصفیٰ میں اور قریب قریب ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔ ہم یہاں صرف چند اقتباسات پیش کریں گے۔ازالہ جلد اول صفحہ ۱۵ میں فرماتے ہیں:
''دولتِ شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہیں کہتا تھا۔ بلکہ سب اپنے اپنے آئمہ اور اساتذہ کے طریقے پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ دولت عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا۔اور یہ کیفیت ہو گئی کہ جب تک اپنے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب و سنت کی دلیل پر فیصلہ نہ کرتے۔ اس طرح وہ اختلافات جو تاویل کتاب و سنت کے مقتضیات سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے۔ مستقل بنیادونپر جم کر رہ گئے۔ پھر جب دولتِ عرب کا خاتمہ ہو گیا یعنی ترکی اقتدار کا زمانہ آیا اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اُسی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مستنبط تھی اب وہ سنتِ مستقرہ بن گئی۔''
مصفّٰی جلد اول صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں۔
''ہمارے زمانے کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔اُونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کا کاروبارہی دوسرا ہے۔ یہ بے چارے ان اُمور کی سمجھ بوجھ کے لیے مکلف ہی نہیں ہیں۔'' (تجدید و احیائے دین از سید مودودی صفحہ ۹۴ تا ۹۵)

حجت کے مبحث ہفتم مین اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔
مولانا مودودی نے تجدید و احیائے دین صفحہ ۹۶ تا ۱۰۵ میں اُن کی کتاب تفہیمات جلد اول صفحہ ۲۱۴ سے صفحہ ۲۱۹ تک طویل اقتباسات دئیے ہیں لیکن ہم یہاں صرف اُن کا خلاصہ بیان کریں گے۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانے کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک کو نام بنام پکار کر اس کے نقائص بیان کرتے ہیں ۔خود اپنے زمانے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ لوگوں میں تین چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں۔

(۱) **دلیل بازی** اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث میں مشغول ہو گئے۔

(۲) **وجدان پرستی**: اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور اُن کی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔

(۳) طاعت اور یہ اس بنا پر ہے کہ لوگ ملتِ اسلامیہ میں داخل ہیں۔ پھر اس زمانہ کی بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنبلی اور شافعی کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں اور ہر ایک اپنے طریقے میں تعصب برتتا ہے اور دوسرے کے طریقے پر اعتراض کرتا ہے یوں حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔ ''میں ان پیر زادوں سے کہتا ہوں جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں۔ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقے پر چل رہا ہے۔ اور کیوں اُس طریقے کو چھوڑ دیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر اُتارا تھا---- یہ سب راہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دے رہے ہیں۔''

''میں ان طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یو نانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے یا پھر وہ سنت ہے جو رسول ﷺ سے ثابت ہو۔''

''میں ان متقشف واعظوں، عابدوں، اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم نے لوگوں کو موضوعات کی طرف بلایاتم نے خلقِ خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا حالانکہ تم فراخی پر مامور تھے۔ نہ کہ تنگی کے لیے۔''

''میں امرا سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا تم خالی لذتوں کی طلب میں غرق ہو گئے ہو اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کوکھا جائے۔علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے، زناکاری، شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے بر سرِ عام بن گئے ہیں اور تم اُن کا انسداد نہیں کرتے''۔

‘‘میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو اللہ نے جہاد کیلیے، اعلائے کلمۂ حق کے لیے، شرک اور اہل شرک کا زور توڑنے کے لیے فوجی بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کی نیت اور مقصد سے تمہارے دل خالی ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو۔ داڑھیاں منڈاتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو۔ اور تمہیں کبھی اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو۔ یا حلال کی۔ خدا کی قسم تمہیں ایک روز دُنیا سے جانا ہے پھر اللہ تمہیں بتائے گا کہ کیا کرکے آئے ہو۔’’

‘‘میں اہلِ حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی ہے۔ اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو۔ اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم غیر اللہ کیلیے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو۔ یہ تمہارے بد ترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو شخص خوشحال ہو جاتا ہے وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اُس کی آمدنی کے لیے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاد دونوں کو ضائع کرتا ہے۔’’

‘‘پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کرکے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دئیے تم پر تنگ دِلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ ہو گیا ہے۔’’

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب ان لوگوں کی فاسد رسموں پر تنقید کرتے ہیں مثلاً شادی بیاہ میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھائے رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ مزید فرماتے ہیں۔

‘‘تم نے یوم عاشور کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے اور شب براٗت میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو---- پھر تم نے موت اور غم کو عید بنا رکھا ہے گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اُس کے اقربا خوب کھانے کھلائیں۔’’

وہ اُن کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ وہ نمازوں، روزوں اور زکواۃ سے غافل ہیں اور طرح طرح کے بہانے تراشتے ہیں۔مالدار لوگ لوگوں کو کھانا وغیرہ کھلاتے ہیں مگر زکواۃ اور عبادت کی نیت سے نہیں۔’’

آخر میں فرماتے ہیں ‘‘تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو، تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناسب پر کر رکھا ہے۔

اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لیے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں۔''

ایک اور جگہ تفہیمات جلد دوم (صفحہ ۴۵) میں فرماتے ہیں:

''جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں۔ کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کمتر ہے۔آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں فرق کیا ہے۔ جو لوگ لات اور عزیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے اُن کا فعل ان لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ان کے برعکس ان لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص ان کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے۔ مگر اُصولاً ہر وہ شخص جو کسی مردے کو زندہ ٹھہرا کر اس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اُس کا دل گناہ میں مبتلا ہے''۔

مزید فرماتے ہیں:

نبی کی حدیث ہے کہ ''تم بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی اُمتوں کے طریقے اختیار کروگے اور جہاں جہاں اُنہوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی رکھو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گھسے ہیں۔ تو تم بھی اُن کے پیچھے جاؤگے'' صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! پہلی اُمتوں سے آپ کی مراد یہود نصاریٰ ہیں۔ فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:-

''سچ فرمایا'' اللہ کے رسول نے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنا لیا ہے۔ اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلامِ شارع میں تحریف کرتے ہیں۔ اور نبی کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں۔ کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں۔ اور گناہ گار میرے لیے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی کہ یہودی کہتے ہیں کہ لن تمسنا النار الا ایام معدودہ (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے خصوصاً مسئلہ توحید میں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرع کی اُنہیں بالکل پرواہ نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی

نہیں۔۔۔اصحاب معقول اور شعراء اور اصحاب ثروت اور عوام، تو ان کی تحریفات کا ذکر کہا ں تک کیا جائے۔
(تفہیمات جلد دوم صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۵ از شاہ ولی اللہ)
مولانا مودودیؒ اپنی کتاب تجدید و احیائے دین میں شاہ ولی اللہ کو مجدّدین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ ‘‘ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے’’۔
اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں۔۔۔اُن کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے اُن کی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گردوپیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر اُنہیں کھٹکنے لگتا ہے۔۔۔ اور اُن کی قوتِ ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک اُنہیں اصلاح کے لیے بے چین کر دیتی ہے۔اس کے بعد مجدد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالتِ موجودہ کو جس حالت میں بدلنا مطلوب ہے اُس پر اپنی نظر جما سکیں اور تمام سعی و عمل اس سمت میں مرکوز کر دیں۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں’’۔ (تجدید احیائے دین صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۶)
اُن کے تعمیری کام کے بارے میں ابوالحسن علی ندوی، سید مودودی اور مناظر احسن گیلانی نے اپنی اپنی کتابوں تاریخ دعوت و عزیمت، تجدید و احیائے دین اور تذکرۂ شاہ ولی اللہ میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔
ہم یہاں اُن تمام پہلوؤں کی طرف مختصر اشارے کریں گے جن کو ان زعماء نے اپنی اپنی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔
مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک مسلمانان ہند میں شاہ صاحب کے زمانے میں غیر مسلموں کے اثرات کی وجہ سے اور قرآن و حدیث سے براہِ راست قوی اور عام رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے عقائد میں بگاڑ پیدا ہوا اور شرک کے شدید اثرات نمودار ہوئے۔شاہ صاحب نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لیے قرآن مجید کے مطالعہ و تدبر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا۔ دراصل اُس وقت ہندوستان کیا تقریباً تمام عجمی ممالک میں جن میں ترکستان، ایران اور افغانستان، ہندوستان کے قریبی ہمسایہ تھے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قرآن مجید اخص الخواص طبقہ کے مطالعہ، غور و فکر، اورفہم

و تفہیم کی کتاب ہے جس کا سمجھنا ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے۔ اس کو عوام میں لانا، عوام کو براہِ راست اس کے مطالب سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کی دعوت سخت خطرناک، ایک بڑی گمراہی، اور فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ اور عوام میں ذہنی انتشار، خود رائی اور علماء سے بے نیازی بلکہ بغاوت اور سرکشی کی دعوت دینا ہے۔ شاہ صاحب نے رسالہ ''تخفۃ الموحدین'' میں اس طرزِ خیال اور دلیل کو بڑی خوبی سے نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ تفصیل سے ان کا جواب بھی دیا ہے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد پنجم صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۴)
شاہ صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ ہدایت عام، اصلاح و عقائد اور اللہ تعالیٰ سے طاقتور رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایت و تعلیمات کی براہِ راست اشاعت و تبلیغ سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتا اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ(جو اُس وقت ہندوستان کی دفتری زبان تھی اور تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان اس کو سمجھتا تھا) اور اس کی اشاعت۔اس ترجمہ و تفسیر کا نام فتح الرحمٰن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور قرآن مجید کے تبلیغ عام کے راستہ میں جو چٹان حائل ہو گئی تھی شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے (جن کے علم اور اخلاص پر اُس عہد کے صحیح الخیال اور صاحب علم طبقہ کا اتفاق تھا) اقدام سے چٹان ہٹ گئی اور راستہ صاف ہو گیا۔ اسلام کی تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ کسی مسلم الثبوت اور بلند شخصیت کے کسی کام کے آغاز کر دینے سے غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا غبار چھٹ گیا ہے۔ اور شاہ راہ عام کھل گئی ہے۔ امام ابوالحسن اشعری کا متکلمانہ مباحث میں حصہ لینا اور عقلی استدلال سے کام لینا، حجۃ الاسلام امام غزالی کا فلسفہ کا مطالعہ اور اس کی تنقیح و تردید، اور ایسے بہت سے اقدامات جو اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق اسلام کی حفاظت یا مدافعت میں کیے گئے اس کی روشن مثالیں ہیں۔۔۔اس فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اُردو زبان میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ بارہویں صدی کے آخری حصہ میں اُردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کی۔ اس ضرورت کو شاہ صاحب کے بیٹے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن کا بامحاورہ اُردو ترجمہ کرکے پورا کیا۔ یہ دونوں ترجمےمسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے کہ ان سے فائدہ اُٹھانے والوں کی کوئی تعداد بیان نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت میں کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت و اصلاح کا اتنا بڑا

کام انجام نہیں دے سکتی تھی۔جو ان ترجموں نے انجام دیا (ایضاً صفحہ ۱۳۶ تا ۱۳۹)

شاہ صاحب کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں مولانا مودودی کے نزدیک کسی ایک مذہب کی جانبداری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح اُنہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اُصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے۔ اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے مگر دلیل کی بنیاد پر--- اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں کہیں شافعی، کہیں مالگی اور کہیں حنبلی۔ اُنہوں نے اُن لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں۔ اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کریں گے۔ اور اس طرح وہ ان لوگوں سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے آئمہ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہرغیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے (تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۰٦)

مولانا ابوالحسن علی ندوی،تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۱۹۸ میں فرماتے ہیں۔ کہ ''اُن کے مجدّدانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمتِ حدیث اور انتصار للسِنّہ کے سلسلہ زریں کی ایک اہم کڑی اُن کی فقہ و حدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش تھی۔''

اسی مذاہب اربعہ کی جمع و تالیف اور پھر حدیث سے تطبیق کے سلسلے میں شاہ صاحب تفہیمات میں فرماتے ہیں:۔

''کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب اُمت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی انہی دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہاء، محدثین،مفسرین اور متکلمین اور صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملائے اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ان دونوں کے مسائل کو حدیث نبی کے مجموعوں سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے۔ اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اُسے ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انہیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے۔ اور اگر ان میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو

مسئلے میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں۔ اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرأت کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا یا کسی مخمصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی۔ جیسے تعدّد کفّارات (مثلاً قصداً روزہ توڑنے والے کے لیے کفارے کی یہ صورت بھی ہے کہ ٦٠ روزے رکھے اور یہ بھی کہ ٦٠ مسکینونکو کھانا کھلائے، دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی وہ اختیار کرے گا صحیح ہوگی) یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالیٰ نہ پائے گا۔''(تفہیمات جلد اول صفحہ ٢١١، ٢١٢ بحوالہ تجدید و حیائے دین صفحہ ١٠٧ تا ١٠٨)

''انصاف میں اُنہوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل سے لکھی ہے اس میں اُنہوں نے جس طریقہ کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج دونوں کو جمع کیا جائے ۔شاہ صاحب نے غالی فقہأ اور فرقۂ ظاہریہ کی روش پر سخت تنقید کی ہے اور دونوں کے غلو و انتہا پسندی کو ناپسند کیا ہے۔اور صاف لکھا ہے کہ ان الحق امر بین بین معاملہ بین بین ہے۔ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

''ایک طرف کلامِ فقہا پر تخریج، دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع، دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہے اور بعض اس کے برعکس، ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں۔ جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے۔ اس بارے میں صراطِ مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے۔ اور یہی امام حسن بصری کا قول ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ١٥٣ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ٢٠١)

مزید شاہ صاحب اپنی فارسی وصیت'' میں فرماتے ہیں: اُمت کےقیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہو سکتی۔(وصیت نامہ فارسی صفحہ ٢ تا ٣ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ٢٠٢)

یہ مسلک معتدل اختیار کرنے سے فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور لا عائل بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے۔چنانچہ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اور تقلید کے ساتھ یہ شرط لگادی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت کی پیروی ہے اور یہ اس اعتماد پر کہ ہم جس کو واسطہ بنا رہے ہیں وہ کتاب و سنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا محض نمائندہ اور ترجمان ہے۔ اس طرح شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے جو مقاصد شریعت، فطرتِ انسانی اور واقعات کی دُنیا سے پورے طور پر مطابق ہے۔(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۱۲) رسائل مسائل حصہ اول از سید مودودی صفحہ ۱۷۵)

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اور اُن کی عظمت کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اور اس فقہی و حدیثی ذخیرہ کو بیش قیمت اور قابل استفادہ قرار دیتے ہوئے اور اس سے بے نیازی اور استغنا کو مضر اور محرومی سمجھتے ہوئے شاہ صاحب نے یہی نہیں کہ اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو بلکہ اُنہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اُصول و قواعد اور اُس کی شرائط کو بیان بھی کیا ہے۔مولانا مودودی نے اُن کی کتاب مصفی جلد اول صفحہ ۱۱ سے اپنی کتاب تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۰۷ پر ایک فارسی اقتباس دیا ہے جس کا ہم افادہ کی خاطر اُردو ترجمہ ابوالحسن علی ندوی کی کتاب دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۴ سے پیش کرتے ہیں۔

‘‘اجتہاد ہر زمان میں فرض کفایہ ہے اور یہاں اجتہاد نام ہے احکام شرعی کو اُن کے تفصیلی ادلہّ (دلائل) کے ذریعے کا۔ اور مجتہدین کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانہ میں فرض ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصہ ممکن نہیں۔اور اُن کے بارے میں اللہ کا حکم جاننا واجب ہے اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے۔ اور اُن کے بارے میں اختلافات بہت ہیں۔ جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں۔آئمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں۔ اُن میں اکثر میں انقطاع ہے۔ کہ قلب اُن پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کر سکتا۔ اس لیے اُن کو قواعد اجتہاد پر پیش کیے اور تحقیق کیے بغیر معاملہ بنتا نہیں۔’’

مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ ''مذکورہ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کیے ہیں۔ مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیش رؤوں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت آئمہ گزرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے تھے اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے منعقد ہو چکا تھا۔ کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔ ان کی کتابوں میں سے حجتہ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ کا موضوع یہی ہے ۔پہلی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔۔۔۔

پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھا تے چلے جاتے ہیں۔اس خاص مضمون پر جو کام اُنہوں نے کیا ہے وہ اس نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالیؒ نے کیاتھا۔اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

آخر میں اُنہوں نے تاریخ مکمل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم ازکم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں۔جنہوں نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۲)

اس ضمن میں مولانا مودودی کا مندرجہ ذیل نوٹ بہت اہم ہے۔

''نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور اتنے مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجائے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام سلیم الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے اور جو لوگ ان میں سے زیادہ قوتِ عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لیے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اُس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کرکے لوگوں کے سامنے رکھدیا۔ اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات

صاف صاف بیان کیں۔ بلکہ اس مبحث کو بتکرار ایسےطریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحاب ایمان کے لیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔ یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے مگر ازالہ تو گویا ہے ہی اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافتِ اسلامی اور بادشاہی دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف بادشاہی کو اور اُن تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو بادشاہی کے ساتھ مسلمان کی حیات اجتماعی میں از روئے تاریخ پیدا ہوئے۔ اور دوسری طرف اسلامی خلافت کی خصوصیات اور شرائط کو اور اُن رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں۔ جوخلافت اسلامی میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔اس کے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے''۔(تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۳)

ارتفاقات:

حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دوربین نگاہ اور بدلتے ہوئے حالات کے عمق اور حقیقت پسندانہ مطالعہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ایک طرف لوگ احکامِ شریعت بالخصوص حدیث و سنت کی تعلیمات و ارشادات نبوی کے اسرار و حکِمَ کے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اُن کے تمدنی، اجتماعی اور معاشرتی اور عملی فوائد معلوم کرنا چاہیں گے اور دوسری طرف وہ دین و زندگی میں ربط معلوم کرنا چاہیں گے۔اور دینی تعلیمات اور آسمانی ہدایات کو زندگی کے وسیع دائرہ (Canvas)اور انسانوں کے باہمی روابط و اسباب و نتائج کے باہمی تعلق کے سیاق و سباق (Context)میں سمجھنے اور اُن کی افادیت معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس لیے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کو---- ان مباحث سے شروع کیا ہے۔جن کا تعلق دُنیا کے نظام تکوینی اور حیاتِ انسانی سے ہے اور جن کی پابندی سے ایک صحت مند ہیت اجتماعی اور ایک صالح تمدن وجود میں آتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کے لیے ''ارتفاقات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے علم میں اس سے پہلے مسلمان متکلمین، فلاسفہ، اور علماء اجتماع نے (کم سے کم اس وضاحت اور تسلسل سے) استعمال نہیں کی۔

ارتفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراکِ عمل اور معتدل و متوازن شہری زندگی کے قیام

کے لیے ''تدبیرات نافعہ'' ہیں اور اس سلسلے میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مدن، عدالت، ضرب محاصل (Taxation)انتظام ملکی و تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اور ساتھ ہی اُن اسباب پر روشنی ڈالی ہے جس سے تمدن میں فساد پیدا ہوتاہے (تجدیدو احیائے دین صفحہ ۱۱۲)

اس طرح شاہ صاحب نے انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دُنیوی و اخروی زندگیوں سے بحث کی ہے۔شاہ صاحب کے نزدیک یہ نظام تکوینی انبیاء علیہ السلام کے لائے ہوئے تشریعی نظام کے نہ صرف مطابق ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے لیے ممد و معاون اور ان کے مقاصد کا خادم بن کر رہنا چاہیے۔۔ اُنہوں نے (علماء اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں) پہلی مرتبہ اقتصادیات و علم المعشیت کا علم الاخلاق سے گہرا ربط ثابت کیا ہے۔(مولانا مودودی کے الفاظ میں اُنہوں نے نظام اخلاق پر ایک اجتماعی فلسفے (Social philosophy)کی عمارت اُٹھائی) شاہ صاحب کے نزدیک جب یہ ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے۔ اُن کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اُس وقت بالکل برباد ہوجاتے ہیں جب کسی جبر سے اُن کو اقتصادی تنگی پر مجبور کردیا جائے۔(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۶)

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں وضاحت فرماتے ہیں کہ ''دین کی اصل ایک ہے اور شرائع مناہج میں کسی خاص عصر و قوم کی رعایت سے اختلاف ہوتا ہے پھر اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ دین کی ایک اصل ہونے کے باوجود ان مناہج پر مواخذہ کیوں ہوتا ہے۔

تیسیر، ترغیب و ترہیب کے اسرار وغیرہ کی ذیلی بحثوں کے بعد شاہ صاحب ایسے دین کی ضرورت ثابت فرماتے ہیں۔جو تمام ادیان کا ناسخ ہو۔ اور یہ کہ دین کو کیسے تحریف سے بچایا جا سکتا ہے۔ تحریف کن دروازوں اور ناکوں سے دین میں داخل ہوتی ہے وہ کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کیسے کیسے قالب اختیار کرتی ہے اور شریعت نے اس کے سّدباب کے لیے کیا راستے اختیار کیے ہیں اور کیا انتظامات کیے ہیں۔ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ عہد بعثت میں عہد جاہلیت کا کیا حا ل تھا۔ جس کی آنحضرت نے اصلاح فرمائی۔(تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم صفحہ ۲۳۷ تا ۲۳۸)

اس کتاب میں جہاد پر بھی پورا ایک باب ہے اور اس کو شاہ صاحب نے ان فکر انگیز اور چونکا دینے والے الفاظ سے شروع کیا ہے۔ جو ادیان و ملل کی پوری تاریخ، مقاصد خلق انسانی اور خالق کائنات کے

نظام مطلوب پر گہری نظر رکھنے والا عارف ہی کر سکتا ہے۔ ‘‘یاد رکھو کہ مکمل ترین شریعت اور کامل ترین قانون وہ شریعت ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو’’ اس کے بعد اس کی تشریح کی ہے اس کو عقلاً و نقلاً ثابت کیا ہے پھر فضائل جہاد کے اُصول و اسباب بیان کیے ہیں۔ مولانا شبلی کے نزدیک ‘‘شاہ ولی اللہ کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔
(ایضاً صفحہ ٢٣٦ تا ٢٣٧)

مولانا عبدالحق حقانی (صاحب تفسیر حقانی) حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمہ نعمۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں‘‘ جس فن میں یہ کتاب ہے آپ سے پہلے کسی نے اس کو ایک جگہ جمع نہ کیا تھا۔ اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی ‘‘من حیث المصلحۃ المفیدہ’’ ہے اور غایت اس کی یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور اُس کے رسول کے احکام میں نہ کچھ تنگی ہے، نہ وہ خلاف فطرت سلیمہ ہیں۔ تاکہ اُن پر انسان کو پورا وثوق ہو جائے۔ اور اُن کو فطرت پر مبنی باتیں سمجھ کر دل اُن کی طرف کھینچ آئے اور کسی مشکک کے بہکانے سے دل میں شبہ نہ پڑ جائے (ایضاً صفحہ ٢٣٨)

سیاسی انتشار اور حکومتِ مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ و قائدانہ کردار:

شاہ صاحب کے سامنے اُس وقت کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی زبوں حالی اور مرہٹوں، سکھوں اور جاٹ اقوام کی انتشار انگیز قوتیں تھیں۔ جو حالات کا فائدہ اُٹھا کر (خاص کر مرہٹہ) مسلمانوں کی زندگی کو اجیرن بنانے پر نہ صرف تلے ہوئے تھے۔ بلکہ مرہٹے تو ہندوازم کا احیاء بھی چاہتے تھے۔ شاہ صاحب اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو ایک طرف بیٹھ کر ان تمام خطرات سے چشمہ پوشی کرتے ہوئے تصنیف و تالیف ہی میں مصروف رہتے بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپسلانے اور ایک فرض شناس حقیقت پسند، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کی محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی، مستحکم و خوش حال سلطنت کے قیام کے لیے بھی ساعی اور سرگرم تھے۔ اور اس سلسلے میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے۔جو بڑے سے بڑا سیاسی مبصر ادا کر سکتا تھا جس کو تصنیف و تالیف اور درس و تحقیق سے ادنیٰ مناسبت اور ذرہ برابر فرصت نہ ہو۔

مجددین اور داعیانِ اسلام اور محققین و مصنفین میں اگر کسی کی زندگی میں یہ مماثلت نظر آتی ہے تو وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی

زندگی میں جنہوں نے ۷۰۰ ھجری میں شام کے مسلمانوں کو خون آشام تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور اُن کے اُکھڑتے ہوئے قدم جمائے۔پھر جب سلطانِ مصر محمد بن قلاؤوں نے شام آکر تاتاریوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اہل شام میں سخت انتشار اور اضطراب پیدا ہوا تو وہ خود مصر گئے اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا اور سلطان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی اور تاتاریوں کو ایسی شکستِ فاش ہوئی جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے (ہم اس کی تفصیل ابن تیمیہ کے تحت لکھ چکے ہیں)

شاہ صاحب نے بھی اپنے علمی مشاغل اور احیاء وتجدید کی مساعی کے ساتھ ایسے سیاسی تدبر اور ایسی ذہانت اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا امرائے سلطنت میں ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو ہندوستان نہ صرف تنگ نظر اور انتشارپسند ملکی حوصلہ آزماؤں سے محفوظ ہو جاتا بلکہ انگریزوں کے اس تسلط سے بھی محفوظ ہو جاتا۔ جس نے اُنیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کوکمزور اور میدان کو خالی پاکر اپنے قدم جمالیے اور اس کو برطانوی سلطنت میں نہ صرف شامل کیا بلکہ اس سے وہ قوت و وسائل حاصل کیے جس نے دُنیا کی پوری سیاست پر اثر ڈالا اور مسلم اور عرب ممالک پر اپنا اقتدار جمایا۔ (ایضاً صفحہ ۲۹۴ تا ۲۹۵)

شاہ صاحب علامہ ابن خلدون کے اس حکیمانہ مقولہ سے بے خبر نہ تھے کہ جب کوئی سلطنت بڑھاپے میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا از سرِ نوجوان ہونا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن صحیح فکر مندی، سچی طلب اور دل سے لگی ہوئی بات انسان کو ایسی جگہ قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے جہاں کامیابی کی اُمید موہوم بھی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا صاحب عزم بھی تنہا اس زوال کو عروج سے، کمزوری کو نئی طاقت اور توانائی سے بدل کر پورے ملک کے حالات میں انقلاب نہیں لا سکتا تھا۔ لہٰذا موہوم اُمید کے باوجود اُنہوں نے مغل فرمانرواؤں اور اُن کے امرائے دربار سے رابطہ رکھا تاکہ اُن کے اندر حمیت ملی و غیرت دینی کو بیدار کریں اور بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کرنے پر آمادہ کریں اس سلسلے میں ان کے علاوہ اندرونی طور پر اُنہوں نے نجیب الدولہ اور بیرونی طور پر احمد شاہ ابدالی سے رابطہ کیا۔

شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ سے خطوط لکھوائے اور پھر براہِ راست ایک پُر زور وپُراثر خط لکھا جو شاہ صاحب کی

سیاسی بصیرت، دینی خمیت، اخلاقی جرأت اور زورِانشا کا آئینہ دار ہے۔ شاہ صاحب کو اُمید تھی کہ اللہ تعالیٰ احمد شاہ ابدالی کے حالات کی اصلاح فرمائے گا۔ اور اس سے وہ کام لے گا جو بظاہر اسباب کسی اور امیر یا قائد کے بس کا نہیں ہے۔
شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی سے اس ملک کو غیر یقینی صورتِ حال اور افراتفری سے محفوظ کردینے اور سلطنت کو شاہی خاندان کے کسی نسبتاً لائق تر آدمی کے حوالہ کر دینے کا کام لینا چاہتے تھے۔ شاہ صاحب نے اُن کی آمد سے پہلے پیشن گوئی کر دی تھی کہ ابدالی یہاں ٹھہرے گا نہیں بلکہ واپس چلا جائے گا۔ بہرحال ابدالی نے ۱۷٦۱ کو پانی پت کے میدان میں ہندوستان کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اور مرہٹوں کو ہندوستان کے نئے اُبھرتے ہوئے سیاسی نقشہ سے باہر نکال دیا۔ اور اُن کے لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہوئی۔اور اُن کی طاقت چشم زون میں کافور ہوگئی۔
شاہ صاحب کے نقشہ کے مطابق ابدالی نے وقت کا یہ ضروری کام انجام دے کر قندھار کی طرف عنانِ عزیمت موڑ دی۔
خلیق نظامی تاریخ ہندوستان صفحہ ۳۰۹ تا ۳۱۰ میں لکھتے ہیں:
''اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تووہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لیے قائم کر سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی، جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اُٹھایا۔''

سید احمد بریلوی شہیدؒ

شاہ ولی اللہؒ کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی۔پھر شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقہ کو کافی وسیع کیا۔ ان لوگوں کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر

اُتر چکی تھی۔ اور یوں سید صاحب کی تحریک کے لیے زمین پہلے سے تیار ہو چکی تھی۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ۱۱۴ تا ۱۱۵)

سید صاحب ۱۲۰۱ ھجری بمطابق ۱۷۸۶ ؁ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ ھجری بمطابق ۱۸۳۱ ؁ میں بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔ ہم اُن کی زندگی کی دیگر تفصیلات سے گریز کریں گے۔ کیونکہ وہ یہاں ہمارا موضوع نہیں۔

تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اُن میں مشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اُٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔ جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی۔ اور لوگ جوق درجوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے حالانکہ یہ واقعہ اس پوری تاریخ کا صرف ایک باب ہے۔(سید سلیمان ندوی(بحوالہ سیرت احمد شہید از مولانا ابوالحسن ندوی صفحہ ۳۶ تا ۳۷)

<u>اس جدوجہد کے اصل مقاصد، محرکات اور اسباب کیا تھے۔ خود سید صاحب کی زبان سے سنیں</u>: طوالت کے خوف سے ہم چند ہی اقتباسات پیش کریں گے۔

<u>تعمیل حکم:</u>

اس تمام جدوجہد سے فقیر کا مقصود صرف یہ ہے کہ اہل کفر و ضلالت سے جنگ کرنے کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمانِ خداوندی :

‘‘جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ۔ "اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد کرو"۔

کی تعمیل کی صورت پیدا ہو۔ فرمان بردار بندے کے لیے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں’’۔

(مکتوب بنام سردار یار محمد خان)

‘‘فقیر کو حکم الٰہی کی تعمیل تہہ دل سے مقصود ہے۔ اور اللہ کے وعدے پر اعتماد ہے۔ باقی اس کی شکل کیا ہوگی؟ غلام کی کیا مجال

کہ وہ اپنے مالک سے پوچھے کہ وہ اپنے وعدے کا ایفا کس صورت سے کرے گا کہ یہ سوال آئین بندگی کے خلاف ہے۔ (ایضاً)

رضا و محبت الٰہی:

‘‘ہم محض رضائے الٰہی کے آرزو مند ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دُنیا و مافیہا سے ہاتھ اُٹھا چکے ہیں۔ ہم نے محض اللہ کے لیے علم جہاد بلند کیا ہے۔ ہم مال و منال، جاہ و جلال امارت و ریاست، حکومت و سیاست کی طلب و آرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔ خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں’’۔

(مکتوب عام بنام علماء و روسائے سرحد)

‘‘یہ سب کچھ محض اللہ کے لیے ہے---- میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد فقیر کے دل میں موجزن ہے۔ اُس میں رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا عزت و جاہ و مال و دولت، شہرت و ناموری، امارت و سلطنت، برادران و معاصرین پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہر گز دل میں نہیں ہے’’اور ہم جو بات کہہ رہے ہیں اللہ اس کا گواہ ہے۔’’

مسلمانوں کی بے بسی اور اہل کفر کا غلبہ:

اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے میں جنگ کرنا لازم ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ اہل کفر و طغیان کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے۔ مظلوموں کی آہ و فریاد کا غلغلہ بلند ہے۔ شعائر اسلام کی توہین اُن کے ہاتھوں صاف نظر آرہی ہے۔ اس بنا پر اب اقامتِ رکن دین یعنی اہل شرک سے جہاد عام مسلمین کے ذمے کہیں زیادہ مؤکد اور واجب ہو گیا ہے’’۔

(بنام شرفاء و سادات علماء مشائخ ہندوستان)

ہندوستان پر کفار کا تسلط اور اسلام کا زوال:

‘‘تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے۔ اور شعائر اسلام اُٹھ گئے۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا اور ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا۔ دل میں غیرت ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے’’۔

(بنام شاہ سلیمان(۱))

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط:

‘‘ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیرملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور اُنہوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی۔ کسی کو اُن سے مقابلے کی تاب نہیں۔ بلکہ ہر ایک اُن کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت اُن کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کرکے بیٹھ گئے ہیں۔اس لیے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑہ اُٹھایا۔’’
(بنام غلام حیدر خان)

دین کا قیام سلطنت سے ہے:

دین کا قیام سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام جن کا تعلق سلطنت سے ہے، سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔اور مسلمانوں کے کاموں کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھوں ان کی ذلت و کلبت اور شریعت مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مساجد و معابد کی تخریب جو ہوتی ہے وہ بخوبی ظاہر ہے۔(مکاتیب)

احکام شرعی کا نفاذ:

اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے۔ کسی کی مخالفت کے بغیر جاری ہو جائیں۔خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ پس ہر ترکیب و تدبیر، جو اس مقصد کے حصول کے لیے مفید ہوگی، عمل میں لاؤں گا۔’’ (بنام سردار سلطان محمد خان و سردار سید محمد خان)

زبانی دعوت و تبلیغ جہاد کے بغیر ممکن نہیں:

‘‘چونکہ زبانی دعوت و تبلیغ، شمشیر و سنان سے جہاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔اس لیے رہنماؤں کے پیش رو اور مبلغوں کے سردار محمد رسول اللہ ﷺ آخر میں کفار سے جنگ کرنے کے لیے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت اور شریعت کی سربلندی و ترقی اسی رکنِ جہاد سے ظہور پذیر ہوئی’’۔
(مشائخ و علماء و امرا ہندوستان کے نام)

عزم راسخ:

اس مہارت عظمیٰ کا ادا کرنا اور سعادتِ عالیہ کے حصول کا عزم اس طرح اس فقیر پر القا کیا گیا ہے کہ اس عظیم المرتبت کام کے انجام دینے میں جان و مال قربان کر دینا۔ اہل و عیال کو خیر باد کہنا اور وطن سے ہجرت کر جانا، ناپاک مکھیوں کوہانکنے اور خس و خاشاک

کو دور کرنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔''
(مکتوب بنام علماء مشائخ)

''جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہمارے سر جسموں کے ساتھ ہیں،ہم بصد حیلہ و فن اس سودے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے مالک کی اطاعت میں مشغول ہیں اور محض رضائے الٰہی کے آرزومند۔''۔ (مکتوب بنام علماء و روساء سرحد)

مقصود اصلی ہندوستان ہے:

اس ملک (سرحد)کو مشرکین کی نجاستونسے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحقاق اور ریاست و انتظام سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کیا جائے گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسانِ خداوندی کا شکر بجا لائیں گے۔ اور ہمیشہ اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے---اور شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز و انحراف نہیں کریں گے---اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کرونگا تاکہ اس کو شرک و کفر سے پاک کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے نہ کہ ملک خراسان (سرحد و افغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔'' (بنام شاہزادہ کامران)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کی نظر میں جہاد دین کا ایک نہایت اہم شعبہ اور تکمیلی قدم ہے۔ اُن کو قرآن مجید کی صریح آیات اور واضح احادیث کے پیش نظر تعمیل کا جذبہ اس پر اُبھارتا ہے۔

مسلمانوں کی بے بسی اور اہل کفر کا غلبہ رہ رہ کر اُن کے حساس دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ اور ہندوستان پر کفار کا تسلط اور اسلام کے زوال کا مشاہدہ اُن کو بے چین کرتا ہے---<u>اُن کا یقین ہے کہ سلطنت کے بغیر دین کا قیام ہو سکتا ہے اور نہ احکام شرعی کا نفاذ ممکن ہے۔ اور نہ دعوت و تبلیغ کاکام مکمل ہے۔ اور پھر جہاد ایسا بابرکت عمل ہے جس سے ساری دُنیا کو فیض پہنچتا ہے۔ یہ سب حقائق اُن کے دل میں جہاد کا عزم راسخ پیدا کر دیتے ہیں اور وہ اسی راستے میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔''</u>

(سیرت سید احمد شہید از ابو الحسن علی ندوی صفحہ ۳۸۳ تا ۴۱۱)

<u>مولانا مودودیؒ کے نزدیک اُن کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے:</u>

(الف) اُنہوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا اور جہاں اُنکے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا۔ کہ صحابہ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(ب) اُنہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر جہاد کی تیاری کی اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔۔۔۔۔غایت تدبر کے ساتھ شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا۔۔۔۔پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اُصول و اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دُنیا پرست جنگ آزما کے مقابلے میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہو تا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے دُنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں روحِ اسلامی کا مظاہرہ کر دیا۔ اُن کی جنگ ملک و مال، یا قومی عصبیت یا کسی دنیوی غرض کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔اُن کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشا کے مطابق ہے۔۔۔۔اس شان کے ساتھ خالص اسلامی جہاد ہندوستان کی سرزمین پر نہ اُن سے پہلے ہوا تھا اور نہ اُن کے بعد ہوا۔

(ج)اُن کو ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا۔اُنہوں نے ٹھیک اس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۷)

بہت سے مؤرخین اور مصنفین نے ان کی تحریک کی بظاہر ناکامی اور اس سلسلے میں اُن کی حکمتِ عملی کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب کا موضوع نہیں۔اس لیے ہم اس سے یہاں صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اور اگر اللہ نے چاہا تو اس پر آئندہ کسی وقت تفصیلی بحث کریں گے۔

سید قطب شہیدؒ

سید قطبؒ کا اصلی نام سیّد ہے۔ قطب اُن کا خاندانی نام ہے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے ہیں۔اُن کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی بڑے صاحب علم و فضل ہیں۔ اُن کے قلم سے اب تک لا تعداد ضخیم کتابیں مختلف اسلامی موضوعات پر نکل چکی ہیں۔ امینہ قطب اُن کی بہن بھی پڑھی لکھی خاتون ہیں اور دعوتِ جہاد میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ سرگرمِ کار رہی ہیں۔اُن کی دوسری بہن حمیدہ قطب بھی میدان جہاد میں اپنے بہن بھائیوں سے پیچھے نہیں رہی ہیں۔یوں خاندان قطب کا ہر فرد گوہر یک دانہ نظر آتا ہے۔ اور اس مثل کا صحیح مصداق ہے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' صبر و عزیمت اور آزمائش و ابتلا میں بھی اس خاندان نے بیسویں صدی میں جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا ہے اُس نے آل، یاسر کی مثال زندہ کر دی ہے۔ سید قطب نے تختہ دار کو چوم لیا۔ محمد قطب جیل میں ڈال دئیے گئے اور تہذیب و تشدد کا نشانہ بنے۔حمیدہ قطب کو بھی سات سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ امینہ قطب بھی ایسے ہی انجام سے دو چار ہوئی۔ تیسری بہن نے اپنے لخت جگر سید رفعت کو راہِ حق میں قربان کر دیا۔ اور جلّاد کے تازیانوں نے اُسے شہید راہِ الفت کے خطاب سے نواز دیا۔

سید قطبؒ ۱۹۰۶ میں مصر کے ضلع اُسیوط کے موشانامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان۔ والد زراعت پیشہ تھے۔ والدہ بڑی دین دار خاتون تھیں۔ اور قرآن مجید سے بڑا شغف رکھتی تھیں۔ اُن کی آرزو تھی کہ اُن کے بچے حافظ قرآن ہوں۔سید قطب نے بچپن میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا۔ سید قطب نے اپنی کتاب ''التصویر الفنی فی القرآن'' کا انتساب اپنی والدہ محترمہ کی طرف کیا ہے۔اور اُن کی قرآن سے شیفتگی کا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ اس طرح اپنے والد کے تعلق باللہ کو دیکھتے ہوئے کتاب ''مشاہد القیامہ فی القرآن'' کو اُن کی طرف منسوب کیا ہے۔ اُن کی تعلیمی زندگی چونکہ ہمارا موضوع نہیں۔ اس لیے اُس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ وہ ۱۹۴۵ میں اخوان سے وابستہ ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ فروری ۱۹۴۹ میں اخوان کے رہنما اور مرشدِ عام اُستاذ حسن البنا شہید کر دیے گئے۔اور اخوان کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ آزمائش کا یہ مرحلہ مصر میں فوجی انقلاب کے قیام تک جاری رہا۔جولائی ۱۹۵۲ میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ اور اس کے ساتھ آلام و مصائب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس دوران میں اخوان کے

اندر جن لوگوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی۔اُن میں ایک حسن الہضیبی ہیں۔ جنہیں بعد میں اخوان کا مرشد عام منتخب کر لیا گیا۔ دوسرے عبدالقادر عودہ شہید ہیں۔ جو جماعت کے سکریٹری جنرل (وکیل) مقرر ہوئے۔ اور تیسرے جناب سید قطب جنہوں نے فکری میدان میں جماعت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔
جولائی ۱۹۵۴ میں وہ اخوان کے جریدہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر صرف دو ماہ کی مدت کے بعد کرنل ناصر کی حکومت کی طرف سے یہ اخبار بند کر دیا گیا۔ کیونکہ اس اخبار نے اخوان المسلمون کی پالیسی کے تحت اُس اینگلو مصری پیکٹ کی مخالفت کی تھی۔ جو جولائی ۱۹۵۴ میں جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا۔
اس پیکٹ کے بعد اخوان اور ناصر کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا اور اخوان شدید تر دور ابتلا میں گھِر گئے۔ ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومت مصر نے اخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اخوان رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ اُنہیں موت کی سزائیں دی گئیں۔ جن لوگوں کو موت کی سزائیں دی گئیں۔(۷ نومبر ۱۹۵۴) اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

(أ) عبدالقادر عودہ (۲) محمد فرغلی (۳) یوسف طعت (۴) ابراہیم الطیب (۵) ہنداوی دویرا (٦) محمود عبداللطیف۔

ہر اُس شخص کی عزت و آبرو اور جان و مال پر دست درازی کی گئی جو اخوان کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتا تھا۔ اور اس طرح چند ہفتوں کے دوران گرفتار شدگان کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔

ابتلا کا آغاز:

ان گرفتار شدگان میں سید قطب بھی تھے۔ اُنہیں مصر کے مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اُن کی گرفتاری اور تعذیب کی داستان بڑی زہرہ گداز ہے۔ شام کے ہفت روزہ الشہاب کے حوالے سے ہم اس کی تلخیص پیش کرتے ہیں۔
‘‘فوجی افسر جب سید قطب کو گرفتار کرنے کے لیے اُن کے گھر داخل ہوئے تو سید اُس وقت شدید بخار میں مبتلا تھے۔ اُنہیں اسی حالت میں پابند سلاسل کیا گیا۔ اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ راستے میں شدت کرب کی وجہ سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر جاتے۔اور جب ہوش میں آتے تو اُن کی زبان پر اللہ اکبر و للہِ الحمد (اخوان کا نعرہ) کے الفاظ جاری ہوتے۔ اُنہیں جب فوجی جیل میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازہ پر اُن کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی (۱۹٦۷ کی عرب اسرائیل کے بعد یہ شخص غداری

کے الزام میں خود گرفتار ہو چکا ہے) اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی۔ جوں ہی سید قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے اُن پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے تک اُن کو زدو کوب کرتے رہے۔جیل کے اندر اُن پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا۔ جو اُن کی ران منہ میں لے کر اُنہیں ادھر اُدھر گھسیٹتا رہا۔ ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی۔ ان مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے''۔

موصوف کے ایک شاگرد جناب یوسف الغظم لکھتے ہیں:۔

''تعذیب کے گوناگوں پہاڑ سید قطب پر توڑے گئے۔ اُنہیں آگ سے داغا گیا۔ پولیس کے کتوں نے اُنہیں کچلیوں میں لے کر گھسیٹا۔ اُن کےسر پر مسلسل کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا۔۔۔ مگر ان سب چیزوں نے سید صاحب کے ایمان و اذعان میں اضافہ کیا اور حق پر اُن کے قدم مزید جم گئے''۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۵ کو جب اُن کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ تو سید قطب کو علالت اور معذوری کے سبب پندرہ سال قید با مشقت کی سزا سننے کے لیے عدالت میں حاضر کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ ابھی اس سزا کا ایک سال ہی گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ نے جیل جاکر اُنہیں یہ پیش کش کی کہ '' اگر آپ چند سطریں معافی نامہ کی لکھ دیں۔ جنہیں اخبارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس پیش کش کے جواب میں اس مردِ مومن نے جو جواب دیا۔ اُسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اُنہوں نے کہا:

''مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم! اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو میں تب بھی کہنے کے لیے تیار نہ ہوں گا۔اور میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا۔ کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو''۔

جیل میں جب کبھی اُن سے اس پیش کش کا ذکر کیا گیا۔ اور معافی کا مشورہ دیا گیا۔ تو اُنہوں نے ہمیشہ یہ کہا:

''اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

بالآخر ۱۰ سال کے بعد اُن کو رہائی نصیب ہوئی۔ سابق صدر جمہوریہ عراق عبدالسلام عارف جو کہ سید قطب کی علمی اور

دینی تصانیف سے متاثر تھے۔ رہائی کی درخواست کی جسے صدر ناصر نے مان لیا کیونکہ وہ عبدالسلام عارف مرحوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے متمنی تھے۔ مگر اس رہائی سے عملاً کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ وہ برابر پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ اور اُنہیں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہ تھی۔ اس عارضی رہائی کے دنوں میں اُن سے ملاقات کرنے والوں میں پیرس کے اُستاد محمود الرکابی بھی شامل ہیں۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ پولیس ملاقات کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھتی تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ سید قطب کو آنے والی شہادت صاف نظر آرہی تھی۔

دوبارہ گرفتاری اور سزا:۔اس مقید آزادی کے ایک سال کے اندر سید قطب کو دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ اُن پر حکومت وقت سے بغاوت، عوام کو بغاوت پر اُبھارنے، صدر ناصر کو قتل کرنے کی سازش اور تخریبی اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے الزامات عائد کیے گئے۔چنانچہ نہ صرف اُنہیں بلکہ اُن کے بھائی محمد قطب اور اُن کی ہمشیرگان حمیدہ قطب اور امینہ قطب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ان کے علاوہ اور بھی کثیر تعداد کو گرفتار کیا گیا۔ مرحوم کی بصیرت نے اندازہ لگا لیا تھا۔کہ یہ دوبارہ گرفتاری حکومت کی جانب سے کسی انتہائی اقدام کی تمہید ہے چنانچہ اس گرفتاری کے موقع پر اُنہوں نے فرمایا تھا۔

‘‘میں جانتا ہوں کہ اس بار حکومت میرا سر چاہتی ہے۔ مجھے کوئی ندامت نہیں، نہ اپنی موت پر افسوس۔ میری سعادت کہ مجھے اپنی دعوت کی راہ میں موت نصیب ہونے والی ہے۔ اس بات کا فیصلہ مستقبل کا مورخ کرے گا۔ کہ راہِ راست پر کون تھا۔ اخوان یا حکومتِ وقت۔

(خلیل حامدی:مصر اور اخوان۔ رسالہ ترجمان القرآن لاہور ستمبر ۱۹۶۶ صفحہ ۵۶)

ایک عدالت تشکیل دی گئی۔اپنی تشکیل اور ضابطۂ کار دونوں کے لحاظ سے یہ ایک فوجی عدالت تھی۔ ان ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل مقدمہ کی پیروی کرنے والا نہ تھا۔ ملک کے باہر کے وکلا نے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہی مگر اُنہیں اجازت نہیں دی گئی۔ سوڈان کے دو وکیل از خود قاہرہ پہنچ گئے اور اپنے آپ کو رجسٹر کراکر پیروی کے لیے عدالت پہنچے۔ لیکن پولیس نے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اور فی الفور مصر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ ٹریبونل کے سامنے جو کاروائی ہوئی اُس میں ملزموننے بتایا کہ زبردستی اقبال نامے (confessions)حاصل

کرنے کے لیے اُن کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ خود سید قطب نے بھی یہی الزام لگایا۔ لیکن ٹریبونل کے صدر نے ملزم کا منہ فوراً بند کر دیا۔ اور ُن کی شہادت سننے سے انکار کر دیا۔
ایمنسٹی انٹر نیشنل (Amnesty International) نے جب حکومت مصر سے درخواست کی کہ اس کے ایک نمائندے کو مقدمہ میں شرکت کی اجازت دی جائے تو اس درخواست کو رد کر دیا گیا۔ پھر اُنہوں نے ایک مبصر کی حیثیت سے اجازت طلب کی۔ تو یہ درخواست بھی نہ مانی گئی۔
اگست ١٩٦٦ کو سید قطب اور اُن کے دو ساتھیوں کو فوجی ٹریبونل کی طرف سے موت کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان سزاؤں پر پوری دُنیا کے اندر شدید ردعمل ہوا۔ مگر اُن کی شنوائی نہ ہوئی۔ اور بالاخر ٢٥ اگست ١٩٦٦ کی صبح کو یہ سزائیں نافذ کر دی گئیں۔اور یہ بے نظیر شخصیت، جومصر اور عرب دُنیا کے الحاد پرست اور لادین عناصر کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اپنے رب سے ''راضیا مرضیّا '' جا ملی۔
وہ اپنے پیچھے تصانیف کی ایک لمبی فہرست چھوڑ گئے ہیں۔ جن کی تعداد ٢٢ ہے۔لیکن اُن میں زیادہ مشہور تفسیر <u>فی ظلال القرآن</u> ہے۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ ٨ جلدوں میں ہے۔ یہ دراصل اُن تاثرات سے عبادت ہے جو مطالعۂ قرآن کے دوران اُن پر طاری ہوئے ہیں۔ لیکن ان تاثرات کو مفسر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کے اندر دعوت و اصلاح اور تنبیہ و تذکیر اور نورو عرفان کے جو سمندر موجزن ہیں اُن کا عکس کاغذ کے صفحات پر منتقل ہو گیا ہے۔ یہ تفسیر اسرائیلیات سے مکمل طور پر خالی ہے۔ پوری تفسیر کے اندر ایک ایسی شفاف اور پاکیزہ روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جو یقین و اذغان کی دولت اور ایمان و عقیدہ کی گہرائی اور صبر و عزیمت کی نعمت سے لبریز ہے۔ اس چیز نے تفسیر کو ایک متحرک زندگی اور رواں دواں اسلامی تحریک کی کتاب ہدایت کی شکل دے دی ہے۔
<u>العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام</u> (اسلام میں عدل اجتماعی) مصنف کی یہ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدل کے بارے میں اس کے مزاج کی وضاحت میں پوری طرح کامیاب قرار دی جا سکتی ہے۔ سید قطب کے نزدیک اسلام کے قانونی ضوابط سے زیادہ اہم وہ روح و مزاج ہے جس کا اسلامی نظام حامل ہے۔ سید قطب کے نزدیک آج

دُنیا ایک تہذیبی بحران سے گزر رہی ہے اور ہر طرف ایک متوازن نظامِ زندگی کی تلاش ہے۔ وہ اُسے صرف اسلام کی آغوش میں مل سکتا ہے۔

معالم فی الطریق:

یہ موصوف کی آخری تصنیف ہے۔ پاکستان میں اس کا اُردو ترجمہ''جادۂ و منزل'' کے نام سے جناب خلیل حامدی صاحب نے کیا ہے۔ جبکہ ہندوستان میں اس کا اردو ترجمہ ''نقوش راہ'' کے نام سے چھپا ہے۔یاد رہے کہ یہی وہ کتاب ہے جس نے سید قطب کو تختہ دار تک پہنچایا۔

(۲)سید قطب خود اس کتاب کے مقدمہ میں صفحہ ۲۲ پر صراحت فرماتے ہیں کہ:

اس کتاب کے چار ابواب میری تفسیر ''فی ظلال القرآن'' سے ماخوذ ہیں۔ جن میں میں نے موضوع کی رعایت سے کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔ اس مقدمہ کے علاوہ باقی آٹھ ابواب میں نے مختلف اوقات میں قلمبند کیے ہیں۔ قرآن کریم کے پیش کردہ ربانی نظریات پر غوروفکر کے دوران میں مختلف اوقات میں مجھ پر جو حقائق منکشف ہوئے وہ میں نے ان ابواب میں سپرد قلم کر دئیے ہیں۔ یہ خیالات بظاہر بے جوڑ اور منتشر معلوم ہونگے۔مگر ایک بات ان سب میں مشترک ملے گی اور وہ یہ کہ یہ خیالات ''معالم فی الطریق'' ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر راستے کی علامات کا یہی حال ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ گزارشات ''معالم فی الطریق'' کی پہلی قسط ہیں۔'' مرحوم کی خواہش تھی۔ کہ اُن کو اس موضوع پر اور بھی چند مجموعے پیش کرنے کی توفیق نصیب ہوگی۔(مگر سید صاحب اپنے اس ارادے کو شرمندۂ تکمیل نہ کرسکے بلکہ یہ کتاب اُن کی آخری تصنیف ثابت ہوئی)

اس کتاب میں سید قطب نے بتا یا ہے کہ دُنیا میں رائج طرز زندگی، ہدایت الٰہی سے انحراف اور انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر مبنی ہونے کہ وجہ سے ''جاہلی طرززندگی''ہے۔آج اللہ کا نام لینے والے بھی، اللہ ہی کو حاکم تسلیم کرکے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم قرآن کریم اور تعلیمات نبویؐ کے مطابق کرنے کی بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو حکمران بنائے ہوئے ہیں۔یہی وہ جاہلیت ہے جسے مٹانے کے لیے نبی تشریف لائے تھے۔ اس معاشرہ میں جو افراد بھی اسلای زندگی گزارنے اور اللہ کی زمین پر اللہ کا دین قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔اُن کو چاہیے۔ کہ موجودہ طرز زندگی کی جگہ اسلامی طرز زندگی رائج کرنے کی

کوشش کریں۔ یہ کوشش اسی طریقے سے کی جانی چاہیے جو طریقہ محمد ﷺ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی انسانوں کو اللہ واحد کی بندگی اختیار کرنے اور غیر اللہ کی بندگی سے نکلنے کی دعوت دینی چاہیے۔۔اسلامی افکار و عقائد کو اپنا کر اپنی انفرادی سیرت و کردار کو اُن کے مطابق بدلنے اور اجتماعی زندگی کو ان قدروں اور قوانین کی بنیاد پر از سر نو منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔جو قرآن و سنت نے ہمیں عطا کیے ہیں۔ نظام حکومت اور معیشت کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالے بغیر زندگی کی اصلاح و تعمیر ممکن نہیں۔ نبی ﷺ کا اُسوہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب ایک مسلم معاشرہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانے، اُنکا حق خود ارادیت بحال کرکے اُن کے سامنے حق کی دعوت پیش کرنے اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کا مشن لے کر اُٹھتا ہے۔یہی اسلامی جہاد ہے۔ اسلام میں جہاد کا اصل مقصد ان مادی قوتوں کو راہ سے ہٹا دینا ہے جو بندگان، خدا اور قبول حق کے درمیان حارج ہوں۔ اور اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرتی ہوں۔
(اسلام میں عدلِ اجتماعی ترجمہ نجات اللہ صدیقی صفحہ۔١٧ تا ١٨ مقدمہ)

اس کتاب کی پوری سکیم جس بنیادی نقطہ پر مرکوز ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح اسلام کے صدر اول میں اسلامی معاشرہ ایک مستقلاور جداگانہ معاشرہ کی صورت ترقی و نمو کے فطری مراحل طے کرتا ہوا بام عروج کو پہنچا تھا۔اسی طرح آج بھی ویسا صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لیے اس طریق کار کو اختیار کیا جانا لازم ہے۔ اس اسلامی معاشرہ کو اردگرد کے جاہلی معاشروں سے الگ رہ کر اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا (جادہ و منزل ترجمہ خلیل حامدی صفحہ۔٥١)

فردِ قرار دادِ جرم:

مصری حکام نے سید قطب کی اس صحیح اسلامی دعوت کو یہ معنی پہنائے کہ اس میں حکومتِ وقت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے لوگوں کو اُکسایا گیا ہے۔ اس کتاب کے مختلف اقتباسات سے جو فردِ جرم تیار کی گئی وہ ہم پوری تو طوالت کے خوف سے نقل نہیں کر سکتے۔ البتہ چند اہم اقتباسات قارئین کے سامنے رکھیں گے۔ البتہ تفصیلات کے خواہشمند یہ فردِ جرم مسلح افواج کے میگزین (مجلۃ القوات المسلحۃ) کے نمبر ٣٣٦ شمارہ یکم اکتوبر ١٩٦٥ میں ملاخظہ کر سکتے ہیں۔

اس میگزین نے پہلے تو سید قطب کو باغی اور غدار کہا ہے اور اُن پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ مصر کے اندر وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ کرنا چاہتے تھے اور مصری حکام کے نامور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو قتل کرنے کی سکیم تیار کر رہے تھے۔ اس کے بعد میگزین نے ان الزامات کے ثبوت کے لیے ''معالم فی الطریق'' کی عبارتوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

''مصنف سید قطب کا دعویٰ ہے کہ یورپ کے پاس---- اب کوئی سرمایۂ حیات باقی نہیں رہا ہے یہی حال وطنی اور قومی نظریات کا ہے۔ لہٰذا اب انسانیت کو نئی لیڈر شپ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اُمتِ مسلمہ کے وجود کو بحال کیا جانا ناگزیر ہے۔ ان خیالات کے بعد مصنف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آج دُنیا جاہلیت کے اندر غرق ہے۔ اس جاہلیت نے دُنیا کے اندر اللہ کے اقتدار پر اور اللہ کی حاکمیت پر جو الوہیت کی صفت خاص ہے، غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے''۔

''مصنف قرآن مجید کو عقیدہ کا اساسی ماخذ قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جاہلی معاشرے کے تسلط سے نجات حاصل کریں اور اس کے ساتھ مصالحت کی روش اختیار نہ کریں۔اور نہ اُس کے ساتھ وفاداری کا موقف پسند کریں۔ ہمارا مشن موجودہ جاہلی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالنا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی اقدار اور تصورات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہ کرنی چاہیے۔ اور نہ جاہلی نظام کے ساتھ کسی مقام پر سودا بازی کا خیال تک کرنا چاہیے۔ یہ مہم سر انجام دینے کے لیے ہمیں غیر معمولی قربانیاں دینی ہونگی۔''

''اس فیصلہ کے بعد مصنف مختلف اسالیب اختیار کرکے یہ دعوت دیتا ہے کہ ارضی اقتدار کے خلاف انقلاب برپا کردو جس نے الوہیت کی صفت خاص پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اُس کا بیان ہے ''محمد ﷺ بھی عرب قومیت کی تحریک برپا کرکے قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر سکتے تھے اور عربوں کے سلب شدہ علاقوں کو استعماری سلطنتوں (رومن اور فارسی ایمپائر) سے آزاد کروانے کے لیے اُن کے قومی جذبات بھڑکا سکتے تھے لیکن یہ صحیح راستہ نہیں تھا کہ دُنیا رومی اور فارسی طاغوتوں کے چنگل سے نکل کر عربی طاغوت کے چنگل میں گرفتار ہو جائے''۔

''طاغوت سے مراد ہر وہ معبود ہے جو اللہ کے ماسوا ہو۔ طاغوت کا لفظ بتکدوں کیلیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اسی مفہوم کی بنا پر طاغوت ''گمراہی کے سرغنوں'' اور الٰہی اقتدار پر دست درازی کے لیے استعمال کیا گیا''۔

مصنف کا بیان ہے کہ رسول اللہ دین اسلام لے کر آئے تھے۔اُس وقت عربی معاشرہ انتہائی حد تک بگڑ چکا تھا۔ تقسیم دولت اور عدل و انصاف کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔۔۔ ایک محدود اقلیت سودی کاروبار کے ذریعے اپنی دولت میں مزید اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ رہی اکثریت تو اُن کے پاس بھوک اور افلاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس پر مصنف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اللہ سبحانہ جانتا ہے کہ معاشرہ کے اندر اجتماعی عدل کا نظام ایک ایسے عقیدہ پر استوار ہونا چاہیے۔ جو ہر معاملے کا فیصلہ اللہ کی طرف لوٹاتاہو۔ اور معاشرہ تقسیم دولت کے بارے میں اللہ کے عادلانہ فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرتا ہو۔ ایسا نظام اُس صورت میں خالصتاً الٰہی نظام بن کر نمودار نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اسلام قومی نعرے یا اجتماعی تحریک (یعنی لادینی تحریک) سے اپنی دعوت کا آغاز کرتا''۔

''مصنف کا یہ نظریہ ہے کہ عقیدہ فوری طور پر ایک متحرک معاشرے کی شکل میں اُبھرآنا چاہئے۔ ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ جس جاہلیت سے رسول اللہ کو سابقہ درپیش تھا وہ ایک ''مجرد نظریہ'' نہ تھی۔ بلکہ ایک متحرک اور توانا معاشرہ تھی۔ اور معاشرے کی لیڈر شپ کے آگے سرنگوں تھی۔ لہٰذا انسان کی پوری کی پوری زندگی اللہ کی طرف لوٹ جانی چاہیے۔۔ انسان زندگی کے کسی معاملے اور کسی پہلو میں اپنی خودمختاری کی بنا پر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ نیز جاہلی معاشرہ کے اندر ایک نیا متحرک اور توانا معاشرہ اُبھر آنا چاہیے۔۔ جو جاہلی معاشرہ سے بالکل الگ تھلگ اور مستقل ہو۔ اور اس جدید معاشرے کا محور ایک نئی قیادت ہو۔ رسول اللہ کے حین حیات یہ قیادت آپ کے لیے مخصوص تھی۔ اور آپ کے بعد ہر وہ قیادت یہ ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جو انسانوں کو صرف اللہ کی الوہیت، حاکمیت اقتدار اور شریعت کے آستانے پر جھکائے۔ جو شخص یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ جاہلیت کے متحرک معاشرے سے قطع تعلق کرے جس سے وہ نکل کر اسلامی معاشرہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اسی طرح جاہلی قیادت سے بھی رشتہ منقطع کرلے۔ چاہے وہ کاہنوں، پروہتوں، جادوگروں اور قیافہ شناسوں کی مذہبی قیادت ہو یا سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی قیادت ہو جیسا کہ قریش کو حاصل تھی۔ وہ اپنی تمام تر وفاداریاں نئے اسلامی معاشرے یا اسلامی جماعت کے لیے مخصوص کردے۔ مسلم معاشرہ ایک کھلا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اُس میں ہر نسل و قوم اور ہر رنگ و لسان کے لوگ شامل ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کبھی

بھی محض '' عربی تہذیب'' یا ''قومی تہذیب'' نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اسلامی اور نظریاتی تہذیب تھی۔''

''مصنف یہ تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا ہے کہ جو قتال کے لیے آئے اُس سے قتال کیا جائے اور جو قتال سے دست بردار ہو جائے اُس سے ہاتھ روک لیا جائے لیکن بایں ہمہ مصنف یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام نے صرف دفاع کے لیے جہاد نہیں کیا بلکہ اسلام روز اول سے یہ نصب العین رکھتا ہے۔کہ اُن تمام نظاموں اور حکومتوں کو ختم کیا جائے گا جو انسان پر انسان کی حاکمیت قائم کرتی ہیں۔ اسلام کے غلبہ کے بعد افراد کو فکری آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی منشا سے جس دین کو چاہیں اختیار کریں (یہ آخری فقرہ بالکل ہی مصنف پر غلط الزام ہے۔ بلکہ وہ تو فرماتے ہیں کہ اسلام اپنی راہ میں حرج رکاوٹ (جوکہ طاغوت ہوتی ہے) کو جب ہٹا دیتا ہے تو پھر افراد انسانی کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو دین اختیار کرنا چاہیں وہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لا اکراہ فی الدین کی اُنہوں نے یہ تفسیر کی ہے۔ مرتب)

آگے پھر فردِ جرم لگاتے ہوئے میگزین اُن کے بیانات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے من مانی تاویلات کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''مصنف نے قرآن کی آیات سے ثابت کیا ہے کہ اگر اسلامی معاشرے کے قیام کے راستے میں مادی موانع حائل ہو رہے ہوں تو اُن کا طاقت کے ذریعے ازالہ ضروری ہے۔ یہ مصنف کی طرف سے ایک گھپلا ہے۔ قرآن کی جن آیات سے اُس نے استشہاد کیا ہے وہ قتال فی سبیل اللہ کی دعوت دیتی ہیں نہ کہ قتل و غارت پر اُکساتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ مصنف نے باصرار کئی مقامات پر ''طاقت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور وہ باربار اس سے یہ مراد لیتا ہے۔ رکاوٹوں کا ازالہ، رائج الوقت نظام کا خاتمہ''۔ ''قوانین کا ابطال'' وہ کہتا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص وقت میں جماعت مسلمہ کو جہاد سے روک دیا تھا تو یہ صرف منصوبہ بندی کا تقاضا تھا۔اُصولی فیصلہ نہ تھا۔ مصنف ہر حکمران کو ''شریک خدا'' تصور کرتا ہے اور انسان کے انفرادی حقوق کی پُر زور حمایت کرتا ہے۔

(اس بارے میں مصنف نے العدالۃ الاجتماعیۃ میں تفصیل سے بحث کی ہے)

''دوسری طرف مصنف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں لوگوں کی اجتماعی زندگی رائے و انتخاب کی آزادی پر اُستوار ہو وہ متمدن و مہذب معاشرہ ہوتا ہے لیکن جس معاشرے کی تشکیل میں لوگوں کی

آزادانہ رائے کا حصہ نہ ہو وہ معاشرہ پسماندہ ہے۔ اسلامی اصطلاح میں وہ جاہلی معاشرہ ہے۔''
یہ ہے وہ فردجرم جو سید قطب پر لگائی گئی ہے اور اسے معالم فی الطریق کے مضامین سے کشید کیا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سید قطب نے اس کتاب میں انقلاب کی سکیم پیش کی ہے۔اور اپنے بہن بھائیوں اور رفقا کی مدد سے وہ اس سکیم کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔

سید قطبؒ اور مولانا مودودیؒ: مصر کے روزنامہ الکاتب نے جو مصر کے کمیونسٹ عناصر کا ترجمان ہے۔اُس نے عدالتی کاروائی کے دوران ایک مفصل مضمون شائع کیا اس مضمون کا عنوان ہے ''اخوان کے تشدد پسندانہ نظریات کے ماخذ'' اس مضمون کے آغاز میں مضمون نگار لکھتا ہے:۔

''فوجی ٹریبونل نے ''معالم فی الطریق'' کے ماخذ پر بھی بحث کی ہے چنانچہ ایک موقع پر ٹریبونل کے صدر نے سید قطب سے سوال کیا کہ کیا یہ خیالات تم نے ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے نقل نہیں کیے ہیں۔ سید قطب نے جواب دیا '' میں نے مولانا مودودی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے''
عدالت کی طرف سے پھر یہ سوال کیاگیا کہ '' تمہاری دعوت اور ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت میں کیا فرق ہے؟ سید نے کہا لافرق (کوئی فرق نہیں ہے) اس کے بعد مضمون نگار جو مصر کی کمیونسٹ پارٹی کا اہم رکن ہے (یہاںہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امریکی لابی، مغربی لابی اور اشتراکی لابی سب کی اسلام کے احیاء کے بارے میں گمراہ کن نظریات ہیں اور کسی طور اسلام کا احیاء نہیں چاہتے۔اس لیے اُن کے نزدیک اسلامی اتحاد، اس کے لیے جدوجہد چاہے وہ جس ملک میں ہو۔ اُن کے لیے باعث تشویش ہے۔مؤلف)لکھتا ہے:۔
''اسلامی اتحاد کا نظریہ برطانوی استعمار اور امریکی امپریلیزم کا ایجاد کردہ ہے اور ۱۹۴۷ سے اسے اشتراکیت کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کی جنم بھومی پاکستان ہے۔ پاکستان ہی میں یہ پیدا ہوا اور پھلا پھولا ہے۔ مودودی اسی ملک میں رہتا ہے۔ سعید رمضان نے بھی کئی سال اس ملک میں بسر کیے ہیں اس لیے یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ کہ اخوان کی تحریک کو سنٹو کی طرف سے مالی امداد دی گئی ہے۔ اور یہ بھی کوئی نرالی بات نہیں کہ سامراج از سر نو اپنا محبوب مہرہ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی مذہب کا استحصال-------

ان تمہیدی کلمات کے بعد مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ سید قطبؒ نے مولانا مودودیؒ کے افکار و نظریات کا سرقہ کیا ہے۔ اور اُنہیں معالم فی الطریق میں مدون کیا ہے۔مضمون نگار نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پہلے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی تاریخ بیان کی ہے اور اس کے بعد مولانا مودودی اور قطب کے افکار کا موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سید قطب نے اپنی کتاب میں ''حاکمیت'' اور ''جاہلیت'' اور ایسی ہی دوسری جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ وہ مولانا مودودی کا نتیجہ فکر ہیں۔ اور پھر اس کے ثبوت میں مولانا مودودی کی مختلف تصنیفات وغیرہ سے مفصل اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اسی طرح پردے اور عورت کے بارے میں اور انفرادی ملکیت کے بارے میں سید قطب کے نظریات کو مولانا مودودی کے نظریات کا چربہ بتایا ہے'' (قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہی الزام یہاں پر چند لوگ مولانا مودودی پر لگا رہے ہیں کہ اُنہوں نے سید قطب کی نقالی کی ہے حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دونوں کے ماخذ ایک ہی ہیں یعنی قرآن و سنت)

رہی یہ بات کہ سید قطب اور مولانا مودودی کے افکار میں ہم آہنگی یا توارد ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے جو شخص بھی صاف ذہن اور اخلاص و عزیمت کے ساتھ کتاب و سنت کا مطالعہ کرےگا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا جس پرسلف صالحین پہنچے تھے یا جو آج مولانا مودودی، سید قطب اور دوسرے علماء حق بیان کر رہے ہیں۔

(جادہ و منزل خلیل حامدی۔صفحہ ۵۱ تا۵۹)

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں کہ:۔

سید قطب کو ٦١ سال کی عمر میں معذوری کی حالت میں پھانسی چڑھانے کا مقصد صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ سید قطب کے جسم کو روح سے محروم کر دیا جائے۔اس مقصد کا سراغ لگانے کے لیے آگے نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے ذریعے اخوان المسلمون کو بالخصوص اور مصر میں تجدید و احیائے اسلام کے خواہاں افراد کو بالعموم یہ بتلا دیا جائے کہ اُن کی راہیں مسدود کرنے، اُن کی سرگرمیاں بند کرنے اور اُنہیں اس مقصد میں ناکام بنا دینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے گا۔ اسلام کو نجی دائرہ میں محدود رکھنے پر قانع نہ رہ کر اُسے پوری زندگی میں نافذ کرنے کا حوصلہ رکھنے والوں کیلیے یہ ایک تنبیہ ہے۔کہ اگر وہ اقتدار وقت کے قہر و غضب سے محفوظ و مامون رہنا چاہتے ہیں تو اُنہیں دعوت اسلامی سے باز آجانا ہوگا۔

(اسلام میں عدل اجتماعی صفحہ ۔۲۰)

مصر میں اخوان کے ساتھ اس سارے ظلم وستم کے باوجود اخوان کی دعوت پھیلتی گئی اور احیائے اسلام کا جذبہ قوی تر ہوتا گیا۔ ارباب اقتدار بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اُنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ کہ ایک مسلمان معاشرے میں اسلام کی دعوت جب ایک موثر طریقہ پر پیش کر دی جائے تو پھر اس کے پھیلنے کا انحصار کسی مخصوص جماعت یا اُس کے کارکنوں پر نہیں رہ جاتا۔ مصر میں اسلام کی دعوت اب الاخوان المسلمون یا اُس کے رہنماؤں حسن البنا، حسن الہضیبی، عبدالقادرعودہ اور سید قطب کی سرگرمیوں کی محتاج نہیں۔ قرآن کی تلاوت جاری ہے۔ احادیث رسول ﷺ پڑھی جا رہی ہیں اور اسلام کی وہ تعلیمات عام ہیں جو سلف صالح کے ذریعے اُمت کو ملی ہیں۔اس طرح اس دعوت کی تجدید ہر مسجد اور ہر گھر میں ہو رہی ہے۔ جس کے اعلان کا شرف مصر کی حالیہ تاریخ میں اخوان کو حاصل ہوا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے نہ پا سکنے کی وجہ سے، یا سمجھ لینے کے باوجود ماننے سے انکار کر دینے کے سبب مصر میں ارباب اقتدار نے بوکھلا کر جنگل کے قانون کا سہارا لیا ہے۔
(ایضاً صفحہ ۲۲ تا ۲۳)

اخوان اس کے بعد مسلسل ابتلا و آزمائش کا شکار رہے لیکن اُن کے عزم و ہمت میں کوئی کمی نہ آئی۔ اور وہ اپنا کام کرتے رہے۔ طوالت کے خوف سے ہم تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ جب لوگوں کے اندر دعوت موثر انداز سے پیش کر دی جائے تو وہ پھر خود بخود پھیلتی ہے اور اس کا ثبوت ۱۹۶۵ کے اندوہناک واقعات کے بعد ابھی حالیہ انتخابات میں سامنے آگیا۔ اخوان نے بھاری اکثریت سے انتخابات جیتے۔اور سازشوں کے علی الرغم حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اخوان رہنما صدر مرسی کی قیادت میں انقلاب انگیز اقدامات کیے۔ لیکن امریکہ، اُس کے یورپین اتحادیوں اور مسلمان بادشاہتوں نے اس اسلامی مملکت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔اور صدر مرسی سمیت اخوان کے مرشد عالم جناب محمد بدیع اور تقریباً ۲۸ ہزار کارکنوں کو قید کر لیا۔اور طرفہ تماشا یہ کہ مسلمان بادشاہتوں سے اخوان کو دہشت پسند تنظیم کا نام دے کر خلاف قانون قرار دے ڈالا۔ اور نام نہاد عدالتیں بٹھا کر ایک دن میں یعنی ۲۴ مارچ کو ۵۲۹ کارکنوں اور رہنماؤں کو موت کی سزا سنا دی۔

مہذب دُنیا نے خاموش رہ کر اس جرم میں شرکت کا ارتکاب کیا۔ عالمی رویئے نے قاتل نظام کی حوصلہ افزائی کی۔ عدالتوں نے ۲۸ اپریل کو دوبارہ غضب الٰہی کو دعوت دیتے ہوئے اخوان کے مرشد عام سمیت

۴۰۰ مزید افراد کو پھانسی کی سزا سنائی۔ ۱۹ جون کو مجرم جج پھر گویا ہوا اور مرشد عام سمیت ۱۴ مرکزی قائدین کو سزائے موت سنا دی۔ ۲۱ جون کو مرشد عام سمیت ۱۵۰ افراد کو تیسری بار سزائے موت سنا دی۔ لیکن دُنیا یوں اندھی، بہری اور گونگی بنی ہوئی ہے کہ جیسے انسانوں کو پھانسیاں نہیں دی جا رہی ہیں۔ کیڑے مکوڑوں سے نجات حاصل کی جا رہی ہے۔

پھانسی اور عمر قید کی سزاؤں کی فہرست طویل ہے اور مزید طویل ہوتی جا رہی ہے جس طرح یہ قائدین اور کارکنان سزا سنانے والے ججوں کے فیصلے سن کر ہنستے مسکراتے اُنہیں کائنات کے حاکم اور منصف مطلق کی عدالت میں جمع کروا دیتے ہیں بہت ممکن ہے کہ کسی روز اس طرح ہنستےمسکراتے پھانسی کے پھندے چومتے دربارِ خداوندی میں بھی جا پہنچیں۔

اخوان کے لوگوں کی استقامت کے ایک دو واقعات بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اُن کے حوصلے کتنے بلند ہیں۔

مقدمات دیکھ کر لگتا ہے کہ میں ملک کا مشہور و معروف ڈاکٹر نہیں بلکہ کسی خطرناک مافیہ کا سرغنہ ہوں۔ آپ لوگوں نے میرے کلینک کو جلا کر راکھ کر دیا ۔ کالج میں زیر تعلیم میری بیٹی اسما کو قتل کر دیا۔ میرے بیٹے کو جیل بھیج دیا۔ میری اہلیہ کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ لیکن جج صاحب آپ کا خیال ہے کہ میں عدالت کے کٹہرے میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنے دفاع میں کوئی دلیل پیش کرونگا--- رب ذوالجلا ل کی قسم! میرے لیے پھانسی کے پھندے پر جھول جانا یا ان تمام الزامات سے بری ہو جانا یکساں حیثیت رکھتا ہے--- جج صاحب میں آج یہاں صرف اس لیے کھڑا ہوں کہ اُمت محمد ﷺ کی آئندہ نسلیں تک جان لیں کہ کون حق پر تھا اور اہل حق کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور کون باطل پر تھا اور اہل باطل کی صف میں کھڑا تھا۔

یہ الفاظ اخوان کے مرکزی رہنما ڈاکٹر محمد البلتاجی کے ہیں جو اُنہوں نے چند روز قبل جیل سے ایک عدالتی پنجرے میں لائے جانے پر جج کے سامنے کھڑے ہو کر کہے۔ ڈاکٹر بلتاجی کو معلوم تھا کہ یہی عدالتیں چند منٹ کی کاروائی کے بعد سینکڑوں افراد کو سزائے موت سنا رہی ہیں خود ان کے خلاف کسی بھی وقت اور کوئی بھی فیصلہ آسکتا ہے لیکن لگتا تھا کہ جج بھی سکتے میں آگیا ہو--- ہر دیکھنے اور سننے والے نے تبصرہ کیا'' لگتا ہے جج کٹہرے میں کھڑے ہیں اور ملزم اُن پر فرد جرم عائد کر رہا ہے۔

(ترجمان القرآن لاہور ،جون 2014،مصر انتخابی ڈرامہ از عبدالغفار عزیز)

خود ۸۱ سالہ مرشد عام ڈاکٹر محمد بدیع کا شمار عالم عرب کے ۱۰۰ بہترین ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ بھی طویل عرصہ جیلوں میں گزار چکے ہیں۔ اس وقت بھی اُنہیں سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود اُنہوں نے یہ اصرار کیا کہ ‘‘ہم کسی صورت تشدد کا راستہ اختیار نہیں کریں گے ٹھیک سے ہمارے ۲۸ دفاتر جلا کر اور ہزاروں کارکنان کو شہید کرکے الزام بھی ہمارے سر لگائے جا رہے ہیں۔لیکن ہم وہ اہل ایمان ہیں۔ جنہیں یقین ہے کہ اصل عدالت اللہ کی عدالت ہے اور اصل فیصلہ بھی وہیں ہونا ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ رب ذوالجلال دُنیا میں بھی یقیناً انصاف کرے گا اور آخرت میں بھی’’۔

جنرل سیسی کے مظالم، انتخابی ڈرامے اور مرشد عام کے عدالتی بیان کا مطالعہ کرتے ہوئے رسول اکرم کی یہ حدیث بھی بار بار یاد آ رہی ہے۔ کہ :

من اعان علی قتل مسلم بشطر کلمتہ لقی اللہ عز وجل مکتوب بین عینیہ ایس من رحمۃ اللہ۔

"جس نے کسی مسلمان کا قتل کرنے میں آدھی زبان سے بھی قاتل کی مددکی۔ وہ قیامت کے روز اس عالم میں رب العزت سے ملے گا کہ اُس کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) لکھا ہوگا ‘‘اپنے رب کی رحمت سے مایوس’’۔ (ایضاً)

نوٹ:

اس مضمون کی تیاری میں سید قطب شہید ‘‘اسلام میں عدلِ اجتماعی’’ ۔ترجمہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ۔ سید قطب شہید کی کتاب‘‘ معالم فی الطریق’’ کے اردو ترجمہ‘‘ جادہ و منزل’’از جناب خلیل احمد حامدی اور ترجمان القرآن لاہور کی ۱۹٦٦ ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳ اور ۲۰۱۴ کی فائلوں سے مدد لی گئی ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مولانا مودودیؒ ۱۹۰۳ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔اسے آپ بیسویں صدی کا آغاز سمجھیں۔ اس بیسویں صدی میں اسلامی فکر کی تشکیل نو اور اسلامی احیا کی جدید تحریکیں ایک زندہ حقیقت ہیں۔ان تحریکوں کے ظہور اور نشوونما کی تاریخ میں چند شخصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور ہر معروض و منصفانہ جائزے میں اُن کی حیثیت مرکزی اور کلیدی ہے۔ ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ (ترجمان القرآن لاہور مئی ۲۰۰۳ اشارات صفحہ۷)

مولانا مودودیؒ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ علم اور عمل دونوں میدانوں میں اُنہوں نے تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں۔ ایک شخص کی ذات میں فکر و تحقیق، تدبر و اصلاح اور تنظیم و قیادت کی صلاحیتوں کا جمع ہونا اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات میں سے ہے۔ معروف شاعر ابونواس کے شعر کا ترجمہ ہے۔''اللہ کی ذات سے بعید نہیں کہ وہ ایک عالم (کی ساری خوبیاں) کسی فردِ واحد میں جمع کرے''۔

(ایضاً صفحہ۸)

ہمارے دور میں سید مودودیؒ پر اللہ تعالیٰ کایہ خاص کرم تھا۔ جس کے نتیجے میں اُمت کو نئی زندگی ملی۔ اس سے پہلے کہ ہم اُن کے علمی اور فکری کام کا جائزہ لیں۔ ہم اختصار کے ساتھ یہ دیکھیں گے کہ جس وقت مولانا مودودیؒ نے آنکھ کھولی۔اُس وقت ہندوستان اور عالمِ اسلام کن حالات سے گزر رہے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد سے اٹھارویں صدی تک اسلام کا تہذیبی، تاریخی اور عالمی کردار درحقیقت ایک تاریخ ساز اور عالمی طاقت کا کردار رہا ہے۔ جس میں ایک طرف قلب کی اصلاح اور کردار کی تطہیر اور

تزکیہ ہے۔ دوسری طرف معاشرے اور تاریخ و تہذیب کی تبدیلی کا عمل۔۔۔اسلام نے ایمان، دین اور طاقت کے درمیان ایک تعلق قائم کیا۔ اس تعلق کا اظہار صرف سیاسی طاقت ہی میں نہیں بلکہ معاشرے کے سارے اداروں میں ہوا۔ چنانچہ خاندان سے لے کر ریاست تک، یعنی نظام قانون، نظام قضا اور نظام معیشت، سب کو اس کا حصہ بنایا۔

خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد مسلمانوں کو یہ مسئلہ پیش آیا۔ کہ قوت تو اسلام کے پاس موجود تھی لیکن اس کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچہ اسلام نے بنایا تھا۔ وہ متاثر ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اقتدار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون اور فقہ کی تشکیل میں بڑی محنت کی۔ فکر مودودی کی روشنی میں یہ کہنا ضروری ہے کہ فقہ کی تدوین اور نظامِ قضا پر علماء کی دسترس،ملوکیت کی انحرافی رو (Deviational wave)کے مدّ مقابل معاشرے میں ایک خود کار نظام کو فروغ دینا ایسا تاریخی کارنامہ تھا جس کے نتیجے میں معاشرے اور تہذیب و تمدن پر اسلام غالب رہا اور ریاست بھی اسلام کی گرفت میں رہی۔ سید مودودیؒ نے اس تاریخی کارنامے کو خلافت و ملوکیت میں پیش کیا ہے اور اس میں ہماری تاریخ اور تدوین فقہ کی تحریک کا ایک ایسا پہلو سامنے آیا ہے جسے مؤرخین اور مفکرین نے بالعموم نظر انداز کر دیا تھا۔

بلا شبہ بارہ سو سالہ اس دور میں اتار چڑھاؤ بھی آتے رہے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں یہ بات واضح ہو ئی کہ عالمی قیادت میں اب مسلمانوں کا کردار مضمحل بلکہ ختم ہو رہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں اُن کا یہ کردار کم ہوکر بالکل نچلی سطح کو چھونے لگا۔

اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان سیاسی اور عسکری طور پر بے وقعت ہونے کے بعد ایک قابل ذکر قوت کے طور پر عالمی سیاست کی بساط سے یکسر باہر ہوگئے۔ گویا اقتدار پر اُن کی گرفت ختم ہوگئی۔ اور عالمی قیادت میں اُن کا مقام اور وقار سرنگوں ہو گیا۔ جب ترکوں نے ۱۹۲۴ میں خلافت عثمانیہ کو ختم کردیا تو علامتی سطح پر اُن کی رہی سہی حیثیت کا خاتمہ ہوگیا۔

(ترجمان القرآن لاہور مئی ۲۰۰۳ مضمون مولانا مودودی، مفکر، مصلح،مدبر از پروفیسر خورشید احمد صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴)

جناب خلیل حامدی تذکرۂ مودودیؒمیں لکھتے ہیں۔عہد مودودی کا آغاز سقوطِ خلافت سے سے شروع ہوتا ہے۔ جس طرح فتنۂ تاتار اور زوال بغداد کے بعد ملت اسلامیہ بے شیرازہ، تشنہ میر اور نکری ژولیدگی کا شکار ہو کر رہ گئی تا آنکہ رحمت خداوندی نے جوش مارا اور

مصلحین کا ایک گروہ بروئے کار آیا جس نے ملت کے جسد بے جان میں تازہ روح پھونکی اور عثمانیوں کے روپ میں دوبارہ ملت کو عروج حاصل ہوا۔ اس طرح سقوطِ خلافت عثمانیہ کے بعد پھر ملت تار تار ہو گئی۔ علامہ اقبال نے انگشت بدندان ہو کر کہا۔

چاک کر دی ترکِ نادان نے خلافت کی قبا -- سادگی مسلم کی دیکھ اَوروں کی عیاری بھی دیکھ

مصری عالم محمود شاکر نے المقطّم اخبار میں اس واقعہ پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا شاید وہ پورے عالمِ اسلام کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں:

''خلیفہ برطرف کر دیا گیا۔ خلافت منسوخ کر دی گئی۔املاک ضبط کر لی گئیں۔اوقاف پر سرکاری قبضہ کر لیا گیا۔ دینی تعلیم ختم کر دی گئی۔ شرعی عدالتیں منسوخ کر دی گئیں۔ یہ کیا طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا ہے جس کے اثرات نے مشرق و مغرب کو اپنے لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہی خلافت تو اسلام کی بچی کھچی شوکت اور صدر اسلام کی ایک باقی ماندہ علامت رہ گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے سے ہمارے دل ٹوٹ گئے اور پوری ملت حیران و سرگرداں ہو گئی ہے۔''

خاتمۂ خلافت صرف جذباتِ غم و الم ہی لے کر نہ آیا۔ بلکہ اس کے بعد طرح طرح کے سیاسی اور فکری فتنوں نے سر اُٹھایا۔ استعماری طاقتوں نے عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں اپنے پنجے گاڑ ھ لیے۔مغرب کی ذہنی غلامی وبا کی طرح پھیل گئی اور دین سے بیزاری ترقی کی علامت بن گئی۔

(تذکرۂ مودودی، مضمون تقدیر الرجال، لا تقدیس الرجال از خلیل احمد حامدی)

ایک بڑا المیہ یہ ہوا کہ سیاسی قوت کے چھن جانے کے نتیجے میں مسلمان دوسروں کے غلام ہو گئے اور ایک دوسری تہذیب اُن پر غالب ہو گئی۔ یہ مغربی تہذیب جن بنیادوں پر استوار تھی وہ اسلامی بنیادوں کی ضدتھی۔ یہ وہ فکری اور تہذیبی ماحول تھا۔ اس میں مسلمانوں کا ۲۰۰ سال کا فکری جمود، مغرب میں نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی اور لبرل اور اشتراکی تحریکوں کا فروغ، صنعتی انقلاب، مغربی استعماری اور سرمایہ دارانہ قوتوں کا عالمی کردار پوری دُنیا بشمول مسلم دُنیا پر اُن کا تسلط تھا۔ مغربی تہذیب اور انگریزوں کی غلامی نے مسلمانوں کے اخلاقی تنزل، بےبسی و کمزوری، اپنے دین پر شکوک و شبہات میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی حیثیت ایک ریوڑ کی مانند تھی جن کو اُن کی مختلف سیاسی اور علمی قیادتیں جذباتی بنیاد پر اپنے مفادات کی خاطر ریوڑ کی طرح ہانک رہی تھیں۔

قومیت، لا دینیت، تجدّد، تفریق دین و سیاست، تاویلاتِ باطلہ اور جمود و جہود نے نظریات و افکار کی دُنیا کو ایک جنگل بناکر رکھ دیا تھا۔ یہ جاننا مشکل ہو گیا تھا۔ کہ اسلام کے وہ اصلی خدوخال کیا ہیں جو اللہ کی کتاب، رسولؐ کی سنت، خلفائےراشدین کے عمل اور آئمہ اُمت کی کدوکاوش کا مرکز و محور رہے ہیں۔دراصل مغرب کی غلامی نے فکر و نظر کو متاثر و مفلوج کر دیا تھا۔اور مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ بہت سے صاحب علم اور اہل دانش قرآن و سنت کی تعبیر کچھ اس انداز سے کرنے لگے تھے کہ گویا قرآن پاک کی آیات اور سرور عالمؐ کے ارشادات و فرمودات ان نظریات و تصورات کی تائید و تصدیق کے لیے ہیں۔جن کو مغرب کے مفکرین اور مصنفین پیش کر رہے تھے۔ اس لیے مغربی نظریات کو مسلّمہ حقائق کے طور پرتسلیم کر لیا جاتا تھا۔ اور اسلام میں مطابقت ثابت کرنے کے لیے قرآنی آیات اور حدیث نبوی کی بعید از قیاس اور دوراز کار تاویلات کی جاتی تھیں۔

(روزنامہ جسارت کراچی مولانا مودودی مضمون ''پیا میراتحاد'' از مولانا عبدالرشید صفحہ ۳۱)

یہ پُر آشوب حالات تقاضا کر رہے تھے کہ کوئی ایسی شخصیت ظہور پذیر ہو جو ملت کو از سرنو اسلام کے چشمۂ صافی سے شاد کام کرے، لادینی ظلمتوں کے اندر کتاب و سنت کی قندیل فروزاں کرے اور نوجوانوں کے اندر دین بیزاری کا قلع قمع کرکے دین کی محبت اور شفتگی کا زم زم رواں کر دے۔ براعظم ہند میں اس کام کو جس شخصیت نے جامعیت و بلند آہنگی کے ساتھ کیا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں۔ اس کام کی تشخیص کرتے وقت عالمِ اسلام کی نمایاں شخصیتوں نے اُنہیں وقت کا

ابن تیمیۂ ، غزالیٔ عصر، امام المسلمین اور المسلم الغظیم کے القاب سے نوازا۔

بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی پاکستان میں جماعت اسلامی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ میں متعدد ایسی صفات جمع تھیں جو اُن کو ذہنی قیادت کے منصب پر پہنچا سکتی تھیں۔ان کو قدرت کی طرف سے ایک سلجھا ہوا دماغ، پُرزور قلم، اور ایک طاقت ور اُسلوبِ بیاں ملا تھا۔ وہ مغرب کے جدید مکاتب فکر اور فلسفوں سے واقف تھے۔ دوسری طرف اُن کو اسلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی صلاحیت پر عقیدہ تھا۔ مغربی تہذیب و افکار کی تنقید اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و ترجمانی میں اُن کی تحریریں اعتماد اور طاقت سے پُر ہوتی تھیں۔اور اس معذرت آمیز اور مدافعانہ لہجہ اور طرز سے پاک جو اُس دور سے پہلے کے مسلمان اہل قلم اور

مصنفین کا شعار بن گیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے ابتدائی دور میں اسلامی مسائل و متکلمانہ سیاسی مباحث پر جو پُر زور مضامین اور رسائل لکھے۔اُنہوں نے ہندوستان کے اسلام پسند حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اور اُن سب لوگوں کو اُن کی ذات کی طرف متوجہ کر دیا۔ جو اسلام کے اقتدار اور غلبہ کے خواہش مند اور موجودہ صورتِ حال سے بے چین تھے''۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۲۸)

سید مودودیؒ نے سیاسی مغلوبیت، ذہنی انتشار، اخلاقی خلفشار اور تہذیبی پراگندگی کے ماحول میں ایک نئے وژن (vision)کا پیغام دیا۔ سید مودودی کی یہ پکار قرآن کی طرف رجوع کرنے اور قرآن کی صداقت پر کامل ایمان کے ساتھ پیش قدمی کرنے کی دعوت تھی۔ سید مودودی کی یہی فکر تھی۔ جس نے اُمت کی مضطرب روحوں کو روشنی کا پیغام دیا۔ دلیل اور تعین کے ساتھ دین کا اصل وژن پیش کیا یہ وہ دعوت تھی۔ جس نے اُمت کو نئے اعتماد، ولولے اور اُمید سے شاد کام کیا۔ ایک طرف اسلام کی شاہراہ عام کو صاف لفظوں میں پیش کیا۔تو دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کا راستہ دکھایا۔اسلام کو مسلم معاشرے کی ایک کارفرما قوت بنانے کی دعوت دی اور اسلام کو ایک عالمی پیغام اور زندگی کے دھارے کو بدلنے والی تحریک کے طور پر صرف روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ فکری اور عملی و تنظیمی جدوجہد کے ذریعے ایک ملک گیر اوربالاخر عالمی جدوجہد میں منظم کر دیا (ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ اشارات صفحہ ۱٦)

فکری میدان میں مولانا مودودی کے کام پر بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ بحیثیت مفسر قرآن (تفہیم القرآن۔قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، رسائل و مسائل) حدیث کے خادم (سنت کی آئینی حیثیت، تفہیم الاحادیث، تفہیمات) سیرت نگار (سرور عالمؐ، نشری تقریریں)فقیہہ (تفہیم القرآن،رسائل و مسائل) متکلم اور عصر حاضر کے اجتماعی علوم کے ناقد اور ان میدانوں میں اسلامی فکر کے شارح اور ترجمان کی حیثیت سے اُنہوں نے سینکڑوں چراغ روشن کیے ہیں۔اس کے ساتھ اُنہوں نے اپنے عہد کی فکر کو صرف متاثر ہی نہیں کیا بلکہ ایک نیا رُخ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجے میں آج دُنیا کے گوشے گوشے سے اُن کے افکار کی صدائے بازگشت سُنی جا سکتی ہے۔

مولانا مودودیؒ کے علمی اور فکری کام کے چار پہلو اہم ہیں:

۱۔ پہلا دین کا وہ تصور جسے اُنہوں نے اُجاگر کیا۔
۲۔ دوسرا وہ طرزِ فکر جس کے ذریعے اس کام کو انجام دیا گیا۔
۳۔ تیسرے تبدیلی احوال اور احیائے دین کے لیے وہ حکمت عملی جو اپنے زمانے کے حالات کی روشنی میں اُنہوں نے مرتب کی۔
۴۔ چوتھے وہ عملی جدوجہد جس کے اُصول و ضوابط اور تنظیمی ڈھانچے اور راستے جن پر عملاً اُنہوں نے اپنی جدوجہد کو مرکوز کیا۔(ایضاً صفحہ ۱۱)

ہم ان پہلوؤں پر کبھی علیحدہ علیحدہ اور کبھی مربوط طور پر روشنی ڈالیں گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان پہلوؤں کے ضمنی پہلوؤں کی طرف بھی اشارات کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ مولانا مودودی کی یہ جدوجہد مختلف ادوار میں تقسیم نہیں کی جاسکتی۔(تاہم آئندہ صفحات میں پھر بھی ہماری کوشش ہوگی کہ اس جدوجہد کو ممکن طور پرادوار میں تقسیم کر لیں تاکہ اس جدوجہد کی تفہیم میں آسانی ہو) وہ بیک وقت مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب بھی بیان فرماتے۔ مغربی الحادی اور مادی تہذیب کی یلغار کا ذکر بھی کرتے اور اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ بھی لیتے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے جمود اور غفلت اور اعتقادی گمراہیوں کی نشان دہی بھی کرتے۔ علماء کی غفلت، نااہلیت اور فروعات میں جھگڑوں اور جدید دُنیا کے مسائل سے بے رعبتی کا رونا بھی روتے اور پھر اس سب کے تدارک کے لیے علاج بھی تجویز کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ علاج دین کا صحیح تصور، اور قرآن و سنت کی طرف رجوع تھا۔ کہ جس کی بدولت یہ اُمت اپنی ذمہ داریاں دوبارہ سنبھالتی اور دُنیا کی امامت کرتی نظر آئے۔ پھر اُنہوں نے یہ کام صرف فکری طور پر انجام نہیں دیا۔ بلکہ عملی طور پر ایک تحریک اور جماعت کی بنیاد رکھی۔اور آزادی سے پہلے جس کام کو اُنہوں نے تن تنہا انجام دیا۔ آزادی کے بعد اُسے تحریک کے پلیٹ فارم سے شروع کیا۔ اور پاکستان میں عملی طور پر قراردادِ مقاصد، دستوری جدوجہد، اور علماء کا22 نکات پر اتحاد اور گمراہ فرقوں کا تعاقب کی صورت میں انجام دیا۔

مولانا مودودیؒ نےیہ سب کام شروع کرنے سے پہلے باقاعدہ طور پر رائج الوقت افکار و نظریات اور قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر خوب سوچ سمجھ کر اپنے مقصد زندگی کی بنیاد کاملاً قرآن و سنت پر رکھی اور اس میں کسی ملاوٹ اور مداہنت سے مجتنب رہے۔ مولانا مودودیؒ جولائی ۱۹۳۹ کے ترجمان القرآن میں ''تعارف مقصد'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

‘‘اگر اسلام صرف اسی مذہب کانام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا۔ وہ قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے روشناس کرایا جس کی بلندی تک دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے انقلابی اور لبرل کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا۔ جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔اس کے تجویز کردہ لائحہ عمل سے زندگی میں مجھے ویسا ہی کمال درجے کا توازن نظر آیا جیسا ایک سالمے (Atom)کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے’’۔

اس کے بعد کہتے ہیں ‘‘میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے۔ بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ اس ظلم اور طغیان کو ختم کر دیں جو دُنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان پر سے انسان کی خدائی کو مٹا دیں۔

(تحریک آزادئ ہند اور مسلمان جلد ۲ صفحہ ۲۴ تا ۲۵)

‘‘انسان پر سے انسان کی خدائی کا خاتمہ اور قرآن کی بنیاد پر ظلم اور بے انصافی سے پاک اک نئی دُنیا کی تعمیر’’--- یہ ہے وہ ہدف اور تبدیلی جس کی دعوت لے کر مولانا مودودی اُٹھے تھے۔

(معاشرے میں تبدیلی کا وژن از ثروت جمال اصمعی۔ترجمان مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۲٦٤، ۲۸۸)

سید مودودیؒ نے اپنے ابتدائی مضامین ترجمان القرآن میں ۱۹۳۰ اور بعد کے عشرے میں لکھے۔ وہ بعد میں تنقیحات نامی کتاب کی صورت میں چھپے۔ یہ مضامین بیک وقت مسلمانوں کی غلامی اور اُن کی کمزوری کے اسباب، عالمِ اسلام اور ہندوستان کی خصوصی حالت، مغربی تہذیب کا حملہ اور مسلمان عوام اور رہنماؤں کا ردِعمل اور ساتھ ہی ساتھ ان کے علاج پر مشتمل ہیں۔تنقیحات میں ‘‘ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب’’ کے تحت لکھتے ہیں۔

‘‘حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و استیلا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ اور دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری

قومیں اُس کے افکار پر ایمان لے آئیں۔اُس کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی ومعاشی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں۔ اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل و ثروت پر قابض اور اُن کے نظمِ مملکت پر حاوی ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک ذہنی مغلوبیت اور دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجیے جو اُوپر غلبہ کی دو قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔۔۔۔۔

مسلمان آج کل اس دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔۔۔۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔۔۔ اُن کے مدرسے، اُن کے دفتر۔ اُن کے بازار، اُن کی انجمنیں، اُن کے گھر حتیٰ کہ اُن کےجسم تک اپنی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں۔ کہ اُن پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ اُن کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو بہر صورت یہ مفروضہ اُن کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے۔ اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے''۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

''اس غلامی کا سبب کیا ہے۔۔۔ذہنی غلبہ و استیلا کی بنا دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دُنیا کی رہنما اور قوموں کی امام بن جاتی ہے۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اُسے مقلد و متبع بننا پڑتا ہے۔۔۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ تمام دُنیا کی قومیں اُن کی پیرو اور مقلد رہیں۔۔۔ مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے۔ جب اُنہوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا۔۔۔۔ تو گویا اُنہوں نے خود ہی دُنیا کی رہنمائی سے استعفیٰ دے دیا۔۔۔اس طرح مغربی قومیں دُنیا کی رہنما بن گئیں کیونکہ اُنہوں نے غورو فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کردیا۔ مسلمانوں کو اس طرح اُن کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا''۔
(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۴ ۔تنقیحات صفحہ۹ تا ۱۲)

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے انحطاط پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

‘‘اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالت کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانے میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا۔ اُس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے۔ اور یہاں کا ماحول خالصتاً اسلامی نہ تھا۔(جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی دور شروع ہوا تو فاتحوں میں صدر اول کے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہ رہی تھیں۔اُنہوں نے اشاعتِ اسلام کی بجائے توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں اور لوگوں سے اللہ اور رسول کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت اور باجگزاری کا مطالبہ کیا)اگرچہ ہندؤں کا مذہب بجائے خود ضعیف تھا۔۔لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سوادِاعظم پر چھایا ہوا رہا۔۔۔۔اور اس طرح مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور تہذیب میں کبھی اتنا صحیح اور پختہ اور کامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا۔ جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔۔۔ اور ایک صدی کا زمانہ نہ گزرا تھا۔ کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے۔ جس پر اُنہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔انگریزوں نے فارسی اور عربی کی بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کیا۔ شرعی عدالتیں توڑ دیں۔ اور اسلامی قانون کے نفاذ کو مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق تک محدود کر دیا۔۔۔اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کرکے اُن کے قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے۔۔۔۔اور اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں لگی۔ (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۴ تنقیحات ۲۳ تا ۲٦)

مغربی تہذیب کی الحادی بنیادوں اور اس کی مسلمانوں پر یلغار اور علماء کی غفلت کے بارے میں لکھتے ہیں:

‘‘(مغربی فلسفہ و سائنس) جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے اُس میں نہ کسی علیم و قدیرپر خدا کے خوف کی گنجائش ہے۔ نہ نبوت و وحی و الہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور نہ حیاتِ دُنیا کے اعمال پر محاسبے کا کوئی کھٹکا۔ نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد

سے بالاتر کسی مقصد اور نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے۔ جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے--- گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا تو اُسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اُس کے دوٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لیکر شرق اوسط تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلا سے مغلوب ہوئے--- خصوصیت کے ساتھ اُن مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہِ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آگئی تھیں۔ اُن کو اپنے دُنیوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چونکہ یہ تحصیل علم خالص تحصیل علم کی خاطر نہیں تھی۔اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی اُستادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ اُن کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی گئیں۔ اُن کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔اُن میں وہ ناقدانہ نظرپیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے--- اس کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے۔ جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مغربی طریق پر سوچنے اور مغربی تہذیب کے اُصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۴)

آگے ہندوسانی مسلمانوں کی حالتِ زار کے متعلق لکھتے ہیں:

''اُنیسویں صدی کے نصف دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے۔

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ اُن کو گھیرے ہوئے تھا۔
دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام عیوب کے ساتھ نہ صرف اُن کے جسم پر بلکہ اُن کے قلب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی اس دوہری کمزوری کی حالت میں جب مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو اُنہیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اور ان کی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ سرسید کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اُٹھی۔ جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا۔ پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی۔ دولت، عزت اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اُنہوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اور قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیاگیا۔ تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلّمی کے کام آئے۔ اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیے گئے۔ تاکہ اُن کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں----
اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو اُنہوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا۔ کہ اُن کی ذہنیت کا سانچہ بدلا۔ اور اُن کی طبیعت کا رُخ مذہب سے پھر گیا''۔

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۴)

آگے مغربی تہذیب اور اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے۔ اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض شخصی اعتقاد ہے۔ جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلّم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے۔ اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے اور یہاں یہ

بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں۔ وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح اسلام کے اصول و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اُصولوں سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضع قانون ہے۔رسول خدا شارخ قانون ہے۔متبع قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ۔لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومتِ عالمی ہے۔ اور مغرب کا مطمح نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رخ بین الاقوامیت (Internationalism) کی طرف ہے۔ اور مغرب کا کعبہ مقصود قومیت (Nationalism)۔معاشیات میں اسلام اکل حلال زکواۃ، صدقہ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاش ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دُنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدودِ زن و مرد،تعّدازواج، قوانین نکاح و طلاق،ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسےہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں۔ جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔

ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثرتربیت پائی۔ تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے۔ تھا۔ وہی ہوا۔ اُن میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا۔ اُس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہیں کی بلکہ اسلام ہی کو برسر غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر اُن کے مذہب اور اُن کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا۔ اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۴)

مولانا مودودی اس ساری صورتِ حال میں محسوس کرتے ہیں کہ علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ قوم کی قیادت کرتے۔ اور اُنہیں اس وقت

<u>مناسب رہنمائی دیتے لیکن علماء نے اس کا احساس نہ کیا</u>۔ وہ لکھتے ہیں:

''در حقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اُس وقت وہ بیدار ہوتے آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھتے، مغربی ممالک کا سفر کرکے اُن علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اُٹھی ہے۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی ہے۔ اور ان نئے کَل پُرزوں کو اصولِ اسلام کے تحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور اُن کی تمدنی زندگی میں اس طرح نصب کر دیتے کہ صدیوں کے جمود جو نقصان پہنچا تھا۔ اُس کی تلافی ہو جاتی---- مگر افسوس کہ علماء (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ اُن میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ اُن میں تفقہ نہ تھا، اُن میں حکمت نہ تھی، اُن میں عمل کی طاقت نہ تھی، اُن میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی علمی و عملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اُصول اخذ کرتے اور زمانے کے متغیر حالات میں اُن سے کام لیتے۔ اُن پرتو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو اُن کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانے کی قیود سے بالا تر ہوتیں۔وہ ہر معاملہ میں انسانوں سے رجوع کرتے تھے۔ جو خدا کے نبی نہ تھے کہ اُن کی بصیرت وقت اور حالات کے بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کر سکتے۔ جب کہ زمانہ بدل چکا تھا۔ اور علم و عمل کی دُنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا۔ کہ جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی مگر کسی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی۔ کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اُٹھاکر اُن تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علماء نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی۔مگر مقابلہ کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی۔ وہ اُن کے پاس نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جمود سے نہیں ہو سکتا۔ رفتارِ زمانہ کو منطق سے نہیں بدلا جا سکتا۔نئے اسلحہ کے سامنے فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں دےسکتے۔

علماء نے جن طریقوں سے اُمت کی رہنمائی کرنی چاہی اُن کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں گھِرچکی تھی وہ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اور حواس کو معطل کرکے

کب تک طوفان کے وجود سے انکار کرتی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہتی۔''

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۵)

مولانا مودودی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ مناسب رہنمائی چاہتا ہے جس کا فقدان ہے وہ لکھتے ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے''۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۴)

وہ تجویز کرتے ہیں کہ ''یہ اشکال اُس وقت تک دُور نہ ہوگا جبتک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہونگے۔ اسلام میں ایک نشاۃ جدید (Rennaissance)کی ضرورت ہے''-----

''اب اگر اسلام دوبارہ اُن کا رہنما بن سکتا ہے۔تو اس کی بس ایک ہی صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے محقق اور مفکر پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے اُن بنیادوں کو ڈھادیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اور قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظامِ فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو''۔(ایضاً)

مگر اس تمنا اور خواہش کے باوجود وہ علماء کے رویہ اور روش سے شاکی ہیں لکھتے ہیں:۔

''بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اس روش پر قائم ہے۔ جس کی وجہ سے ابتدامیں ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنٰی شخصیتوں کو چھوڑ کر علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں۔ اُن پر اظہار نفرت تو اُن سے جتنا چاہیے۔ کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانےکی زحمت وہ نہیں اُٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دئیے ہیں اُن کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔اس لیے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں----اُنہوں نے

اپنے اردگرد دو سو برس کی پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اس فضا میں سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اس کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں--- یہ دوسو برس کی خلیج اسلام اور جدید دُنیا میں کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی۔ جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دُنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا، جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت دُنیا ئے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے۔ مگر زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی، اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے مگر اسلام کے اُصول و مبادی سے ناواقف ہے۔ اسلامی تہذیب کی سپرٹ سے بیگانہ ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے ناآشنا ہے۔ صرف دل کے ایک گوشے میں ایمان کا تھوڑا بہت نور رکھتا ہے۔ باقی تمام حیثیتوں میں اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر چونکہ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے وہ اس گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے دست و بازو ہیں۔ جو گاڑی چلانے کی طاقت رکھتے ہیں اس لیے وہ ملت کی گاڑی کو لے کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا راستہ بتائے''

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۵)

یہ طویل اقتباسات دردمند سید مودودی کے احساسات ہیں۔ اُن کا دل مسلمانوں کی حالتِ زار پر رو رہاہے۔ وہ مولانا مودودی کہ جس نے جوانی کی ابتدائی منزلوں میں مولانا محمد علی جوہر کی پکار پر معرکۃ الارا کتاب ''الجهاد فی الاسلام''تحریر کی تاکہ ہندؤوں اور مغربی پروپیگنڈے کا ازالہ کر سکیں۔ اور اسلامی جہاد کی صحیح تصویر دُنیا کے سامنے رکھ دیں۔ وہی مودودیؒ اپنی درماندگی اور عاجزی کے باوجود صرف اللہ تعالیٰ کے توکل پر مسلمان اُمت کو اس صورت حال سے نکالنے کے لیے اپنے آپ کوپیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''میں اس حالت کو دیکھ رہا ہوں اور اس کا خوفناک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے۔ وہ مجھ کو حاصل نہیں،نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کرسکوں۔ لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نورِ بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے۔

اس سے کام لے کر مسلمانوں کے ان دوگروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دوں۔ اور کامیابی و ناکامی سے بے پرواہ ہو کر اپنی سے کوشش کر دیکھوں کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری دیکھ کر اپنی کوششیں خود مجھ کو ہیچ پرز معلوم ہوتی ہیں مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے ۔میرا کام کوشش کرنا ہے اور اپنی حد تک میں اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتا ہوں''۔(ترجمان القرآن۔اکتوبر ۱۹۳۵)

پھر جب یہ سوال اُٹھایا گیا۔ کہ اس کام کو آخر اس حالت میں کیسے شروع کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان دُنیاوی وسائل کے اعتبار سے اپنے حریفوں سے کہیں پیچھے ہیں۔ اس لیے کیا یہ ضروری نہیں کہ اس جدوجہد کو شروع کرنے سے پہلے مسلمان دُنیاوی اسباب سے مالامال اپنے حریفوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے خود بھی ان کے ہم پلّہ بن جائیں۔ اور اپنے آپ کو بحیثیت قوم منظم کر لیں۔ تو مولانا مودودی نے کہا ''حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں اُن میں قطعاً کوئی وزن نہیں''۔(تحریک آزادی ہند اور مسلمان جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہِ عمل کے عنوان سے ترجمان القرآن میں اس نکتے کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

دُنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت و اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی مسلمان قوم ہی موجود نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومتِ الہٰیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے-----------جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے۔اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا اُنہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی اور مقامی مشکلات کا خیال کرکے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اُٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے۔ اور نہ کبھی فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اس قلبی

شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصدِ حق ہے۔ اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دُنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۰ و تحریک آزادی ہند اور مسلمان جلد دوم صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲)

اُن کے چند ہی مضامین سے اتنے طویل اقتباسات بہرحال ہمیں وہ اہم نکات فراہم کرتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر مولانا مودودی نے اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھی یہ نکات مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:

1. مسلمانوں کی ذہنی اور سیاسی غلامی۔ اس کے اسباب
2. اُمتِ مسلمہ کی حالت، خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی حالت اور اُن سے اقتدار کا چھن جانا۔
3. مغربی تہذیب کی یلغار۔ اس کے مسلم معاشرہ اور خصوصاً نئی نسل پر تباہ کن اثرات
4. مسلمانوں کا بنیادی طور پر مذہبی لحاظ سے کمزور ہونا اور اُن میں شرک اور دیگر فاسد عقائد کی موجودگی۔
5. علماء کی بے حسی، نااہلی اور غفلت
6. اندھی تقلید، جمود، اور اجتہاد کو اپنے اوپر حرام کرنا
7. زمانے کے تغیرات اور حالات سے آنکھیں بند کرنا۔
8. نئی نسل کا انگریزی تعلیم کی طرف رجحان برائے معاشی ترقی
9. مذہبی اور سیاسی قیادتوں کا مسلمانوں کے مسائل سے صرف جذباتی وابستگی اور عملی طور پر بے فکری۔

ان نکات کی بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانامودودی نے اپنا لائحہ عمل کچھ یوں مرتب کیا۔ اور اس سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا:

1. مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ اور اس کا اسلامی تہذیب سے موازنہ
2. دین کا صحیح تصور اور اس کے غالب کرنے کی جدوجہد
3. اُمتِ مسلمہ کو اپنا فرض یاد دلانا اور اس سلسلے میں اس کی مناسب رہنمائی
4. اُمتِ مسلمہ کی کمزوریوں کا علاج قرآن و سنت کی طرف رجوع

5. اس مقصد کی خاطر دینی لٹریچر تیار کرنا اور عملی جدوجہد کیلیے ایک جماعت کی تشکیل
6. اور پھر متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی سے نجات کی فکر کرنا اور آزادی کے لیے خالصتاً دینی بنیادوں پر جدوجہد
7. اور آزادی کے بعد نئے ملک پاکستان میں بانی جماعت کو اُن کے اسلامی نظام کے وعدےیاد دلانا اور اس کے لیے دستوری جدوجہد
8. گمراہ فرقوں کا تعاقب اور اُنکی حقیقت طشت از بام کرنا
9. نئی نسل کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنا اور اس کے لیے اُن کی عملی تربیت کرنا۔

‘‘مولانا مودودی کی عظمت تاریخی لحاظ سے یہ ہے کہ اُس نے تاریخ کے دھارے پر بہنے والے انبوہ ہائے کثیر کے بالمقابل، دھارے سے لڑنے کا مسلک اختیار کیا۔ مادہ پرستی کے اس طوفانِ مغرب میں جو قیمتی عنصر دھارے کے خلاف لڑ رہا ہے یا کم سے کم قدم جمائے کھڑا ہے۔ یا کھڑا رہنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس کے درمیان مولانا مودودی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے کیونکہ وہ وقت کی ہوا کے ساتھ چلنے پر ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی راضی نہیں ہوئے بلکہ برابر ہوا کا رُخ بدلنے کیلیے کوشاں رہے۔

مولانا مودودی نے اس کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دی ہے کہ حالات کے سامنے جھک کر اپنے اُصولوں کو مسخ کرنے کے بجائے ہم اصولوں کو قائم رکھنے کے لیے حالات سے جنگ کریں۔ اسلام کو اپنی سہل طلبی کی وجہ سے تاریخ کے تابع نہ کر دیں، بلکہ تاریخ کو مجبور کر دیں۔ کہ وہ اسلام کے منشا کے مطابق ڈھلے۔ مودودی کا مشن یہ ہے کہ ہم مغربیت کے سانچے میں آرام سے نہ ڈھل جائیں بلکہ مغربیت کے مقابل میں اسلامی نظریہ، اسلامی نظام حیات، اور اسلامی تہذیب کو برپا کریں۔ یہ درحقیقت اپنی خودی کے تحفظ اور اپنی ہستی کی بازیافت کا پیغام ہے۔

(المودودی از نعیم صدیقی صفحہ ۲۰ تا ۲۲)

مولانا مودودی کی فکری اور عملی زندگی کی جدوجہد کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا دور ۱۹۲۰ سے لے کر ۱۹۲۸تک۔یہ مولانا مودودی کے فکر کا تشکیلی دور ہے۔ یہ زمانہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے بارے میں اُن کے مطالعے اور تحقیق کا زمانہ ہے۔ان کے مختصر خود نوست شذرات (Notes)کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے

میں اُن کا مطالعہ، زیادہ تر قرآنِ پاک، حدیث نبویؐ اور تاریخ کے علاوہ دور جدید کے علمی اور ادبی لٹریچر پر مشتمل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم اُمت کو تہذیبی سیاسی اور معاشی سطح پر ایک کشمکش کا سامنا تھا۔ مولانا کو اس کشمکش کا صحیح ادراک (1920-1928) میں ہوا جس کا ثبوت اُن کے وہ مضامین ہیں جو اُس زمانے میں اُنہوں نے الجمیعہ میں لکھے۔ اس علمی اور صحافتی سرمایہ کو خلیل احمد حامدی مرحوم نے چار جلدوں (آفتاب تازہ، بانگِ سحر، جلوۂ نور اور صدائے رستاخیز) میں جمع کرکے محفوظ کر دیا ہے۔
ماہ نامہ نگار اکتوبر ۱۹۲۴ میں ایک مضمون میں ہندوستان میں ہم وطنوں کی اقتصادی بدحالی کا مفصل نقشہ پیش کرتے ہوئے جب کہ اُس وقت اُن کی عمر صرف ۲۱ سال تھی، ایک سیاسی مدبر اور ماہر اقتصادیات کی سی پختہ فکر کے ساتھ خرابی کی اصلی جڑ کی نشاندہی کی (یعنی نظام حکومت کی خرابی) بعد ازاں 1939میں اُنہوں نے زیادہ واضح اور دوٹوک انداز میں یہ مشہور جملہ لکھا ''حکومت کی خرابی، تمام خرابیوں کی جڑ ہے''۔ حکومت کے کردار کے بارے میں یہ وژن سید مودودی سے پہلے ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ میں بھی نظرآتا ہے۔اسی دور میں مولانا مودودی نے محمد علی جوہر کی خواہش پر اپنی نوجوانی کے آغاز ہی پر ''الجہاد فی الاسلام'' جیسی کتاب لکھی۔یہ موضوع ماضی میں بھی بحث انگیز رہا ہے۔ اور آج بھی پوری دُنیا میں وقت کا سب سے گرم موضوع بنا ہوا ہے۔ مگر اس کی حقیقت عام طور پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہی ہے۔
''مولانا مودودی کی اس معرکۃ الارا تصنیف نے جہاد کی اصل نوعیت اور اہمیت تحقیقی طور پر واضح کر دی۔ اُنہوں نے ناقابل تردید دلائل سے یہ ثابت کر دیا۔کہ اسلامی جہاد صرف خدا کی راہ میں نیکی، حق اور صداقت کے لیے انتہائی کوشش کا نام ہے۔ یہ ہر گزکوئی جارحانہ و ظالمانہ قتل و غارت گری اور فتنہ و فساد نہیں ہے۔یہ مظلوموں کا دفاع ہے (ہاں اگر اسلامی پیغام کے راستے میں کچھ قوتیں مزاحم ہوتی ہیں۔اور لوگوں کے اختیار اور آزادیٔ انتخاب میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ تو یہ اُن رکاوٹوں اور بندشوں کو قوت سے ہٹانے کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ تاکہ انسانوں پر انسانوں کی خدائی ختم ہو اور اللہ کی بندگی میں آجائیں۔مرتب) اس جہاد کا مقصد عدل اور امن کا قیام ہے۔ یہ خفیہ تخریب کاری نہیں، تعمیر و ترقی کی اعلانیہ کوشش ہے۔ اس کی کچھ شرطیں ہیں۔ یہ افراد کی قانون شکنی نہیں، ریاست کا آئینی اقدام ہے۔ اس میں عہد شکنی کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ بین الاقوامی معاہدات

کی سخت پابندی ہے۔یہ جنگ و امن کا اسلامی قانون ہے۔ جس پر عمل کرنے کا اختیار صرف اسلامی حکومت کوہے۔ ہر حالت میں بے قصور اور پُر امن شہریوں کو اسلام جان و مال و آبرو کا تحفظ دیتا ہے۔ قیدیوں کے ساتھ انسانی برتاؤ کی تاکید کرتا ہے۔ لڑنے والے مقتولین کی لاشوں تک کی حفاظت کی ہدایت کرتا ہے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، عبادت گاہوں اور مذہبی اداروں کے کارکنوں کو ہر قسم کی ضروری سہولت کی ضمانت دیتا ہے۔ فتح کے متکبرانہ مظاہر تک سے منع کرتا ہے۔ مجاہد، دشمنوں کا بھی محافظ بن کر دیار غیر میں قدم رکھتا ہے''۔

''واقعہ یہ ہے کہ جنگ و امن کے جتنے بھی مہذب قوانین آج اُصولاً رائج ہیں وہ سب اسلامی جہاد کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلم معاشروں اور خود مسلمانوں کو اس تاریخی حقیقت کی یاد دہانی کرائی جائے۔ رہا جبر و ظلم کے خلاف اعلائے کلمۃ الحق تو یہ افضل جہاد ہر حال اور ہر مقام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے سامنے احقاقِ حق اور قیام عدل کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس شہادت حق کی بھی شرطیں وہی ہیں جو جہاد کی ہیں۔ (ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۲۵۱،۲۵۲ مضمون غیر مسلم معاشرے میں رہنمائی از پروفیسر عبدالغنی سابق وائس چانسلر بھارت)

یہ شاہکار تصنیف اُن کی علمیت، پرزور استدلال اور توازن فکر کی دلیل ہے۔ پروفیسر خورشید احمد اپنے مضمون ''مولانا مودودی، مفکر، مصلح اور مدبر'' میں لکھتے ہیں:۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ ''الجہاد فی الاسلام'' کے لیے تحقیق مولانا مودودی کی زندگی میں ایک کلیدی موڑ اور امکانات کے وسیع افق روشن کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو اُنہیں اسلام کے تصور کائنات کو بالکل واضح حقیقت کے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کا موقع ملا۔ دوسری طرف جو مغذرت خواہانہ روایت مسلمانوں کی فکر میں جڑ پکڑ چکی تھی۔اس کو اُنہوں نے بالکل ریزہ ریزہ کرکے رکھ دیا۔ اور پوری متکلمانہ شان کے ساتھ اسلام پر اعتراضات کا دفاع کیا۔اُن کا جواب دیا۔ اور اس سے بڑھ کر مثبت طور پر اسلام کی ایک جامع تصویر پیش کی۔۔۔۔۔ الجہاد فی الاسلام مولانا مودودی کی زندگی کے رُخ کو متعین کرنے والی کتاب ہے اور یہ حسبِ ذیل تین حوالوں سے ہے:۔

اوّل: اسلام کے صحیح تصور حیات و کائنات کی بازیافت

دوم: یہ نکتہ کہ یہ تصور حیات فکری طور پر حق و باطل کی ایک عالمگیر کش مکش کی طرف لے جاتا ہے۔ جس میں اسلام کا تاریخی،

بنیادی اور فطری کردار ہے۔ اس سے اسلام کا تحریکی تصور اُبھرتا ہے۔ جو بالاخر بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات کی صورت گری کا ذریعہ بنا ہے۔

سوم: یہ کہ اس تقاضائے دین کی بجا آوری اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں ایک مرحلہ پر طاقت کے استعمال کا ایک متعین کردار ہے (ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۴ صفحہ ۱۹۹)

-1928سے 1938-39کا زمانہ دوسرا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ الجہاد فی الاسلام کا پہلا مسودہ 1927 تک تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا مودودی محقق، مفکر، مصنف اور مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہ زمانہ مولانا کے فکر کے نکھار کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں اُنہوں نے مستقبل کے لیے اُمت کے سامنے ایک حکمت عملی پیش کی۔ اورپھر اُسے بروئے کار لانے کا آغاز کیا۔ ان سنگ ہائے میل اور پیش آمدہ چیلنجوں کے خدوخال مولانا مودودی کی تحریرونمیں دیکھے جا سکتے ہیں۔ابتدائی چار سال تک تو اُنہوں نے خاموشی سے مگر جم کر اور پوری یکسوئی سے مطالعہ اور تحقیق کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھا۔ کچھ کتابیں بھی لکھیں پھر 1932-33میں یکسو ہو کر وہ اپنی زندگی کے اصل مشن کے لیے جہادِ زندگانی کے وسیع میدان میں سرگرم عمل ہو گئے۔اس جہادِ زندگانی کے شروعات کا بہترین اظہار ترجمان القرآن کے پہلے سات برسوں کے ''اشارات''میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اظہار مولانا کی شخصیت، وژن اور فکر کے ارتقا اور مولانا کے مستقبل کے تاریخی کردار کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمان کی ادارت سنبھالتے ہی اُنہوں نے جو پہلی چیز لکھی۔ وہ ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' کے مضامین ہیں۔ بعد ازاں تنقیحات، سود، پردہ، اسلام اور ضبط ولادت، تفہیمات کے مباحث ہیں۔

اس دور میں اُنہوں نے تاریخ اور ثقافت سے لے کر حدیث اور فقہ کے مباحث پر بڑی عرق ریزی سے کلام کیا۔ اس زمانے میں اُنہوں نے اسلام کے انقلابی تصور کو اس کی تمام جہتوں سمیت دلیل کی قوت سے واضح کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی عصر جدید کے تصورات پر بھرپور گرفت بھی کی۔اس دور میں مولانا نے قرآن و سنت کے ابدی پیغام کی شرح و بسط کے ساتھ ترجمانی کی۔ اور یہ ترجمانی اس خوبی اور عمدگی اور اس شان سے کی کہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے بزرگوں نے ان کو ''ترجمان اسلام'' قرار دیا۔ یوں 1928 سے لے کر 1941تک یہ ساری علمی اور قلمی جدوجہد وہ تن تنہا کرتے رہےیہی وہ دور ہے جب مولانا مودودی نے الجہاد

فی الاسلام کی تصنیف کے دوران ہی عملی صحافت کا میدان چھوڑ دیا۔ وہ الجمیعہ کے ایڈیٹر تھے۔ جو جمعیت علماء اسلام کا اخبار تھا۔اس زمانے کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ ایک کش مکش سے گزر رہے تھے۔ اور بالاخر اُنہوں نے اپنے لیے غلبۂ اسلام کی جدوجہد کا راستہ اپنا لیا۔ یہی زمانہ تھا کہ اُن کے حلقۂ احباب میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ مولانا مودودی اسلامیان ہند (خصوصاً) مسلم امہ اور بالعموم پوری نوعِ انسانی کے مستقبل کے بارے میں جو تصور اور وژن (vision)رکھتے تھے اور جو تبدیلی وہ لانا چاہتے تھے۔ وہ تن تنہا بروئے کار نہیں لائی جا سکتی تھی۔ اس مطلوبہ تبدیلی کا تقاضا یہ تھا کہ ایک مربوط اور منظم اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ کے لگ بھگ اُن کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ بلاشبہ اسلام کے احیاء کے لیے فکری کام بھی ضروری ہے لیکن اس فکر کو بروئے کار لانے کے لیے کسی عملی جدوجہد اور اجتماعی تحریک کے بغیر یہ عظیم کام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ تجدید و احیائے دین اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش جیسی تصانیف ان کے اس ذہنی سفر کی عکاس ہیں جو بالاخر ایک صالح جماعت کی ضرورت پر منتج ہوا۔

یہاں ہم یہ بھی بتاتے چلیں۔ کہ جب اُنہوں نے اس دور میں الجمیعہ کی ایڈیٹری کو چھوڑا۔ تو یہ اس لحاظ سے فیصلہ کن اقدام تھا۔ کہ وہ ضمیر کی بیداری، خودداری اور حریت کو اولیت دیتے تھے۔ جمعیت علماء اسلام، مسلمان علماء کی ایک ایسی قابل قدر جماعت تھی۔ جو اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ بنیادی طور پر یہ کوئی علمی تنظیم نہیں تھی۔ بلکہ ایک عوامی تحریک تھی جس کی قیادت چند جید علماء کے پاس تھی تاہم یہی وہ زمانہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ جمعیت کی اس وقت کی قیادت کا بڑا حصہ انڈین نیشنل کانگرس کی فکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جمیعت علما کی قیادت کے بڑے حصے نے وہ راستہ اختیار کیا جس میں اسلام کی جگہ آزادی کو اولیت حاصل ہو گئی۔ یہاں اس چیلنج کو سمجھنا چاہیے۔جو اُس وقت اُمتِ مسلمہ کو درپیش تھا۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں باربار پیش آتا رہا۔ اس چیلنج کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش سے ہی ہم علامہ اقبال اور مولانا مودودی کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ صرف برصغیر کے سیاسی منظر نامے کو ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کی پوری مسلم اُمت کی فکر اور سیاست کا بہتر فہم حاصل کر سکتے ہیں۔

اس میں پہلا مسئلہ زیادہ گھمبیر تھا جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیدا ہوئی کہ مسلمان سیاسی اور عسکری طور پر بے وقعت ہونے کے بعد ایک قابل ذکر قوت کے طور پر عالمی سیاست کی بساط سے یکسر باہر ہو گئے۔ ۔۔اور جب ترکوں نے ۱۹۲۴ میں خلافت عثمانیہ کو ختم کر دیا تو علامتی سطح پر بھی اُن کی رہی سہی حیثیت کا خاتمہ ہوگیا۔ مولانا مودودی، علامہ اقبال اور اسلامی تحریکات کی فکر کا تجزیہ کریں۔ تو اندازہ ہوگا ۔ کہ اُنھوں نےاسلام کے احیا، اسلامی سوسائٹی کے قیام، اسلامی ریاست کے حصول و قیام کو اپنا ہدف قرار دیا۔ اس طرح اُنہوں نے خلافت کے اصل جوہر (essence)اور اسکے حقیقی مقصد اور ہدف کو اپنی منزل قرار دیا۔

پھر ایک بڑاالمیہ یہ ہوا۔ کہ سیاسی قوت چھن جانے کے نتیجے میں مسلمان دوسری قوموں کے غلام بن گئے۔ اور ایک دوسری تہذیب اُن پر غالب آگئی۔ اور وہ جن بنیادوں پر اُستوار تھی۔ وہ اسلامی بنیادوں کی ضد تھی۔ اس طرح ایک تہذیبی کشمکش شروع ہوگئی۔ اس کشمکش سے نکلنے کے لیے محض جذباتی ردِّ عمل کافی نہ تھا بلکہ ٹھوس فکر اور سوچے سمجھے انداز میں ایک متبادل لائحہ عمل، واضح نشانِ منزل، اور ایک منظم اور مربوط جدوجہد درکار تھی۔ ایک طبقے کے نزدیک اولین ہدف غیر ملکی استعمار سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس طبقے نے اصل ہدف سیاسی آزادی کو قرار دیا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی احیاء کے داعیوں کی سوچ یہ تھی کہ اس سیاسی جدوجہد اور آزادی سے زیادہ ضروری اُن کے فکری اور تہذیبی غلبے کے خلاف پیکار ایک لازمی مرحلہ ہے اور اگر استعمار کے اس فکری اور تہذیبی غلبے کو نظر انداز کیا گیا۔ تو سیاسی جدوجہد بالاخر غیر موثر رہے گی۔اس لیے اصل ضرورت یہ ہے کہ اُمت کو دین حق کی بنیاد پر اسلام کی بالادستی کے قیام کے لیے تیار کیا جائے۔ اور اس جدوجہد کو استعمار کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بھی بنایا جائے۔

اس سیاسی، تہذیبی اور فکری پس منظر میں برعظیم کے مسلمانوں کا خیال تھا کہ برطانیہ نے چونکہ اقتدار ہم سےلیا ہے اس لیے آزادی کے بعد بھی اقتدار ہمارا حق ہے۔ درحقیقت مسلمانوں کے دماغ میں یہی چیز تھی۔ کہ آزادی ملنے پر فطری طور پر ہم اقتدار کے وارث ہوں گے۔لیکن وہ اس جوہری فرق کو نظر انداز کر رہے تھے جو جمہوریت کے تصور پر مبنی اداروں کے قائم ہونے سے یہاں ووٹ کی قوت کے باعث متعارف ہو چکا تھا۔مسلمانوں کے برعکس ہندو اس کھیل کو بڑی کامیابی سے کھیل رہا تھا۔ اس چیز کو نظر انداز کرکے جمعیت العلماء

نے جدوجہد آزادی کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا۔ اُنہوں نے اپنی دانست میں یہی سمجھا کہ آزادی کا حصول ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ ہے۔

دوسری جانب مولانا مودودیؒ اور علامہ اقبال کی فکر یہ تھی کہ فقط مسلمانوں کی آزادی نہیں بلکہ اسلام کی آزادی اصل مسئلہ ہے اور مسلمانوں کی آزادی اگر اسلام کی آزادی کے بغیر ملتی ہے تو وہ غلامی کی دوسری شکل ہوگی۔ اس لیے اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کی آزادی دوہی طرح ممکن ہے۔ یا تو مسلمان اتنے قوی ہوں کہ پورے برعظیم کی باگ دوڑ سنبھال سکیں۔ جو بظاہر ممکن نہیں ہے۔ ورنہ پھر اُنہیں ایسا کوئی راستہ نکالنا ہو گا جس میں وہ اپنے جداگانہ تشخص کو محفوظ رکھ سکیں۔ اور آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی منشا اور اپنی ثقافت کے تحفظ کا بھی ٹھیک ٹھیک حق ادا کر سکیں۔ جس بات کو عرفِ عام میں ''دو قومی نظریہ'' کہا جاتا ہے اس کی فکری بنیاد یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دو جداگانہ نظریہ ہائے حیات کے علم بردار ہیں۔اور آزادی کا وہی مفہوم انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہے جس میں ہر نظریے اور تہذیب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملے۔ اس کے لیے سیاسی، قانونی، ثقافتی غرض ہر میدان میں ایک نئے درو بست کی ضرورت ہوگی۔

مولانا مودودی کی اس زمانے کی تحریروں میں آزادی، مسلمان اُمت اور ہندوستان کے متعلق مسائل و معاملات پر مباحث ملتے ہیں۔ مولانا کا زاویہ نگاہ اُس وقت بھی بڑا واضح تھا۔ کہ اسلام کی آزادی اور مسلمان اُمت کی آزادی اس وقت ممکن ہے۔ جب وہ اسلامی تشخص سے وابستگی کو شرطِ اول قرار دے۔ اس تشخص کی وضاحت اور کے حصول کے لیے مولانا ہر لمحے سرگرداں اور پریشان نظر آتے ہیں۔ برعظیم اُن کی توجہ کا اولین مرکز ہے۔ لیکن اس مرکز کا بیرونی حلقہ (circumference)بڑا وسیع اور دُنیا بھر کے مسلمانوں پر محیط ہے۔

دوسری طرف اس زمانے میں جمعیت علماء کانگرس کے ساتھ مل کر اُس راستے کو اختیار کر چکی تھی۔ جسے وہ ''سوراج'' کہتے تھے نتیجۃً علاقائی یا وطنی قوم پرستی اُن کی نگاہ میں گوہر مطلوب بن گیا تھا۔ بالکل یہی سوچ غیر مسلموں کی بھی تھی اور مسلمان آزادی کی اس جدوجہد میں محض ایندھن کے طور پر استعمال کیے جا رہے تھے۔ یہ وہ کش مکش تھی جس میں مولانا نے اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کیا۔ (ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۴ صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۵)

<u>نعیم صدیقی بھی یہی بات اپنی کتاب المودودی میں صفحہ ۲۹۸ تا ۳۰۰ میں لکھتے ہیں:</u>

''تحریک پاکستان کے وقت ایک اہم بحث آزادی کی چھڑی، جس کا تصور کانگرسی اور ہندو حلقوں کا یہ تھا کہ پہلے سب کو مل جُل کر انگریز سے آزادی حاصل کر لینی چاہیے۔ بعد میں آپس میں طے کرنا چاہئے کہ آزادی میں سے سب کو حصہ کس طرح مل سکتا ہے۔ مولانا مودودی نے اس تصور آزادی کی مخالفت اس نظریے کی بنا پر کی کہ مسلمان کا تصور آزادی یہ ہے ہی نہیں کہ آدمی ایک غیر اسلامی نظام کی غلامی سے نکل کر پھر کسی دوسرے غیر اسلامی نظام میں جکڑا جائے۔ یا ازسرنو ایک داخلی جنگِ آزادی لڑے۔ مسلمان کا تصور آزادی تو ہے ہی یہی کہ غیر قوم کے غیر اسلامی تسلط سے نکل کر وہ صحیح اسلامی نظام قائم کرکے اس میں زندگی گزار سکے۔ پھر اُنہوں نے مثال دے کر کہا کہ نقشۂ احوال یہ ہے کہ باہر کا جیلر اندر کے نمبرداروں کو جیلر بنانے کے لیے ان ساری زنجیروں کے سرے اس کے ہاتھ میں ہی دے رہا ہے تاکہ مسلمان جیسے پہلے جیل میں جکڑے ہوئے تھے ویسے ہی بعد میں جکڑے رہیں۔ یہ صورت آزادی ہمیں منظور نہیں ہے ۔ہمیں پہلے سے بتایا جائے کہ ہمیں اپنے دین اور اپنی تہذیب کے احیا کے لیے کیا قوت دی جائے گی۔اگر ایسا نہیں تو وطنی متحدہ قومیت میں لادین سٹیٹ کے قیام کی سکیم میں ہم حصہ دار نہیں بن سکتے۔ ہمیں تم اگر متحدہ ہندوستان میں دینی اختیارات اور تہذیبی آزادی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تو پھر زمین کا کوئی ٹکڑا کتنے ہی حصوں میں بٹے، اس پر تڑپے وہ جس کے لیے وہ معبود یا دیوتا ہو، پورے ہندوستان کے بالمقابل زمین کا ایک مربع میل ٹکڑا ہزار درجہ زیادہ قیمتی ہے جس میں خدا کا دین جاری و ساری ہو۔ اور ہم اس میں اپنی زندگی کو صحیح شکل دے سکیں۔

<u>یہ وہی دور ہے جس میں ۱۹۳۷ میں آپ کے مشہور سلسلہ مضامین ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔</u>

<u>ترجمان القرآن کا اجرا بھی اسی دور میں ۱۹۳۳ میں ہوا۔ اور مولانا نے اسے اقامتِ دین کی جدوجہد کا ذریعہ بنایا۔ اور اس ۱۹۳۰ کے عشرے کے ابتدائی عرصے میں آپ کی کتاب دینیات شائع ہوئی۔</u>

<u>اس زمانے میں یعنی ۱۹۳۶ میں سید مودودی کی علامہ اقبال سے خط و کتابت شروع ہوئی۔</u> اور اس سال اُنہوں نے جامع علی گڑھ کے استفسار پر ایک جامع تعلیمی خاکہ تیار کیا۔ <u>۱۹۳۷ میں آپ کی لاہور میں علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی اور علامہ نے آپ کو لاہور منتقل</u>

ہونے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُن کے منتقل ہوتے ہی علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔
پٹھان کوٹ میں ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ کو سید مودودی حیدرآباد دکن سے منتقل ہو گئے یہاں آپ نے سب سے پہلے ''مسئلہ قومیت'' پر معرکۃ الارا مقالہ سپرد قلم کیا۔ جس کی اشاعت سے سیاسی اور خاص طور پر دیوبندی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔
متحدہ وطنی قومیت کی بحث نزاعی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ مولانا مودودی نے اسلامی قومیت کو موضوع بناکر تفصیل سے بہت مدلل کتاب لکھی۔ اس میں قرآن و حدیث کی بحثوں کے علاوہ مغربی مثالوں اور حوالوں سے دکھایا کہ قومیں کہیں بھی وطن سے نہیں بنتی ہیں۔ کیونکہ کہیں تو ایک ہی یورپین ملک یا ریاست میں تین تین قومیں موجود ہیں اور کہیں زبردستی سے باندھی گئی ایک قوم میں داخلی کش مکش برپا ہے۔ اور کہیں ایک ہی قوم کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر الگ کیے جا رہے ہیں۔ اور آج تو ہمارے سامنے متحدہ وطنی قومیں ٹوٹ رہی ہیں۔ اور مذاہب کی بنا پر مختلف فریق الگ الگ ہو رہے ہیں۔یا اس وجہ سے شدید تصادم برپا ہیں۔ الغرض مولانا نے ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں جو الگ دین، الگ معاشرت، الگ ضابطۂ حلال و حرام، الگ تاریخ، الگ آداب و شعائر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے لیے بہترین حربہ ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' حصہ اول و دوئم نے بھی کام دیا۔
مگر مولانا مودودی نے اس سے اگلی ایک بات جب وضاحت سے کہی تو انتہائی ممنون مسلم لیگ ناراض ہو گئی۔ اُنہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ جدید اصطلاحات کی روسے تم یقیناً ایک وطن پرست قوم نہیں ہو اور نہ کسی متحدہ وطنی قومیت کا کمزور سا جزو بن کے رہ سکتے ہو بلکہ اسلام کو برپا کرنے والی ایک پارٹی ہو اور تم محض ایک قوم کا پارٹ ادا کرنے کی بجائے ایک انقلابی پارٹی کا سا پارٹ ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ تنقید کیے بغیر اتنی بڑی حقیقت بیان نہیں کی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید مودودی کا نام مخالفین پاکستان میں لکھ دیا گیا۔ حالانکہ اُنہوں نے خود برصغیر کی تقسیم کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جب کہ تقسیم کے مبحث پر مختلف آرا سامنے آ رہی تھیں۔ (یہاں تفصیل کا موقع نہیں جو حضرات تفصیلات کے خواہش مند ہوں وہ مولانا مودودی کتاب مسلمان اور سیاسی کشمکش تینوں حصے، شریف الدین پیرزادہ کی کتاب Evolution of Pakistan اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب ulema in politics سے رجوع کریں۔مؤلف)

مولانا مودودی مغفور نے مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت فاش طریقے سے اس لیے وقت پر بیان کر دی۔ کہ پاکستان بننے کے بعد وہ ذمہ داریاں اُن کے سر آنے والی تھیں جو محض ایک قوم بن کر انجام نہیں دی جا سکتیں۔ بلکہ انقلابی پارٹی کے سے طرزِ فکر اور کردار کے ساتھ ہی ادا کی جا سکتی تھیں۔
مشکل یہ ہوئی کہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اُس وقت مسلمان سیاسی قوت کی بارگاہ میں نا پسندیدہ ٹھہری
(نعیم صدیقی۔ المودودی صفحہ ۲۹۸ تا ۳۰۲)۔

<u>ترجمان کا ساتواں سال شروع ہونے پر مولانا مودودی نے اس کا جو اداریہ مارچ ۱۹۳۹ میں لکھا۔ اُس کا ایک حصہ یہ ہے</u>

''یہ تمنائیں دل میں پال رہا ہوں اور چھ برس سے اپنے جسم کی ساری طاقتیں اُنہیں حاصل کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہوں مگر بدقسمتی سے اکیلا اور نہتا ہوں۔میری طاقت محدود ہے۔ وسائل مفقود ہیں۔ اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نہیں کر سکتا۔ ساتھ دینے والوں کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں مگر وہ کم یاب ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کی اس بستی میں اپنے آپ کو اجنبی اور غریب پاتا ہوں جس جنون میں مبتلا ہوں۔اُس کا مجنون مجھے کہیں نہیں ملتا۔ برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں۔اُن کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں۔ اُن کے کان میری زبان سے بیگانہ، یہ دُنیا کوئی اور دُنیا ہے۔ جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔جوکچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اُصولوں کی بنا پر ہو رہا ہے۔ سب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر مجبور ہوں۔میں اس کے اجزاء میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں۔ <u>بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہش مند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑنا چاہتا ہوں۔ اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔اس کلی وہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا۔ ہر طرف سے جزوی باغی ہی ملتے ہیں۔جو اس بت خانے کے کسی نہ کسی بت سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بتوں کو توڑو۔ مگر میرے بت کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ایسی حالت میں ناگزیر ہے کہ جزئی باغی کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کلی باغی ہی دے سکتے ہیں۔ اور وہ کم یاب</u>

ہیں۔جبتک وہ نہ ملیں۔اپنے محدود وسائل اور اتنی محدود طاقت سے محدود پیمانہ پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں۔ وہی کرتا رہوں گا''۔
عملیت پسند مولانا مودودی میں خود اعتمادی تو بلا کی تھی۔ مگر خودپسندی کا کوئی شائبہ بھی اُن کی زندگی میں نہ تھا۔وہ نئے حالات میں، دین کی روشنی میں، نئے تجربات اور نئے راستے نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند اور پورے عالمِ اسلام کی اصلاح کا اُنہوں نے بیڑہ اُٹھایا اور عملی جدوجہد میں اپنا صحیح کردار ادا کرنے اور قیادت کا فریضہ انجام دیا۔ جتنا بڑا کارنامہ اُنہوں نے فکری حیثیت میں انجام دیا۔ اتنا ہی بڑا کارنامہ اُنہوں نے عملی سطح پر بھی انجام دیا۔اس کے لیے اُنہوں نے ایک جماعت بناکر دعوت دی۔ تو وہ لوگ بھی جو اُن کو ''ترجمان اسلام کہتے تھے۔نہ صرف پیچھے ہٹ گئے۔ بلکہ اُن کے ناقد بن گئے۔ مولانا نے نئے حالات میں اسلافی فکر کے احیاء اور تشکیل نو تک اپنی مساعی کو محدود نہ رکھا، بلکہ دُنیا کو بدلنے، مسلمانوں کو بیدار کرنے کی، اُمت کو شہدا علی الناس کا کردارادا کرنے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری نبھانے اور اقامت دین کی زمہ داری اُٹھانے کے لیے سرگرم کر دیا۔ اُن کی ذات میں منکر اور مصلح، داعی اور منتظم، قائد اور مدبر کی صلاحیتوں کا اجتماع تھایہی وہ پہلو ہے جو اُنکے کردار کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ (ترجمان القرآن۔پروفیسر خورشید احمد۔مولانا مودودی مفکر، مصلح، مدبر صفحہ ۲۱۶، ۲۱۷)
تشکیلِ جماعت سے پہلے کے مرحلہ کو خود مؤسسِ جماعت نے ۹ سال پر پھیلا ہوا بتایاہے یعنی ۱۹۳۳ سے ۱۹۴۱ تک فضا کی تیاری کے اس مرحلہ تنقید و تبلیغ میں ہر دو پہلوؤں سے جو کام ہوا اُس کی بہترین مختصر رپورٹ وہی ہے جو مولانا مودودی کی مرتب کردہ ہے۔ ملاخظہ ہو:۔
'' ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی، قدیم مشرکانہ اوررابہانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے اُن اثرات پر جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں اور اُن اثرات پر بھی جنہیں آج ہم اپنی زندگی میں لیے ہوئے ہیں۔ان ساری جا ہلیتوں پر تنقید کرکے اُن کی عقلی کمزوریوں اور اُن کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا۔ اور پورا تجزیہ کرکے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیز ہے۔اس طرح مسلمانوں کے مختلف مدارس فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہاد مطلق کے مدعیوں پر بھی۔

حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی۔ دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارے پیشِ نظر تھا وہ صرف یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کے صاحب فکر لوگوں کی اُن ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لیے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اس کی شاہ راہ کو دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

.....دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظام زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنت میں بیان ہوا ہے۔ معقول اور مدلل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں۔ اس کا نظریۂ کائنات و انسان کیا ہے۔ اس کا فلسفۂ اخلاق کیسا ہے۔ اس کی عبادات کس غرض کے لیے ہیں۔ وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ تمدن، معیشت، معاشرت، اور سیاست کے لیے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے۔ اور اس کے مزاج سے کس قسم کی نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا تھا۔ اور آج کس طرح کر سکتا ہے۔ ان تمام اُمور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جو موجودہ دور کے تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں مگر اس کام کا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا نہ تھا۔ بلکہ اول روز سے ہمارے پیش نظر یہ تھا۔ کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہوں۔ وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ اس لیے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ دلوں کو اکسانے کی بھی کوشش کرتے رہے۔ اور ایمان کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکتا۔ لہٰذا جو لوگ بھی سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں۔اُنہیں دُنیا میں کفر کی امامت کی بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار ہونا چاہئے''۔

(جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ، لائحہ عمل صفحہ ۲۳ تا ۲٦)

تشکیل جماعت کی تیاری:

مولانا فرماتے ہیں:۔ جب میں نے دیکھا کہ میری آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے تو پھر دوسرا قدم جو میری سمجھ میں آیا، یہ تھا کہ اپنی طرف سے ایک ایسی جماعت منظم کرنی چاہیے۔ جو صاحب کردار

لوگوں پر مشتمل ہو اور اُن فتنوں کا مقابلہ کر سکے جو آگے آگے نظر آرہے ہیں''۔
مزید ابتدا اپریل ۴۰ ترجمان میں لکھا:۔
''اب انسانیت کی نجات اسلام میں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس اسلام کی دعوت شائع کر دیں اور دُنیا مفتوح ہو جائے گی۔ ہر موجودہ تہذیب کی شکست و ریخت کے لیے ایک قوت اور ایک گروہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر نئی تہذیب لانے کے لیے ایک فکر اور ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس دُنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں۔ کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریے کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے''۔

اور تنقیحات میں لکھتے ہیں:۔

''یہ شریعت اُن بہادر شیروں کے لیے اُتری ہے جو ہوا کا رُخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں۔ جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کے رُخ کو بدل دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دُنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دُنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کیلیے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی آفرینش کا مقصد ہی یہی ہے کہ زندگی کے دریا کو اُس راستہ پر رواں کردے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست اور صراطِ مستقیم ہے۔
(تنقیحات، مضمون کیش مردان نہ مذہبِ گو سفندان)

سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھتے ہیں:

ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اُس قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں، اس طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت پائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ تیار ہو اور اس کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضا اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرتاً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں''۔

اسی کتاب سے ایک اور ضروری اقتباس:

''اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو۔ جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں۔ جو دُنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں۔ جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو۔ جو ہر حال میں اُس ضابطہ اور طرزِ عمل کے پابند ہوں۔جو اُن کے لیے مستقل طور پر بنا

دیا گیا ہے۔ جن کی تمام سعی و جہد کا مقصد خدا کی رضا ہو۔ جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو۔جو تنگ نظری اور تعصب سے پاک ہوں۔ جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہونے والے نہ ہوں۔ جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں۔ جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں۔ جب بستیوں کی حکومت اُن کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں۔ اور لوگ ان کی قیادت میں اپنی جان، مال، آبرو ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں۔ جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں۔ تو لوگوں کو اُن سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم، اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو''۔

یہ تھا فکری پس منظر جس کی تیاری مکمل ہونے پر اگست ۱۹۴۱میں جماعتِ اسلامی قائم ہوئی۔

یہ ۷۵ افراد پر مشتمل ایک مختصر قافلہ تھا۔ جنہوں نے مولانا مودودی کی دعوت پر لبیک کہا۔ جماعتِ اسلامی کے امتیاز پر روشنی ڈالتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

''ان تحریکوں کی نظر صرف (مقامی) مسلم قوم تک محدود رہی ہے۔ کسی نے وسعت اختیار کی تو زیادہ سے زیادہ بس اتنی کہ دُنیا کے مسلمانوں تک نظر پھیلا دی۔ مگر بہرحال یہ تحریکیں صرف اُن لوگوں تک محدود رہیں جو پہلے سے ''مسلم قوم'' میں شامل ہیں۔ اور اُن کی دلچسپیاں بھی اُنہی مسائل تک محدود ہیں۔ جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ ان کے کاموں میں کوئی چیز ایسی شامل نہیں رہی ہے۔ جو غیر مسلموں کو اپیل کرنے والی ہو۔ بلکہ بالفعل ان میں سے اکثر کی سرگرمیاں غیر مسلموں کے اسلام کی طرف آنے میں اُلٹی سدِّ راہ بن گئی ہیں۔لیکن ہمارے لیے چونکہ خود اسلام ہی تحریک ہے۔ اور اسلام کی دعوت تمام دُنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ لہٰذا ہماری نظر کسی خاص قوم، یا کسی خاص ملک کے وقتی مسائل میں اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ پوری نوعِ انسانی اور سارے کرہ زمین پر وسیع ہے۔ تمام انسانوں کے مسائل زندگی ہمارے مسائل زندگی ہیں اور اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ہم ان مسائل زندگی کا وہ حل پیش کرتے ہیں۔ جس میں سب کی فلاح اور سب کے لیے سعادت ہے''۔

(روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول صفحہ ۱۱)

جماعتِ اسلامی کا وجود دراصل ایک نظریاتی تحریک کا روپ ہے۔ بنیادی پہلو یہ ہے کہ مولانا نے جماعت کے دستور میں پہلے ہی دن سے جو بنیادی چیز رکھی ہے۔ وہ اس کا وژن (vision)ہے جس میں لا

الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تصور، اور اس کے تقاضے جماعتِ اسلامی کا محور ہیں۔ جماعت کے دستور کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ اس میں پہلی بنیادی چیز اللہ کی حاکمیت، دین کی اقامت، حکومتِ الٰہیہ کا قیام، اور زندگی کے پورے نظام کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی ہدایت پر از سر نو مرتب کرنے کا عزم اور سرگرم جدوجہد کا عہد ہے۔ اس میں دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان قابل احترام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ کے سوا کوئی معیارِ حق نہیں۔ اصل کسوٹی اور معیار اللہ تعالیٰ اور اُس کے آخری رسول ﷺ ہیں۔ باقی سب کو اس میزان پر پرکھا جائے گا۔ اور جو جتنا اس معیار سے قریب ہوگا۔ وہ اتنا ہی محترم ہوگا۔ جماعت کے قیام میں یہ اُصول بھی کارفرما رہا۔ کہ اس کی رکنیت بلا امتیاز تمام مسلمانوں کے لیے کھلی ہے۔ لیکن رکن وہ بنے گا جو شعوری طور پر اس ذمہ داری کو قبول کرے اور اس کے تقاضوں کوپورا کرنے کا عہد کرے۔

(ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳، مولانا مودودیؒ مفکر مصلح مدبر از پروفیسر خورشید احمد صفحہ ۲۱۷)

(جماعتِ اسلامی کے دستور، نصب العین وغیرہ پر بحث ہم کسی اور موقع پر اُٹھا لیتے ہیں کیونکہ یہ بحث یہاں طوالت کا باعث بنے گی)

ہاں البتہ اس سلسلے میں پروفیسر خورشید احمد کا ایک ضروری بیان درج کرنا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں: ''مولانا کے علمی کام میں سب سے بڑا کارنامہ تفہیم القرآن ہے۔تجدید و احیائے دین کے تصور میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات خود مولانا نے مجھ سے فرمائی ہے۔''جب جماعت قائم ہوئی تو اس کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اس جماعت کا تعلق قرآن سے قائم کروں۔ اور جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے اس طریقے سے بیان کروں کہ جماعت اور پوری قوم قرآن کی روشنی کے دائرے میں آجائے۔ اور وہ قرآن سے تعلق قائم کرکے اس میں شریک ہو سکے۔تاکہ جو تبدیلی میرے پیش نظر ہے اور جس کا ماخذ، جڑ، اور بنیاد قرآن ہے اُس تک رسائی حاصل کی جا سکے'' یہ وہی کام ہے جو شاہ ولی اللہ مرحوم نے اپنے دور میں کیا۔ اس طرح مولانا کی احیائی فکر کے اندر ''تفہیم القرآن'' ایک پیمانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''تفہیم'' کی شکل میں جتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کے ذریعے اس دور میں اُمت کو دی ہے اس پر اپنے خالق و مالک کا جتنا شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے۔تفہیم القرآن مولانا کے فکری کام کا سب سے مرکزی اور سدا بہار کارنامہ (Ever lasting)ہے۔ یہ مولانا کے علم الکلام کا بھی بہترین مرقع ہے۔ اس میں مولانا کی چند اوّلیات بھی ہیں جن میں

ترجمے کی جگہ ترجمانی، ہر سورت کا مقدمہ، اور پھر ترجمے میں پیراگراف بندی قابل ذکر ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۹)
تیسرا دور ۱۹۴۱ سے شروع ہوکر ۱۹۷۹ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔جب وہ رفیقِ اعلیٰ کے بلاوے پر ہم سے رخصت ہوئے۔ آگست ۱۹۴۱ میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے ساتھ ہی مولانا کی منظم اجتماعی جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے۔ البتہ اس سے پہلے ۱۹۳۸ میں علامہ محمد اقبال مرحوم کی دعوت پر حیدرآباد دکن سے دارالاسلام (پنجاب) منتقلی اور وہاں ادارہ دارالاسلام کا قیام دراصل اس بڑے کام کا ابتدائی مرحلہ (Spade work)تھا جبکہ اس کی دہلیز (threshold) اگست ۱۹۴۱ ہے۔ اس تین سالہ عرصے (1938-1941)میں وہ اُمت کی تعمیر اور اس کے اندر مطلوبہ تبدیلیوں کے لیے ایک متبادل شعور کی پرورش کرتے رہے۔ اور اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت اجتماعی جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ اُن کی زندگی کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلابی دور تھا۔ جس میں سید مودودی ؒ کا وژن بھی کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھا۔ اس وژن کے مطابق زندگی کے نقشے کو از سرنو تعمیر کرنے کی اجتماعی جدوجہد کے سارے خدوخال بھی صفحۂ قرطاس ہی پر نہیں بلکہ رنگ و بو کی اس دُنیا میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور تفصیلات کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے مجّلے (ترجمان القرآن) سے شروع ہونے والی یہ جدوجہد نہ صرف برعظیم ہی کے طول و عرض میں تہلکہ مچانے کا باعث بنی بلکہ ایک عالمگیر انقلابی تحریک کا روپ دھار گئی۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۰)
۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان قائم ہوا۔ سید مودودی پٹھان کوٹ سے لاہور منتقل ہوگئے۔ پاکستان بن گیا۔ اور تحریک چلانے والی جماعت بطور ایک فاتح جماعت کے عہدہ و جاہ اور مفاد و منفعت کا مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہونے لگی۔ تو کمیونسٹوں اور سیکولر سٹوں اور ''مسلمانی بلا اسلام'' سے آراستہ جاگیرداروں اور لیڈروں اور کرائے کے بے مقصد مصنفوں، صحافیوں اور خطیبوں کے لیے ہر طرف راستے کھل گئے کہ وہ اسلام اسلام کے شور میں ایک لادین جمہوری نظام قوم پر مسلط کر دیں۔
مگر ابھی وہ کچھ زیادہ کام نہ کر پائے تھے کہ فروری ۱۹۴۸ میں (تشکیل پاکستان کو ابھی ٦ مہینے ہی گزرے تھے)مولانا مودودیؒ کی طرف سے چار نکاتی مطالبہ اس غرض کے لیے اُٹھایا گیاکہ ریاست کی دستوری تشکیل سے پہلے اس کی ضروری بنیادیں معین کر دی جائیں۔کچھ دیر سر چکرا گئے۔ سرکار نے دفتروں سے لے کر

مسجدوں تک مورچے کھول دئیے۔مولانا مودودی کو ملتان جیل میں پہنچا دیاگیا۔ چاروناچار ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ کو ''قرارداد مقاصد ''پاس کی گئی ۔ (المودودی۔نعیم صدیقی)
واضح رہے کہ قیام پاکستان کے چند ماہ بعد ہی پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک نے اُنہیں یونیورسٹی لا کالج میں اسلامی قانون کے حوالے سے لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت پر مولانا مودودی نے ٦ جنوری ۱۹۴۸ کو اسلامی قانون کے موضوع پر ایک تفصیلی لیکچر دیا تھا جس میں اسلامی قانون کی حقیقت، اس کی روح، اس کا مقصد اور اس کے بنیادی اُصول وضاحت سے بیان کیے تھے اس کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۴۸ کو ''پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے۔'' کے موضوع پر یونیورسٹی لا کالج لاہور میں ایک اور لیکچر دیا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''اگر مولانا مودودی نے اسلامی قانون کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی لا کالج میں تقریر نہ کی ہوتی۔ اور وہ چار نکاتی پروگرام پوری قوم کے سامنے پیش نہ کیا ہوتا تو قرار داد مقاصد کبھی پاس نہ ہوتی۔ یہ مولانا کی فکر، وژن، اور جدوجہد تھی جسے قبولیت عام حاصل ہوئی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم اور چودھری غلام محمد کی کوششوں سے ''قرار دادِ مقاصد'' کا جو مسودہ پہلی دستور سازاسمبلی نے منظور کیا۔ یہ مسودہ اسمبلی میں پاس ہونے سے قبل ملتان جیل میں مولانا مودودی کو دکھایا گیا۔اور ان کی رضا مندی کے بعد ہی وہ اسمبلی کے فلور پر پیش اور پھر منظور ہوا تھا ۔
(ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۲۲۴)
یہ قرارداد نہ صرف اسلامی ریاست کے قیام کا دوٹوک اعادہ تھی بلکہ اس میں وہ تمام خطوط بھی مذکور تھے جن پر اسلامی ریاست اور معاشرے کی تشکیل کی جائے گی۔ قرار داد مقاصد کی ایک اور اہمیت مورخ اور مبصر نوٹ کریں گے۔ کہ اسلامی نظریۂ سیاست کے تحت جو اصطلاحات اور جو امتیازی زبان مولانا مودودی استعمال کر رہے تھے۔ اس کا واضح انعکاس اس میں موجود تھا۔ (المودودی۔ نعیم صدیقی) (قرار داد مقاصد پر مولانا مودودی کی وضاحتیں رسائل و مسائل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور مزید حالیہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر قرار داد مقاصد کی اہمیت اور اس کی حیثیت کے بارے میں

تفصیلات بقلم پروفیسر خورشید احمد ترجمان القرآن کے ۲۰۱۵ کی فائلوں میں ملاحظہ فرمائیں۔مؤلف)

اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو تحریک اس شکل میں شروع ہوئی۔ وہ قراردادِ مقاصد کے بعد اور زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھی۔ اور تمام مذہبی حلقے اور عوام آہستہ آہستہ اس کے زیر اثر آتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۱ ء میں ملت کے تمام مدارس فکر کے نمائندہ (۳۱) علماء نے اپنے لاینحل اختلافات کو درکنار رکھ کر اسلامی دستور (یا ریاست) کے ۲۲ اصول متفقہ طور پر طے کر دئیے۔

(المودودی۔ نعیم صدیقی)

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں کہ ''۱۹۵۱ ء میں علماء کے ۲۲ نکات کی منظوری کے تاریخی لمحات کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس وقت میں اسلامی جمعیت طلبہ میں تھا۔اس سلسلے میں علماء کی جو نشست ہو رہی تھی۔اُس میں راجہ بھائی (ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری) خرم بھائی اور میں ان بزرگوں کے خادم کی حیثیت سے شریک تھے۔جب پہلا اجلاس ہوا تو اس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ مگر کسی کے سامنے یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہم نتیجے پر کیسے پہنچ پائیں گے۔ ان دھواں دھار تقاریر کے آخر میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے تجویز دیتے ہوئے کہا''اس طرح کی تقریروں میں تو ہم کئ دن صرف کر دیں گے اور کچھ نتیجہ نہیں نکل سکے گا۔ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس اجلاس کو مؤخر کر دیتے ہیں۔ اجلاس کے شرکاء میں سے ہر شخص تحریر کر دے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد ایک کمیٹی بنا دی جائے جس کے سربراہ مولانا سید سلیمان ندوی ہوں۔ انکے سکریٹری کی حیثیت سے میں ان تجاویز کی روشنی میں ایک مسودہ تیار کر لیتا ہوں۔اور پھر اس مسودہ پر بحث کرکے کسی متفقہ لائحہ عمل کو منظور کر لیں گے'' سب نے اس تجویز کو بڑا پسند کیا۔

ہر ایک عالم دین کو سادہ کاغذ دے دئیے گئے۔ بیش تر نے لکھا۔سب سے طویل مضمون مولانا راغب احسن مرحوم نے لکھا۔ مولانا مودودی نے پنسل سے فل سکیپ کا ڈیڑھ صفحہ لکھا۔ جس میں انہوں نے منطقی ربط کے ساتھ بڑے اختصار اور جامعیت سے بھرپور نکات بنا کر دئیے۔ کہ یہ اور یہ چیزیں ہو نی چاہئیں۔چنانچہ علماء کے ۲۲ نکات کی بنیاد وہی مسودہ بنا۔ تاہم آخری مسودہ مولانا ظفر احمد انصاری نے اپنے قلم سے لکھا۔مولانا انصاری کا مسورہ کم وبیش مولانا مودودی کی تحریر ہی پر مبنی تھا۔ اس دوران مولانا سلیمان ندویؒ استراحت فرما رہے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔اُنہوں نے دو تین جگہ جزوی

ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر اجتماع بلایا گیا۔ اس اجتماع میں سب سے پہلے اس کو پورا پورا پڑھا گیا۔ پھر ایک ایک نکتے کی خواندگی ہوئی۔۔۔۔اس طرح اس شرکت سے الحمد للہِ یہ نکات متفقہ طور پر منظور ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ خاتم الانبیا کے اُمتی مولانا مودودیؒ اور مولانا انصاریؒ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔''

(ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۵)

فروری ۱۹۵۳ ء میں تحریک ختم نبوت چلی۔ حکومت نے اس تحریک کو دبانے کیلیے لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا۔مولانا مودودی کو ''قادیانی مسئلہ'' نامی پمفلٹ لکھنے پر ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ ء کواُن کے رفقا سمیت مارشل لا کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اور پھر ۱۱ مئی ۱۹۵۳ ء کو فوجی عدالت نے سید مودودی کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ جو بعد میں ملک اور بیرون ملک مظاہروں کی وجہ سے یہ سزا ۱۴ سال قید میں بدل دی گئی۔ اور بعد میں قانونی سقم کی بنا پر اُن کی رہائی ۲٦ ماہ کے بعد عمل میں آئی۔

مولانا مودودی نے اپنے اس پمفلٹ کے دیباچے میں مختصر طور پر تحریر فرمایا:۔

''اس مختصر کتابچے میں وہ تمام دلائل جمع کر دئیے گئے ہیں۔ جن کی بنا پر ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ اس کے ساتھ اُن تمام اعتراضات اور عذرات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ جو اس مطالبے کے خلاف مختلف حلقوں سے پیش کیے جاتے ہیں''۔

اور پھر پوری کتاب میں دلائل سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے بعد مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ اس ''سرطان کےپھوڑے'' کو مسلم معاشرے کے جسم سے فوراً کاٹ پھینکا جائے''۔ مولانا کے اس ضمن میں عدالت میں طویل تحریری بیانات بھی اب کتابی شکل میں ''قادیانی مسئلہ اور اس کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی پہلو'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

میاں طفیل محمد مرحوم جو مولانا مودودی کے ہمراہ گرفتار ہوئے تھے نے اپنے ایک طویل انٹرویو میں ساری روداد سنائی۔ جس کی ہم طوالت کے خوف سے تلخیص پیش کرتے ہیں:۔

''لاہور سنٹرل جیل میں ہی قائم کردہ مارشل لا کورٹ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید نقی علی صاحب اور ملک نصراللہ خان عزیز صاحب پر مقدمہ چلایا گیا۔ مارشل لا کورٹ میں مولانا مودودی نے جو بیان دیا۔ وہ اُنہوں نے مجھے ہی لکھوایا تھا (dictateکرایا تھا) اور یہی بیان عدالت میں مولانا محترم نے پیش کیا۔

۱۱مئی ۱۹۵۳ ؁ کو ہم لوگ دیوانی گھر وارڈ کے صحن میں مولانا مودودی صاحب کی اقتدا میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ باہر کا دروازہ کھٹ سے کھلا۔ اور ۱۴، ۱۵ فوجی اور جیل افسر وارڈ احاطے میں داخل ہوئے۔ ہم نے سلام پھیرنے کے بعد عرض کیا '' فرمائیے کیا حکم ہے؟۔'' ایک فوجی نے کہا'' آپ لوگ نماز سے فارغ ہو لیں''۔ چنانچہ ہم نے باقی نماز مکمل کی۔ تو اُن میں سے بڑے فوجی افسر نے جو مارشل لا کورٹ کا صدر تھا۔ اُس نے پوچھا ''مولانا مودودی صاحب کون ہیں؟ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مولانا کون ہیں۔ اس لیے کہ وہ تو عدالت میں کئی دن اُن کے سامنے پیش ہوتے رہے تھے۔ بہرحال مولانا نے عرض کیا۔'' میں ابو الاعلیٰ مودودی ہوں'' تو اُس نے کہا کہ '' آپ کو ''قادیانی مسئلہ'' تصنیف کرنے پر موت کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ گورنر جنرل سے رحم کی اپیل کر سکتے ہیں'' مولانا نے بلا توقف فرمایا '' مجھے کسی سے کوئی رحم کی اپیل نہیں کرنی ہے۔زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں پر میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی۔ اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی'' اس کے بعد اُس افسر نے کہا '' آپ نے مارشل لا کے بارے میں روزنامہ تسنیم میں جو بیان دیا ہے اُس کو سات سال قید با مشقت کی سزا دی جاتی ہے۔''۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہیڈ وارڈن اور اُس کے ساتھ کچھ دوسرے وارڈز آئے۔ اور اُنہوں نے کہا ''مولانا مودودی صاحب تیار ہو جائیں۔ وہ پھانسی گھر جائیں گے۔ اس پر مولانا مودودی نے اطمینان سے اپنا کھلا پاجامہ تنگ پاجامے سے بدلا۔جو وہ گھر سے باہر جاتے وقت پہنا کرتے تھے۔ سر پر اپنی سیاہ قراقلی ٹوپی پہنی اور چپلی اُتار کر سیاہ گرگابی جوتا پہنا اور اپنا قرآن مجید لے کر اور ہم سب سے گلے مل کر نہایت اطمینان سے پھانسی گھر روانہ ہوگئے---اس کے تھوڑی دیر کے بعد وارڈر مولانا مودودی صاحب کا جوتا، پاجامہ، قمیض اور ٹوپی لاکر ہمیں دے گئے کہ مولانا صاحب کو پھانسی گھر کے کپڑے پہنا دئیے گئے ہیں۔ ان چیزوں کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پہلی مرتبہ ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہو کیا گیا ہے----

اب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، مولانا مودودی صاحب کی قمیص، پاجامہ اور ٹوپی کبھی سینے سے لگاتے اور کبھی اپنے سر پر رکھتے، کبھی آنکھوں پر لگاتے، اور بے تحاشہ روتے ہوئے کہتے جاتے ''مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا مودودی صاحب بہت بڑے

آدمی ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ خدا کے ہاں مودودی صاحب کا اتنا بڑا مرتبہ اور مقام ہے'' ---اگلی صبح ایک وارڈر نے آکر بتایا'' مولانا مودودی صاحب تو عجیب آدمی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو یہ اندازہ ہی نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ پھانسی گھر گئے وہاں کا لباس پہنا جنگلے سے باہر پانی کے گھڑے سے وضو کیا اور عشا کی نماز پڑھی۔ اور ٹاٹ پر لیٹ کر تھوڑی دیر بعد خراٹے مارنے لگے۔ حالانکہ اُن کے آس پاس پھانسی گھر کے دوسرے قیدی چیخ و پکار میں مصروف تھے'' اس کے بعد وہ مظاہرے اور رہائی کی تفصیل بتاتے ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

(مولانا مودودیؒ از میاں طفیل محمد رسالہ ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۴ صفحہ ۳۹ تا ۴۴)

نصیر احمد تذکرہ میں اس کی تائید میں لکھتے ہیں:''مولانا کے غیر معمولی عزم و استقلال اور توکل کا یہ واقعہ اگر چہ پہلے بھی کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ مگر میں زیادہ معتبر اور ثقہ ذرائع سے یہ روایت بیان کرنے لگا ہوں۔

''کئی سال پہلے کی بات ہے میرا ایک عزیز سی۔ایم۔ایچ (C.M.H) ملتان میں بعہدہ میجر ڈاکٹر متعین تھا ایک عید کے موقع پر وہ مجھے ملے کے لیے آیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب ذکر جماعتِ اسلامی اور بانئی جماعت کا آیا۔ تو اُس نے بتایا۔ کہ میرے ایک آفیسر جو ایک طویل عرصہ جیلوں میں ڈاکٹر رہ چکے ہیں اُنہوں نے ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں نہایت حیرت و استعجاب کے ساتھ بتایا۔ کہ جس قیدی کو موت کا حکم ملتا ہے تو وہ کم از کم پہلی رات تو بہت ہی مضطرب رہتا ہے۔ اور سو بالکل نہیں سکتا۔پھانسی کا حکم پانے والے قیدی کے لیے ڈاکٹر کو حکم ہے کہ رات کو کئی بار جاکر جائزہ لے۔ چنانچہ میں نےاپنی جیل کی سروس میں پہلی رات کسی ایسے قیدی کو سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔سوائے ایک شخص کے اور وہ شخص مولانا مودودی تھے۔ اُنہیں جس شام پھانسی کی سزا سنائی گئی تو میں قانون کے مطابق رات ۱۲ بجے کے قریب اُن کو دیکھنے کے لیے گیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ خاصے فاصلے پر اُن کی گہری نیند سونے کی آواز (یعنی خراٹوں کی آواز) آرہی تھی۔

(تذکرہ صفحہ ۶۰۱، ۶۰۲)

یا اللہ! یہ عجیب شخص ہے جو پھانسی کا حکم پاکر ایسا مدہوش سویا ہے گویا اُس کے سارے فکر اور تردد دور ہو گئے۔ گویا اُسے من کی مراد مل گئی۔

وہ کیوں؟ وہ اس لیے کہ محمد کو خاتم الانبیا و المرسلین ثابت کرنے کے جرم میں پھانسی پانا سب سے بڑی خوش بختی کی علامت تھی۔ اس لیے یہ خوش بخت بندۂ خدا مدہوش ہو کر صبح تک سویا رہا۔ کہ شہادت پکی ہے۔ اور جنت کے اعلیٰ مقامات اور صحبت خاتم الانبیاوالمرسلینؐ بھی پکی ہے۔اسی لیے سید حامد عبدالرحمٰن الکاف (صنعایمن) کہتے ہیں کہ مولانا مودودی ایک چلتا پھرتا زندہ ولی اللہ تھا۔

یہ پہلا موقع نہ تھا۔ کہ مولانا مودودی نے معافی مانگنے یااپیل کرنے یا رحم کی درخواست کرنے سے ببانگِ دہل انکار کیا ہو۔ وہ ایک دبنگ شخصیت کے حامل تھے۔ ڈر اور خوف سے وہ نا آشنا تھے۔ چنانچہ جب جنگِ عظیم دوئم (ستمبر ۱۹۳۹) شروع ہوئی تب ہندوستان برطانوی استعمارکے زیرِ تسلط تھا۔ برطانیہ نے اس جنگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ تو مولانا نے ‘‘اشارات’’ (ادارتی مقالے) میں برطانیہ اور اس کی استعماری پالیسیوں اور ظالمانہ رویے کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے سخت تنقید کی۔ اس وجہ سے یہ ‘‘اشارات’’ سنسر ہو گئے۔ اور اس ماہ کا ترجمان القرآن (ستمبر ۱۹۳۹) سادہ اور غیر مطبوعہ صفحات کے ساتھ شائع ہوا۔ صرف یہ آیت کریمہ لکھی ہوئی تھی:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

(روم۔۴۱)

"خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے اُن کو اُن کے بعض اعمال ،کا شاید کہ وہ باز آ جائیں"۔

اس سنسر (censor)کی داستان اُس زمانے کے سنسر افسر نے، جو بعد میں میاں عبدالحمید ایڈیٹر پاکستان ریویو کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ یوں بیان کی ہے۔ کہ جب مولانا مودودی سے معافی----حتیٰ کہ صرف زبانی معافی---چاہنے کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے کہا:

‘‘میں نے قرآنی تعلیم، تاریخ اسلام، اور تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال کیا ہے----- رہی بات مجھے وارننگ کی تو میں اسے پرکاہ بھی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نے قرآن کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوڑا ہے اور نہ چھوڑوں گا----آپ مجھے کہتے ہیں کہ میں معافی مانگوں، یہ ناممکن ہے۔ آپ کی حکومت مجھے تختۂ دار پر لٹکا دے۔ عمر قید کر دے، میں کبھی معافی نہیں مانگوں گا۔ (قومی ڈائجسٹ، لاہور جنوری ۱۹۸۰ صفحہ ۲۲۳ بحوالہ ترجمان القرآن ۲۰۰۳

مضمون ''مولانا مودودی: شخصی عناصر ترکیبی از عبدالرحمٰن الکاف صفحہ ۹۵، ۹٦)
تحریک دستور اسلامی کے ساتھ ساتھ سوالات اُبھرتے رہے کہ مختلف شعبوں کا کام اسلامی اُصولوں کے تحت کس طرح چلے گا۔ سید نے ان سوالوں کے جواب میں اسلامی تعلیم، اسلامی قانون، اسلامی معاشرت اسلامی ریاست، پردہ، حقوقِ زوجین، مسئلہ سود، ضبط ولادت وغیرہ تمام موضوعات پر ایسا ٹھوس کام کر دیا۔ کہ آئندہ ریسرچ کرنے والے حضرات بڑی سے بڑی عمارت اُٹھا سکتے ہیں۔
چوہدری محمد اسلم سلیمی اپنی یادداشتوں کو جمع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ۱۹۵۵ سے ۱۹۵۷ تک یونیورسٹی لا کالج لاہور کے طالب علم رہے۔اور ہماری کالج سٹوڈنٹس یونین کے ایک وفد نے مولانا سے درخواست کی۔ کہ ''لا کالج کے طلبہ دو نکات پر آپ سے رہنمائی کے طالب ہیں۔ایک تو آپ اسلامی قانون کے ماخذ بیان کریں۔جن میں سنت کے ماخذ قانون ہونے کی کھل کر وضاحت کی جائے۔ کیونکہ فتنۂ انکار سنت نے سنت کی حجیت کے بارے میں بعض ذہنوں میں شکوک پیدا کر دئیے ہیں۔ دوسرے یہ سوال بعض طلبہ کے ذہن میں موجود ہے کہ کیا جدید دور میں اسلامی قوانین قابل نفاذ ہیں۔ اور پاکستان میں کیوں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔اس سوال کی بھی وضاحت مطلوب ہے۔ آپ اس سوال کا جواب دے کر طلبہ کو مطمئن فرمائیں''۔
مولانا مودودی نے لا کالج کی تقریب میں اپنے پون گھنٹے کے خطاب کو ان دو اُمور کی اچھی طرح وضاحت تک مرکوز رکھا۔ اور ''قرآن پاک کو اسلامی قانون کا سب سے پہلا اور اہم ماخذ قرار دیا۔ جو اُنہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ یہ آسمانی ہدایات اور الٰہی تعلیمات کا جدید ترین مجموعہ ہے۔ مسلمان کے لیے اصل سند اور حجت قرآن پاک ہے''۔
اسلامی قانون میں سنت کے مقام و مرتبہ کے بارے میں وضا حت فرمائی۔''اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ سنت رسولؐ ہے۔ سنت سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن مجید کی ہدایات کو سر زمین عرب پر کس طرح نافذ کیا تھا۔ کس طرح اس کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست قائم کی تھی۔ اسلامی ریاست کے مختلف شعبوں کو چلایا تھا۔ اس طرح سنت ہمارے دستوری قانون کا دوسرا اور بڑا اہم ماخذ ہے''۔
اُنہوں نے فرمایا '' افسوس ہے کہ ایک عرصے سے ایک گروہ سنت کی اہمیت کو کم کرنے اور اس کے قانونی حجت ہونے کے پہلو کا انکار کرکے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا

ہے''۔اُنہوں نے سنت کے حجت ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا'' حضور نبی کریم کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر، حاکم، اور معلم بھی ہیں جن کی پیروی و اطاعت قرآن کی رو سے تمام مسلمانوں پر لازم ہے۔ اور جن کی زندگی کو قرآن نے تمام اہل ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ حضور نبی کریم ان تمام حیثیتوں میں مامور من اللہ ہیں۔اس بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے''۔

مولانا مودودی نے بتایا ''تیسرا ماخذ خلافت راشدہ کا تعامل ہے۔ خلفائے راشدین نے جس طرح آنحضور ؐ کے مدینہ کی اسلامی ریاست کو چلایا۔ اُس کے نظائر اور روایات، یہ سب چیزیں ہمارے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی روشنی میں آج کے دور میں ایک اسلامی ریاست کو نہایت خوبی سے چلایا جا سکتا ہے''۔

چوتھے ماخذ قانون کے طور پر انہوں نے بتایا۔'' مجتہدین اُمت کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں کیے تھے۔ یہ فیصلے اسلامی دستور کی روح اور اس کے اُصولوں کو سمجھنے میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں''۔

اس تشریح کے بعد انہوں نے اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا۔ کہ چودہ صدیاں پرانا اسلامی قانون جدید زمانے کی سوسائٹی اور ریاست کی ضروریات کے لیے کس طرح کافی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی قانون کی نام نہاد سختی اور فقہی اختلافات کے بہانے کا تسلی بخش جواب بھی اُنہوں نے دیا''۔(ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ صفحہ ١٦٧، ١٦٨ فتنہ انکار حدیث کے سلسلے میں تفصیلات کے لیے مولانا کی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' ملاحظہ فرمائیں)

مولانا مودودی کی اسلامی دستور سازی کی ایسی مساعی اور جدوجہد ہی کی بنا پر ملک کے مشہور ماہر قانون جناب اے۔کے۔بروہی کو کہنا پڑا۔

''پاکستان کی تاریخ کے کسی بھی غیر جانبدار طالب علم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم نصب العین کی عکاسی کرنے والی ریاست کے قیام کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا ذمہ دار صرف ایک شخص ہے ۔اور وہ ہیں مولانا مودودیؒ''۔ (ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور جنوری ۱۹۸۰)

۱۹٦۳ میں جماعتِ اسلامی نے لاہور میں جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ اس جلسے کو ناکام بنانے کیلیے صدر پاکستان ایوب خان ایڑی

چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ بہتر ہے کہ اس وقت ایوب انتظامیہ میں ایک شخص کی گواہی پہلے سُن لی جائے۔ یہ الطاف گوہر صاحب ہیں۔
''جب جماعتِ اسلامی نے لاہور میں کنونشن منعقد کیا تو ایوب خان نے حکم دیاکہ اجتماع میں ایسے لوگوں کو بھیجا جائے۔ جو وہاں لیڈروں اور مقرروں سے بعض خاص سوالات پوچھیں۔ جب یہ ہدایات براستہ گورنر (نواب آف کالاباغ) ہوم سیکرٹری تک پہنچیں۔تو بڑی مکروہ صورت اختیار کر چکی تھیں۔ یہ کام چیف سیکرٹری کے حوالے کیا گیا۔ جس نے علاقے کے SPکو ہدایت دی کہ وہ ضروری کارروائی کرے۔ متعلقہ تھانے کے افسر انچارج نے چند غنڈوں کو اس کام پر متعین کر دیا۔ جو شراب کے نشے میں دُھت وہاں پہنچے۔ہلڑ بازی اور مار دھاڑ شروع کردی۔ گولیاں چلائی گئیں اور ایک پُر امن مندوب جان بحق ہوگیا''۔ (قومی ڈائجسٹ لاہور جنوری صفحہ ۸۴)
واقعات یوں ہوئے کہ وفاداری ثابت کرنے کے لیے SP نے یہ ٹاسک اچھا شو کر والا نامی بیڈن روڈ کے ذمہ لگایا۔ جس کا خاصا گروہ تھا۔ مگر اس کے اندر بھی ضمیر نام کی چیز ابھی زندہ تھی۔ ایک طرف پولیس کا شکنجہ اور دباؤ اور دوسری طرف بے گناہوں پر حملہ ''ایک بدمعاش'' کا زندہ ضمیر اس پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ آخر ایک تدبیر اُس کے ذہن میں آئی۔ اور وہ خاموشی سے ایڈیٹر چٹان آغا شورش کاشمیری کے پاس پہنچا۔ اور حکومتی حکم کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کی خلش سے آگاہ کیا۔ آغا صاحب نے یہ خبر مولانا مودودیؒ کو کاپہنچائی۔
مولانا مودودی نے آغا صاحب کی بات سن کر اُن سے جو فرمایا اُس کا مفہوم یہ تھا کہ ''میری خواہش اور دعوت پر پاکستان کے کونے کونے سے مردو زن موچی دروازے پہنچیں اور میں موت کے خوف سے گھر بیٹھ جاؤں۔ کیا یہ وطیرہ کسی بھی بھلے آدمی کو زیب دیتا ہے۔ <u>موت کا وقت معین ہے۔ اور اگر یہ موچی دروازے کی سٹیج پر ہی لکھی ہے تو میں اس شہادت سے فرار کیوں اختیار کروں؟ وہ اپنا کام کریں، ہم اپنا کام کریں گے''۔</u>
<u>مولانا مودودی کی اس جرأت مندانہ گفتگو سے متاثر ہو کر شورش کا شمیری نے چٹان میں ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا۔''شاید تیری قسمت میں کوئی بالاکوٹ ہے''</u>۔ چٹان کی اس اشاعت کے دو دن بعد موچی دروازے میں جلسۂ عام طے ہو چکا تھا۔
بہر حال وہ دن آگیا۔ اور سرکاری منصوبہ بندی کے مطابق ہر خیمے کی طنابیں کاٹنے کے لیے، ہر کلّے کے ساتھ چاقو لیے ایک ایک

بدمعاش بیٹھا تھا کہ جونہی بڑا بدمعاش پہلا فائر کرے۔ ڈیوٹی پر موجود ہر بدمعاش شامیانوں کی رسیاں کاٹ دے۔
چنانچہ ادھر مولانا مودودی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور ابھی دو چار منٹ تقریر کی ہی تھی کہ پروگرام کے مطابق بڑے بدمعاش نے پستول سے فائر کرکے کارروائی کے آغاز کا سگنل دیا۔ اسٹیج کی طرف فائرنگ ہوئی۔ شامیانوں کی رسیاں کٹ گئیں۔ مگر وائے حسرتا وہ بھگدڑ نہ مچی جو بدمعاشوں کے ہاتھوں مچتی دیکھ کر خفیہ والے اوپر پہچانے کےلیے اپنے اپنے طورپر انتہائی بے چین بیٹھے تھے۔
یہی لمحہ تھا جب مولانا مودودی سے برستی گولیوں میں بیٹھنے کی استدعا کی گئی۔ مولانا اپنے جانثاروں کے حصار میں تھے بیٹھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ظلم کے خلاف آج میں بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا۔ظلم کی آندھی گوجرہ سے آئے پروانے اللہ بخش کی قربانی اور مکتبے میں قرآن کریم کی بے حرمتی کے بعد تھم گئی۔(ایک تاریخ ساز لمحہ از عبدالرشید ارشد ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۱)
پروفیسر غلام اعظم مرحوم سابق امیر جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان جو خود سٹیج پر موجود تھے بتاتے ہیں۔
‘‘ایسی حالت میں مولانا مودودی کی بے باکی اور جرأت مندانہ لیڈر شپ کاجو ثبوت ملا۔ وہ حیرت انگیز تھا۔ مولانا نے اعلان کیا۔‘‘رضاکاروں کے سوا سب کے سب بیٹھ کر تقریر سنتے رہیں۔ کوئی نہ اُٹھے، نہ کوئی گھبرائے۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے رضاکاروں کو کام کرنے دیں۔ دوسرے سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہیں تو غنڈے کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔
میں مولانا کے پیچھے سٹیج ہی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا نے تقریر جاری رکھی۔ غنڈوں کی جو ٹولی ڈائس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رضا کاروں نے اُسے گھیر لیا۔ اب وہ ہتھیار بلند کرکے مولانا کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر ایک ذمہ دار نے بلند آواز میں مولانا کو بیٹھ جانے کی درخواست کی کہ گولی چل رہی ہے۔ مولانا نے پر زور لہجے میں کہا‘‘ اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا’’۔اور تقریر جاری رکھی۔ (قومی ڈائجسٹ لاہور جنوری ۱۹۸۰ صفحہ ۲٤٦)
اس اجتماع میں اس حال میں کہ رفیق سفر کی میت خون میں لت پت تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی دُعا کر رہے تھے اور ہزاروں کا مجمع اٰمین کہہ رہا تھا۔ آپ بھی ملاخظہ فرمائیں:
‘‘یا اللہ! ہم تیرے نام کی عظمت و سربلندی کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تیرے علم میں ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح، اے اللہ! جو

مصلح ہیں تو اُن کی مدد فرما اور جو مفسد ہیں اُن کے شر سے مصلحین کو بچا''۔ (مرد مومن-سید ابو الاعلیٰ مودودی از مولانا عبدالرشید عراقی-ترجمان القرآن لاہور مئی ۲۰۰۳ صفحہ ۱۵۲)
یوں اُنہوں نے مقدمہ عادِل حقیقی کے پاس درج کرادیا۔
مولانا مودودی صاحب کو ۴ مرتبہ گرفتار کیا اور جیل بھیجا گیا پہلی مرتبہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ کو گرفتار کرکے نیو سینٹرل جیل ملتان میں ۲۰ ماہ نظر بند رکھا گیا۔ دوسری مرتبہ مارشل لا کے تحت ۲۹ مارچ ۱۹۵۳ کو قادیانی مسئلہ کے سلسلے میں گرفتار کرکے سزائے موت سنا دی گئی۔ لیکن بعد میں ۲۶ ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا۔ تیسری مرتبہ جنوری ۱۹۶۴ کو جماعتِ اسلامی خلافِ قانون قرار دئیے جانے پر گرفتار ہوئے اور پھر سپریم کورٹ کے حکم پر جب جماعت اسلامی پر پابندی کو خلافِ قانون قرار دیا گیا تو اُنہیں دوسرے رفقا کے ساتھ ۹ ستمبر ۱۹۶۴ کو رہا کر دیا گیا۔ چوتھی مرتبہ مولانا مودودی صاحب ۱۹٦۷ میں اس لیے گرفتار اور نظر بند کیے گئے کہ عیدالفطر، جمعہ یا جمعرات کو پڑ رہی تھی۔ اور جنرل محمد ایوب خان کو اُن کے بعض درباریوں نے ڈرایا تھا۔ کہ عید جمعہ کے روز ہوئی تو دو خطبے ہوں گے یعنی ایک عید کا اور دوسرا جمعہ کا، اور ایک دن میں دو خطبوں کا ہونا حکومت کے لیے منحوس اور خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جنرل محمد ایوب خان نے اپنے خوشامدی علماء کے ذریعے چاند بدھ کی شام کو ہی دکھا دیا تاکہ عید جمعرات کو ہی ہو جائے۔مولانا مودودی صاحب اور تین چار اور بڑے علماء کرام نے سرکاری چاند کو ماننے سے انکار کردیا۔اس پر جنرل محمد ایوب صاحب کی حکومت نے مولانا مودودی صاحب کو گرفتار کرکے راتوں رات لاہور سے لے جاکر بنوں میں نظر بند کر دیا۔اور دو ماہ بعد اُن کو رہا کیا۔

بہادرانہ طرز عمل:

۱۹٦۹ کی بات ہے کہ ایوب خانی آمریت کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ لاہور میں ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اس موقع پر جس بہادرانہ طرز عمل کی مثال مولانا مودودی نے قائم کی۔ اس کی روداد مشہور سیاسی لیڈر ملک غلام جیلانی کے الفاظ میں ملاخظہ کیجئے جو خود جلوس کے پیش رووں میں شامل تھے۔
''ہم نے ایک جلوس ترتیب دیا۔ اس میں سب سے آگے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، میاں ممتاز دولتانہ، نوابزادہ نصراللہ خان، اور چودھری محمد علی تھے۔ میں مولانا کے ساتھ چل رہا تھا جب جلوس ہائی کورٹ کے پاس پہنچا، اُس وقت فوج بُلالی گئی۔ فوجیوں نے

پوزیشنیں سنبھا ل لیں۔ اور کہا کہ اگر ایک قدم آگے بڑھایا تو گولی چلا دیں گے۔ میں اور میرے ساتھی گھبرا گئے کہ اب کیا ہوگا۔سچ پوچھئے تو میرے دل میں تو یہ آیا کہ اب بھاگ چلیں۔مگر مولانا نے مستحکم لہجے میں کہا۔''قدم بڑھائے ہیں تو پیچھے نہیں ہٹیں گے''---- مولانا نے پوری جرأت کے ساتھ قدم بڑھایا۔ اور پھر جلوس آگے بڑھنے لگا۔ ایک آدمی بھی پیچھے نہ ہٹا۔ اس جرأت مندی کا کرشمہ تھا کہ فوجی جلوس کے قائدین کی ہیبت سے خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ اور اسمبلی چیمبر تک پہنچ گئے۔

(''افریشیا'' مجدد مودودی نمبر بحوالہ تذکرۂ مودودی صفحہ ۸۸۱)

۱۹۷۰ میں جب علاج کے بعد انگلستان سے تشریف لائے۔ تو ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کا غلغلہ بلند ہونے لگا تھا۔ آپ نے اسلامی سوشلزم اور اس طرح کے سلوگن کا بھرپور نوٹس لیا۔ اور ببانگ دہل اعلان کیا۔ کہ ہم کسی صورت میں اس ملک میں لادینیت، سیکولرزم، سوشلزم اور کمیونزم نافذ نہیں ہونے دیں گے۔ اور پھر ایک بھرپور علمی تحریک چلائی۔ اور دلائل کے ساتھ ان تمام غیر اسلامی نظریات کا ایسا رد کیا کہ اُس تحریک کو پھر سر اُٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔

دسمبر ۱۹۷۱ میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد فوجی جرنیلوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل یحیٰ خان کی جگہ پاکستان کا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر نامزد کر دیا۔ صدارت سنبھالنے کے بعد بھٹو نے پیغام بھیج کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چودھری محمد اسلم سلیمی جو مولانا مرحوم کے ساتھ اس ملاقات میں موجود تھے۔ لکھتے ہیں۔''بھٹو صاحب نے مولانا سے کہا''آپ عالمِ اسلام کے نامور عالمِ دین ہیں۔میں بچے کچھے پاکستان کی حکومت چلانے کے لیے آپ کے تعاون کا طلب گار ہوں کیونکہ ہماری پارٹی کے منشور میں یہ بات شامل ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے''۔

مولانا مودودی نے فرمایا '' بھٹو صاحب آپ نے عام انتخابات میں سوشلزم کا نعرہ بلند کیا تھا پھر معروف سوشلسٹ اور دین سے بے زار افراد آپ کی حکومت میں شامل ہیں۔ان لوگوں کی موجودگی میں ہم کس طرح تعاون کر سکتے ہیں''۔ (چند یادیں ترجمان القرآن مئی ۲۰۰۳صفحہ ۱۶۹)

۱۹۷۲ میں خرابیٔ صحت کی بنا پر آپ نے جماعت اسلامی کی امارت سے استعفی دیدیا۔ اور اسی سال آپ کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن مکمل ہوئی۔ مولانا مودودی کی دعوت کا مرکز و محور اور منشا و مقصود بھی قرآن ہی تھا۔چنانچہ یہی وہ سرچشمۂ ہدایت ہے جس کی بنیاد پر اُنہوں نے اپنی دعوت کی ابتدا کی اور وہ مینارۂ نور ہے جس

کی روشنی میں اُنہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ مولانا اس حوالے سے فرماتے ہیں۔''جب میں نے الجہاد فی الاسلام لکھنے کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے میں قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ پاک اور احادیث کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس وقت مجھے یکایک احساس ہوا۔ کہ یہ کتاب تو ایک تحریک کی قیادت کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہ محض تلاوت کرکے رہ جانے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس غرض کے لیے ہے کہ اس کو لے کر ایک تحریک دُنیا میں اُٹھے--- اس خیال کو لے کر میں برسوں سوچتا رہا۔ کہ یہ کام کس طرح کیا جائے۔ آخر کار ۱۹۴۱ میں جماعتِ اسلامی قائم کی۔ اور الحمد للہ اُس کے صرف ٦ ماہ بعد فروری ۱۹۴۲ میں تفہیم القرآن لکھنے کا کام شروع کر دیا۔

(مولانا مودودی کے انٹرویو مرتبہ ابوطارق صفحہ ۴۹۷)

اس طرح ۱۹۷۲ میں تکمیل تفہیم القرآن کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سید مودودی نے اپنی دعوت اور قرآن کریم کے درمیان اس تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا۔''جماعت اسلامی کی تحریک شروع کرنے کے ساتھ ہی میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ میں اپنے قلم اوراپنی زبان سے اللہ کے دین کو سمجھانے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگالوں۔ لیکن جب تک خود اللہ کی کتاب کے ذریعے سے اللہ کے دین کو سمجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس وقت تک دین کا فہم پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب دین ہی کو سمجھانے کے لیے اللہ نے نازل کی ہے۔اور اگر دین کو سمجھانا ہے۔ تو اس کتاب کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک لوگ اس کو نہیں سمجھیں گے۔ اس وقت تک ان کے لیے اس مقصد کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ جس کے لیے میں اور میری جماعت کام کر رہی ہے''۔

(رسالہ آئین جولائی ۱۹۷۲)

یوں تو تفہیم القرآن کی خوبیوں پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن میرے نزدیک اُن کا قرآن کا لفظی ترجمہ کے بجائے بامحاورہ اُردو ترجمہ اور اس تک عام لوگوں کی رسائی بالکل شاہ ولی اللہؒ کے قرآن کا فارسی ترجمہ کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ اثرات کے لحاظ سے اُس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

۱۹۷۳ میں UDF کے نام سے جو اپوزیشن پارٹیوں نے آخری مرحلوں میں مسورہ دستور ۱۹۷۳ کے متعلق دستور سازی کے عمل میں تعاون سے انکار کر دیا۔اس کی وجہ مسودہ دستور میں اکثریتی پارٹی کی طرف سے شامل شدہ آمرانہ اور غیر اسلامی دفعات تھیں۔ پس آگے بڑھنے کا راستہ بند ہوگیا۔ اس نازک مرحلے میں مولانا مودودی نے بحران کو حل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جس کے متعلق ملک

معراج حالد وزیراعلیٰ پنجاب کا بیان اخبارات میں بڑی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کا ایک ضروری جملہ:۔
''ایک محترم بزرگ شخصیت نے معاملے کو سلجھانے میں حصہ لے کر اسے مزید بگاڑ کی طرف جانے سے بچا لیا''۔ یہ بزرگ شخصیت مولانا مودودی کے علاوہ کوئی اور شخصیت نہ تھی بیان میں نام کی اخفا میں کئی مصلحتوں سے کام لیا گیا مگر جاننے والے جانتے تھے۔بی بی سی نے ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ کو پاکستان کے متعلق حسب ذیل خبر نشر کی۔
''عین آخری وقت پر ایک بہت ذی اثر شخصیت کی مداخلت کی وجہ سے پاکستان دستوری تعطل کے نقصانات سے بچ نکلا ہے''
چنانچہ اس وقت آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے مولانا کو اس مضمون کاتار دیا۔
''دستور سازی کے آخری مراحل میں آپ کی کوششوں نے ملک کو بچالیاہے''
اور مولانا نے اس کے جواب میں کہا کہ ''میں نے تو محض اپنی دینی و قومی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے دستور کی منظوری کے سلسلے میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ (مولانا مودودی از ثروت صولت (انگریزی) صفحہ ۸۵)
۱۵ اپریل ۱۹۷۷ کی رات انتہائی نازک صورتِ حالات میں بھٹو صاحب مولانا سے مشورہ و رہنمائی لینے آئے تھے۔ کہ اب بحران سے کیسے نکلا جا سکتا ہے؟ ملکی فضا سخت کشیدہ تھی۔ بھٹو صاحب کے سامنے اس سے پہلے مولانا مودودی کی ۱۲ اپریل ۱۹۷۷ کی تجاویز آچکی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ پہلے حکومت اپنی زیادتیوں کا رد عمل گم کرنے کے لیے ذیل کے اقدامات کرے۔
اب دفعہ ۱۴۴ اُٹھا لی جائے (۲)تمام گرفتار شدگان کو رہا کر دیا جائے (۳) ایمرجنسی اور DPRکا خاتمہ کیا جائے اور ایمرجنسی کا اعلان ہونے کے بعد جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں ان سب کو رہا کر دیا جائے۔
(۴)تمام ایسی دستوری ترامیم جو حکومت اور اپوزیشن کے اتفاق رائے سے پاس نہ ہوئی ہوں، منسوخ کر دی جائیں (۵) جو مقدمات خصوصی ٹریبونلوں کے تحت چل رہے ہیں۔ اُنہیں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں منتقل کر دیا جائے۔
مولانا نے بیان میں کہا کہ اگریہ اقدامات کر لیے جائیں تو فضا اتنی سازگار ہو سکتی ہے کہ اگر قومی اتحاد کے لیڈروں کو غیر مشروط طور پر بات چیت کے لیے بلایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ پیش کش قبول کر لیں گے۔

مولانا کا یہ بیان محض قوم کے ایک خیر خواہ بزرگ کی طرف سے اصلاح کی ایک کوشش تھا۔
مولانا نے بھٹو کو ۱۵ اپریل کی ملاقات میں یاد دلایا کہ بحران سے نکلنے کے لیے ۲ اپریل کو جو تجاویز دی تھیں۔ اگر اُن کو قبول کر لیا جاتا۔تو حل کا راستہ نکل آتا۔ مگر اب حالات دگرگوں ہو گئے ہیں۔ اب ان تجویزوں کو ماننے سے بھی کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلے گا۔
مولانا نے بھٹو صاحب کی بحث و گفتگو کے بعد اُن سے کہا کہ اب گفت و شنید کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اب حل صرف یہ رہ گیا ہے کہ آپ استعفٰی دے کر نئے انتحابات کرائیں۔
فی الواقع یہ ایک صورت تھی۔ کہ بھٹو صاحب بچ نکلتے--- مگر تقدیر اُنہیں ایک خاص سمت میں ہانکے لیے جا رہی تھی۔
(ایضاً)
۲۶ ستمبر ۱۹۷۹ قرآن کریم کا مترجم ''تفہیم القرآن'' اس دور کا عظیم مفکر اپنے رب کی طرف پلٹ گیا۔ اُس کا جسد خاکی کاٹھ کے صندوق میں بند سمندروں، صحراؤں، پہاڑوں اور بستیوں پر (امریکہ سے جہاں وہ علاج کے لیے تشریف لے گئے تھے) پرواز کرتا ہوا، ساری دُنیا کو الوداع کہتا ہوا اپنے وطن کی مٹی کی طرف لوٹ گیا ''وہ عزیز جہاں تھا'' (الطاف گوہر ''سیارہ ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۹)
مولانا مودودی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے قرآن و سنت کو تحریک اور اُمت کے لیے ہدایت اور روشنی کے منبع کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کسوٹی پر حال اور ماضی کی ہر کوشش کو پرکھنے کا درس دیا۔ اُن کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا محاکمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ تاہم سید صاحب کے طرز فکر کے بنیادی گوشوں اور پہلوؤں کو شاید مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔
۔۱۔ حق حق ہے اور اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اللہ، اُس کا رسول، اُس کی کتاب، اُس کا دین اور اُس کے وعدے سب حق ہیں۔ ان سب کو ہمیں صرف حق ہونے کی حیثیت ہی سے قبول کرنا چاہیے۔۔ ایمان حق کو حق تسلیم کرنے ہی سے عبادت ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اسے یکسوئی کے ساتھ قبول کیا جائے۔اور حق کی جدوجہد میں تن، من، دھن سے جُت جائیں۔
گویا حق کے غلبہ کی جدوجہد بھی حق ہی کا ایک حصہ ہے۔ جسے رسولؐ کے اُسوۂ کامل اور اُس کے بتائے ہوئے طریقے سے جاری و ساری رکھا جا سکتا ہے۔

۔۲۔ تاریخ انسانی میں انسان کے سامنے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں۔ ایک اللہ اور اُس کے رسولوں کا راستہ اور دوسرا انسانوں کا اپنا اختراع کردہ راستہ۔

۔۳۔ انبیا علیہم السلام کے بتائے ہوئے طریقے کا نام دین اسلام ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون کی پابند ہے۔ البتہ انسانوں کو آزادی کی نعمت سے نوازا گیا ہے اور اُن کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ بہ رضا و رغبت اللہ کے قانون (دین)کو قبول کرکے اپنی فطرت اور کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں۔۔یہ سپردگی ہی اسلام ہے۔اور اسی کے ذریعے دل کا چین اور زندگی اور کائنات میں امن و سکون میسر آ سکتا ہے۔

۔۴۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور دین اسلام نام ہے زندگی کے پورے نظام کو اللہ کی بندگی میں لانے کو۔ مراسم عبادت سے لے کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اللہ کے رنگ میں رنگا ہونا چاہیے۔:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔

(البقرہ۔۲۰۸)

"اے ایمان لانے والو ! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جائو اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔

(البقرہ۔۱۳۸)

"کہو: اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"۔

یہ ہدایت زندگی کے ہر شعبے کیلیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ دین کامل اور مکمل ہے۔ اور اس ہدایت کا معجزاتی پہلو یہ ہے کہ جہاں اس میں ہر زمانے کے لیے زندگی کی جملہ ضروریات کے لیے راہ نمائی موجود ہے۔ وہاں اس کے نظام کار میں وہ گنجائش بھی موجود ہے جو مرور زمانہ کی تبدیلیوں اور ضروریات کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

۔۵۔ یہ دین اعتدال، انصاف، توازن، اور راہ وسط کی نشاندہی کرتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُـوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ

مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ (البقرہ۔۱۴۳)

"اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک '' امتِ وسط '' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو ۔ پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے ، اُس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت ، مگر اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے ۔ اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا ، یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے"۔

یہ دین عدل و فلاح کا ضامن ہے۔ یہ وسط اس کی شان ہے۔(خیر الامور اوسطھا) جو اس کا حصہ (built-in) اور شناخت ہے۔ اور کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی۔ خود ساختہ اعتدال کے نام پر کسی تراش خراش کی اسے حاجت نہیں۔ اعتماد، رواداری، استقامت اور حکمت اس کے اپنے اصول اور شناخت کے ذرائع ہیں۔

یہ حق یہ ہدایت یہ دین، بھی آپ سے آپ نافذ نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان، عمل، اور جدوجہد کا راستہ تعلیم فرمایا ہے۔ اور انبیاء کرام نے اپنے عمل اور اپنی تحریک سے اس کے لیے نقشہ راہ (road-map)فراہم کر دیا ہے۔ جو یہ ہے:۔

۱۔اسے پورے یقین کے ساتھ قبول کرو (ایمان)

۲۔اس پر خود عمل کرو اور استقامت کے ساتھ کرو ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (الاحقاف۔۱۳)

"یقینا جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے ، پھر اُس پر جم گئے ، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

۳۔تمام انسانوں کو اس کی دعوت دو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

(حم السجدہ۔۳۳)

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کسی کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"۔

۴۔اس دین کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کرو۔ اسے پوری زندگی پر غالب اور حکمران کردو۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔
(الصف۔۹)

"وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پورے کے پورے دِین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

ایمان اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ عمل اس ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ عبادت اور اللہ کی اطاعت اور بندگی اس کا فطری مظہر اور اللہ کی رضا اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ یہ عبادت محض مراسم عبادت تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی کو اللہ کے قانون اور ہدایت کے مطابق ڈھالنے اور سنوارنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ پھر ایمان ہی کا یہ تقاضاہے کہ اس شمع کو روشن کیا جائے۔اور اس نور کو پھیلانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ ایک مسلسل، جان گسل، نہ ختم ہونے والی جدوجہد۔

اس جدوجہد کا نام جہاد ہے۔ جو نفس کے خلاف جہاد سے شروع ہو کر اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کے قیام اور اس کے دئیے ہوئے قانون حیات کے نفاذ کی ہر کوشش اور قربانی سے عبارت ہے اور یہی عبادت کی معراج ہے۔(الصف آیت ۱۱،۱۰)

دعوت اور جہاد ایک ہی جدوجہد کے مختلف رُخ ہیں۔ اس میں جبر اور دہشت گردی کا کوئی شائبہ نہیں (لا اکراہ فی الدین۔دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔البقرہ۔۲۵٦) یہ پیغام دلیل، مباحثے، اور مجادلے، دعوت، محبت، دردمندی، اور خدمت سے انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے قوت سے دبانے اور روکنے کی کوشش کی جائے تو پھر ظلم اور طغیان کا مردانہ وار مقابلہ اور جان و مال کی قربانی بھی اس جدوجہد کے اعلیٰ مراحل میں شامل ہے۔ اس دعوت اور جدوجہد کے نتیجے میں مسلمان فرد (مرد۔عورت)مسلم خاندان، مسلم معاشرہ،اسلامی ریاست و حکومت اور انصاف پر مبنی عالمی نظام وجود میں آتے ہیں۔

٦۔یہ ساری جدوجہد انفرادی ذمہ داری بھی ہے اور اجتماعی بھی، ہر مسلمان اُمتِ مسلمہ کا حصہ ہے۔ یہ اُمت ایک صاحب مشن اور صاحب شریعت اُمت ہے۔ جس کا مقصد وجود اور فرضِ منصبی ہی دین حق کی شہادت اللہ کی بندگی کی دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، قیام انصاف مظلوموں کی مدد و اعانت اور پوری انسانیت کو اُس کے

رب کی بندگی کی طرف بلانا اور بندگئی رب کے نظام کو قائم کرنا ہے۔(العمران آیت۔۱۱۰)

۷۔اس مشن (قولی اور عملی شہادت، انفرادی اور اجتماعی شہادت، اقامت دین کے لیے جو راستہ، اللہ کے رسولؐ نے طے کر دیا ہے وہ ہے:

اپنی اصلاح۔اجتماعیت کی اصلاح۔۔۔۔اخلاق و کردار اور علم و تقویٰ کی قوت کے ساتھ وسائل و ذرائع کا مؤثر ترین استعمال، قوت کے منبع کی تسخیر، بہترین صلاحیت اور استطاعت کا حصول اور طاقت کی ہر شکل کو اللہ کا مطیع اور اس کے پیغام کو پھیلانے کی خدمت کا آلۂ کار بنانا تاکہ عدل و انصاف قائم ہو سکے۔ حقدار کو حق مل سکے اور ظلم و استحصال کا خاتمہ ہو سکے۔ چنگیزیت سے انسانیت کو محفوظ رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ اور یہ بھی عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔(انفال ایت۔٦۰ اور الحدید ایت۔۲۵)

اس کے لیے بیک وقت تین چیزوں کی ضرورت ہے:۔

اولاً ایمان، اخلاقی برتری، اعلیٰ کردار اور خدا ترسی کی زندگی۔

ثانیاً فکری قوت اور قیادت

ثالثاً اجتماعی قوت۔ اخلاقی، معاشی، مادی، سیاسی، سائنسی، عسکری مقابلے کی قوت تاکہ وقت کے تقاضوں اور عصری حالات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

یہ کام اللہ سے تعلق، فکری گہرائی اور اجتماعی طاقت، تینوں کے بیک وقت حصول اور مقابلے کی طاقت کی فراہمی ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ایمان، اجتہاد اور جہاد ہی وہ ستون ہیں جن پر دین کی عمارت کی تعمیر ممکن ہے اور انہی پر اس کے استحکام کا انحصار ہے۔

آخر میں اس مضمون کو پروفیسر خورشید احمد کے ان نکات پر ختم کرتا ہوں۔ جن پر اُن کے نزدیک مولانا مودودیؒ نے اُمتِ مسلمہ کو جمع کرنے اور بیسویں صدی کی اسلامی جدوجہد کو اُن کے مطابق مرتب کرنے کی سعی کی۔

- **خود شناسی:** یعنی مغرب کی اندھی تقلید اور غیروں کے غلبے کے نتیجے میں خود فراموشی کے رویے کو ترک کرکے اپنی حقیقت، اپنی اصل، اپنی شناخت کی بازیافت کرنا۔
- **خود اعتمادی:** خود شناسی کے نتیجے میں ایک خود اعتمادی پیدا کی جس کا یہ اثرہوا کہ وہ اپنے ورثے پر فخر

کرنے لگے اور اُن میں اپنی راہ خود نکالنے یعنی خود انحصاری کا داعیہ پیدا ہوا۔

- **خود احتسابی:** خود اعتمادی اور خود انحصاری کے ساتھ خود احتسابی، تاکہ اپنی کمزوریوں کا تعین کیا جا سکے اور ان کمزوریوں کو دور کرکے اپنے مشن اور مقام کے حصول کے لیے تیاری کی جا سکے۔
- **زمانہ شناسی:** خود شناسی، خود اعتمادی، خود انحصاری، خود احتسابی کے ساتھ ضروری تھا کہ اپنے دور کے تقاضوں اور اپنے زمانے کے مسائل و معاملات اور مدمقابل کی قوتوں کے عزائم، وسائل اور اُن کی قوت کے سرچشموں کا ادراک ہو۔ تاکہ دانش مندی سے اُن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس کے لیے زمانہ شناسی ضروری ہے۔ کہ مستقبل کی کوئی بھی تعمیر ان حالات اور ظروف سے بے نیاز ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ جن سے اُمت دو چار ہے۔ حقیقت پسندی کا راستہ حالات کی صحیح آگہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔
- **خود سازی:** ان چاروں امور کا لازمی تقاضا خود سازی ہے کہ تیاری کے بغیر مقابلہ حماقت اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔اس لیے سید مودودی نے قوم کو جذبائیت اور فوری ردعمل کے بجائے اپنی قوت کے سرچشموں کی بنیاد پر مناسب اور مؤثر تیاری کی دعوت دی۔ اُنہوں نے بتایا کہ یہ تیاری ہمہ پہلو ہونی چاہئے۔ایمان و اعتقاد، فکر و عمل، انفرادی اور اجتماعی زندگی، اخلاقی اور مادی قوت، سیاسی، معاشی، عسکری، فنی، تکنیکی میدانوں میں مقابلے کی قوت اور تنظیم کا حصول بنیادی تقاضے ہیں۔ اس طرح اُنہوں نے اصلاح اور تعمیر کا ایک واضح اور دور رس پروگرام مرتب کیا۔ وہ اس پروگرام پر خود بھی سرگرم عمل ہو گئے اور اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو بھی مصروفِ کار کیا۔
- **زمانہ سازی:** واضح رہے کہ یہ سب کچھ ایک واضح ہدف کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ تاکہ دین کو ایک بار پھر غالب قوت بنایا جا سکے۔اُمت ایک بار پھر اپنے اصل مشن کی علمبردار بن کر اُٹھے۔ اپنے گھر کی اصلاح کرے اور پھر انسانیت تک اس آب حیات کو پہنچانے کا کارنامہ انجام دے۔ جس میں سب انسانوں کی فلاح ہے گویا زمانہ سازی اُس کی جدوجہد کا اصل ہدف ہو۔ (ترجمان القرآن لاہور مئی ۲۰۰۳)

میں نے کوشش کی ہے کہ مولانا مودودی کی جدوجہد کے تمام ضروری نکات پیش کردوں۔ تاہم اس سعی میں میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ ان کی خدمات اور کارنامے اتنے زیادہ ہیں۔ کہ مجھ جیسا کم علم اُس کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔ اس لیے کافی خدمات اور کارہائے نمایاں (مثلاً اُنکی فکر کے دُنیا پر اثرات، نوجوان نسل کی بھرپور رہنمائی، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کی داستان، مسلمانوں کے اندر اُنکی فکری تناقضات، دینی اصطلاحات کو جمود سے نکال کر اُن سے عوام کو روشناس کرانا وغیرہ) کی طرف اشارہ بھی نہ کر سکا۔اور دوسرے یہ کہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔
آج بھی معرکۂ حق و باطل برپا ہے اہل ایمان، اہل باطل اور اسلام مخالف قوتوں کے تمام تر جبر، ظلم و ستم، سفاکیت اور سازشوں کے، اسلام کے غلبے کی جدوجہد کو منظم انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس راہ میں جان و مال کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی منتظر ہے۔ شہدا کی یہ ایسی فصل ہے جو ایک طرف شہادت حق کے علمبرداروں کی ہے جو حق کی گواہی دے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اپنی جان راہ خدا میں لٹاکر شہادت کی منزل پانے والوں کی ہے۔ تمام تر سفاکیت کے باوجود یہ فصل کٹنے میں نہیں آرہی، بلکہ عزیمت و استقامت کی ایک ایسی داستان ہے۔جو اہل ایمان اپنے خون سے رقم کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دشمن کی سازشوں سے بچتے ہوئے اور پائے استقامت میں لغزش لائے بغیر اس جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔ اللہ کی راہ میں جہاد، آزمائش، صبر و ثبات اللہ کے لیے یکسوئی و اخلاص اور اللہ کے سوا ہر شے اور ہر شخصیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنا ہی حقیقت کا راستہ اور نصرت الٰہی کے قانون اور اللہ کے وعدے کی تکمیل کا ذریعہ ہے ۔
(ترجمان القرآن لاہور جولائی ۲۰۱۵ مضمون عزوہ بدر اور نصرت الٰہی کا قانون مرتب امجد عباسی صفحہ ٦٢)

ضمیمہ نمبر۱

شریعت کی طرف سے عطا کردہ آسانیاں، رخصتیں، تخفیفیں اور سہولتیں دو طرح کی ہیں:

۱۔ وہ رخصتیں جو محض آسانی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔
۲ وہ رخصتیں جو بعض وقتی عوارض کی بنا پر دی جاتی ہیں۔

محض آسانی کے لیے دی جانے والی شرعی رخصتیں مثلاً:

1. قرض، اجارہ (اجرت پر دینا) اور اعارہ (ادھار دینا) تاکہ لوگ دوسروں کی مملوکہ اشیاء سے اپنی سہولت و آسانی کے لیے استفادہ کر سکیں۔
2. وکالت، ودیعت (امانت)، شرکت، مضاربت (مال بغرض تجارت دینا)، مساقات (آبپاشی) اور مزارعت (بٹائی پر زمین دینا) وغیرہ تاکہ اگر انسان خود کوئی کام نہ کرسکے تو اپنے معامالات نمٹانے کے لیے دوسروں کی مدد حاصل کر سکے۔
3. حوالہ (ایک کا مطالبہ دوسرے پر ڈالنا) تاکہ دائن (قرض خواہ) اپنے مدیون (مقروض) سے اپنا قرض آسانی کے ساتھ کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل کرسکے۔
4. رہن (گروی رکھنا) تاکہ دائن اپنے حق کی وصولی میں مطمئن رہے۔
5. ابراء یعنی مقروض کی تنگ دستی کی وجہ سے پورا قرض یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دینا تاکہ اسے سہولت ملے، وغیرہ وغیرہ۔

عوارض کی بنا پر شرعی رخصتیں:

ان عوارض کے اسباب کبھی سماوی ہوتے ہیں اور کبھی اکتسابی یعنی خود طاری کردہ۔

چند اہم سماوی عوارض اور ان کی شرعی رخصتیں

بچپن: وہ تمام امور جو ایک نابالغ سے ساقط ہونے کا احتمال رکھتے ہوں، بچے سے ساقط ہوں گے۔ مثلاً بچہ سے نماز اور روزہ وغیرہ ساقط ہو جاتے ہیں۔ البتہ ایمان بچے سے ساقط نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ بچہ جو فرائض ادا کرے وہ اس کے حق میں نوافل کے درجہ میں ہوتے ہیں۔

دیوانگی: اس سے تمام عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔

بھول: یہ حقوق اللہ میں اس لحاظ سے معاف ہے کہ بھول جانے والا گناہ گار نہیں ہوتا۔ لیکن حقوق العباد میں بھول چوک معاف نہیں ہے۔ حقوق اگر بھول چوک سے ضائع بھی ہو جائیں تو ان کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔

نیند: انسان نیند کی حالت میں قدرتِ عمل سے عاجز ہوتا ہے اس لیے وہ کسی شرعی حکم کا پابند نہیں ہے۔ البتہ اس حکم کا وجوب قائم رہتا ہے۔

بے ہوشی: اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر یہ حالت طویل ہو جائے تو بعض فرائض کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے، جیسے ایک دن اور ایک رات سے زائد عرصہ بے ہوش رہنے سے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔

مرض: یہ ابھی ایک عارضہ ہے۔ مریض اپنی قدرت کے مطابق عبادت کرتا ہے۔ حیض و نفاس میں عورت سے نماز ساقط ہوتی ہے۔ البتہ وہ روزے قضا کرتی ہے کیونکہ یہ سال میں ایک مرتبہ ہی واجب ہوتے ہیں[۱]۔

علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے کہ بیماری کی وجہ سے شریعت نے جو سہولتیں اور آسانیاں دی ہیں وہ مثال کے طور پر یہ ہیں:

۱۔ جہاں وضو کرنے سے جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا بیماری کے بڑھ جانے یا بیماری یا زخم کے ٹھیک ہونے میں دیر لگ جانے کا خطرہ ہو وہاں تیمم کی اجازت ہے۔

۲۔ بیماری کی نوعیت اور سنگینی کے مطابق بیٹھ کر، لیٹ کر یا محض اشاروں سے نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

۳۔ مریض کو نماز با جماعت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن اسے باجماعت نماز کی فضیلت سے محروم نہیں کیا گیا۔

۴۔ انتہائی عمر رسیدہ اور روزہ کی استطاعت نہ رکھنے والے افراد کو فدیہ دے کر روزے نہ رکھنے کی اجازت دی۔
۵۔ ظہار کے کفارہ میں روزہ نہ رکھ سکنے کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی گنجائش رکھ دی گئی۔
٦۔ بیماری میں روزہ کھول دینے کی اجازت دی گئی۔
۷۔ بیمار افراد کو اعتکاف ادھورا چھوڑ کر گھر چلے جانے کی اجازت دی گئی ۔
۸۔ بیمار افراد کو حج بدل کر ادینے کی اجازت دی گئی۔
۹۔ مریضوں کو اجازت دی گئی کہ وہ جمرات پر کنکر مارنے کے لیے خود جانے کے بجائے اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں۔
۱۰۔ معالجین کو اجازت دی کہ وہ علاج کی خاطر نامحرم کا جسم حتیٰ کہ جسم کے پوشیدہ حصوں کا بھی معائنہ کر سکیں(۱)۔

موت: اس سے دنیوی احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ البتہ میت پر بعض احکام بالخصوص حقوق العباد کی ادائیگی واجب رہتی ہے۔ مثلاً اس کی تجہیز و تکفین، قرض کی ادائیگی اور مال کے ایک تہائی تک وصیت کی ادائیگی۔

اکتسابی (خود طاری کردہ) عوارض اور ان کی شرعی رخصتیں:

خطا: قتلِ خطا یا جرحِ خطا کی جو سزا رکھی گئی ہے (مثلاً دیت) اس میں قتلِ عمد کی نسبت بڑی تخفیف موجود ہے۔

اکراہ: اس کے نتیجہ میں مکرہ(یعنی وہ مجبور جو کسی کے اکراہ کا نشانہ بنا ہو) جو تصرفات کرتا ہے اس پر کوئی باز پرس نہیں ہے۔

سفر: یہ بھی عوارضِ مکتسبہ میں سے ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: طویل سفر اور مختصر سفر۔ طویل سفر وہ ہے جس کی کم از کم مقدار تین دن تین رات کی پیدل مسافت کے برابر ہو۔ اس مدت میں ضروریات کی تکمیل اور آرام وغیرہ بھی شامل ہے۔ اس کا اندازہ زمانہ قریب کے اہل علم نے ۴۸ میل/تقریباً ۸۰ کلومیٹر کیا ہے۔
طویل سفر میں شرعی رخصتیں یہ ہیں: نماز قصر کرنے کا حکم (۱) رمضان میں روزہ کھول دینے کی اجازت، تین دن تین رات تک موزوں پر مسح کرتے رہنے کی اجازت اور ایک فقہی رائے کے مطابق قربانی کا واجب، سنت نہ رہنا۔

مختصر سفر وہ ہے جو طویل سفر کی کم سے کم مقدار سے کم ہو۔ لیکن ایک ہی شہر میں آنے جانے کو سفر نہیں کہا جائے گا، بیرونِ شہر جانا ضروری ہے۔ اس سفر کی وجہ سے شریعت نے جو آسانیاں فراہم کی ہیں وہ مثال کے طور پر یہ ہیں:جمعہ اور عیدین کی نمازیں نہ پڑھنے کی اجازت، جماعت سے نماز نہ پڑھنے کی اجازت، سفر میں سواری ہی پر نوافل پڑھنے کی اجازت اور تیمم کر لینے کی اجازت وغیرہ ۔

عُسر اور عمومِ بلویٰ:مشقت دور کرنے کے اسباب میں عُسر اور عموم بلویٰ بھی شامل ہیں۔ عُسر کے لفظی معنی مشکل کے ہیں۔ ہر وہ چیز جو کسی دقت یا تکلیف کا باعث بنے، عُسر کہلائے گی۔ اس اعتبار سے عُسر کا مفہوم نسبتاً عام (General)ہے۔ عمومِ بلویٰ کے معنی کسی (بُری یا نامناسب)چیز کا بہت زیادہ عام ہو جانا اور اس حد تک رائج ہو جانا ہیں کہ اس سے بچنا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جائے۔ اس اعتبار سے عمومِ بلویٰ کا مفہوم عُسر کی نسبت خاص (Specific) ہے۔

عُسر کی وجہ سے رخصتیں مثال کے طور پر یہ ہیں:کپڑے یا بدن میں بہت معمولی نجاست لگی رہ جائے تو نماز ادا کر لینا جائز ہے۔ معذور شخص جس کے بدن سے نجاست لگی رہتی ہو، نجاست کے باوجود نماز ادا کر سکتا ہے۔ مکھی مچھر اور پسو وغیرہ کا خون کپڑے یا زمین پر لگا رہ جانا۔ کپڑے پر پیشاب کی معمولی چھینٹے (سوئی کی نوک جتنے) پڑجانا اور راستہ کا کیچڑ اور گارا وغیرہ لگ جانا۔

عمومِ بلویٰ کی چند مثالیں یہ ہیں: عوامی مقامات کا جہاں کی صفائی اور طہارت کا لوگ خیال نہیں رکھتے، پاک ہونا۔شدید بارش میں نماز باجماعت کا معاف ہونا۔ سواری (مثلاً کشتی، ریل اور جہاز وغیرہ) میں دورانِ سفر (سر گھومنا، سر چکرانا) کے خوف سے بیٹھ کر نماز ادا کرنا جب کہ کھڑے ہونے کا موقع بھی ہو ۔

(ماخوذ از علمِ اصولِ فقہ ،ایک تعارف جلد دوئم از ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلونصفحہ نمبر ۳۹۹ تا ۳۰۳)

ضمیمہ نمبر۲

(یہ چند صفحات دراصل پشاور میڈیکل کالج کے شرعی بورڈ کے لیے ڈاکٹروں اور فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں رہنما اُصول کے طور پر لکھے گئے تھے جو بعد میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ پشاور میڈیکل کالج کے شعبہ تربیہ کی جانب سے مطبوعہ کتابچہ میں ضمیمہ کی شکل میں شائع کیے گئے ہیں۔ موضوع سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان شاء اللہ یہ مباحث مفید ہوں گے۔مرتب)

ڈاکٹرز اور دوا ساز کمپنیوں کے تعلقات کے اُصول اور تقاضے

سوالنامے میں سوالوں کی نوعیت دیکھتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جوابات سے پہلے اس ضمن میں چند اہم اصولوں اور فقہی قواعد کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ سوالوں کے جواب سمجھنے میں آسانی ہو۔

اوامر و نواہی میں قرآن حکیم کے چند اُصول:

ہم یہاں ہمارے موضوع سے متعلق چند اُصول مختصر طور پر بیان کریں گے۔

١۔ پہلا اُصول عدم حرج ہے:

حرج کے معنی تنگی ہیں۔مطلب یہ ہے کہ قوانین ایسے ہوں جن میں آسانی اور سہولت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ نہ کہ تنگی اور ایسی دشواری جو کہ انسان کی برداشت سے باہر ہو اور اس کا مناسب حل موجود نہ ہو۔ طوالت کے پیش نظر اس ضمن میں قرآنی آیات و احادیث کا صرف حوالہ دیں گے۔

(سورہ البقرہ آیت نمبر۱۸۵، الحج آیت نمبر۷۸، المائدہ آیت نمبر ٦)

حدیث ١۔بعثت بالحنیفیة السمحة۔ "میں آسان دین حنیفی دے کر بھیجا گیا ہوں"۔

حدیث۲۔لاضرر ولا ضرار فی الاسلام۔

"اسلام میں نہ تو کسی کو تکلیف (نقصان) دینا ہے اور نہ خود تکلیف(نقصان) اُٹھانا ہے"۔

<u>حرج کے پہچان کی ایک تدبیر:</u>
فقہا نے ایسے حرج اور مشقت کی پہچان کے لیے جن کے سمجھنے میں عام نظریں دھوکا کھا جاتی ہیں بعض طریقے مقرر کیے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ کام میں جو مشقت اور تنگی ہوتی ہے اُس کے تین درجے کیے جائیں۔(ا) اعلیٰ۔ (۲) ادنیٰ۔ (۳) اوسط۔
<u>اعلیٰ</u> یہ کہ اگر اس مشقت سے کچھ ہی زیادہ اور ہو تو وہ غیر عادت والی مشقت بن جائے۔
<u>ادنیٰ</u> یہ کہ اگر اس میں کچھ تھوڑی بھی کمی ہو جائے تو وہ نفس مشقت ہی کے زمرہ سے خارج ہو جائے۔
<u>اور اوسط</u> یہ کہ ان دونوں کے درمیانی ہو۔
ظاہر نظر میں اعلیٰ مشقت غیر عادت والی کے زمرہ میں آسکتی ہے کیونکہ دونوں میں فاصلہ بہت کم باقی رہتا ہے۔ اس کے باوجود فقہا اس کو معتاد (عادت والی) ہی میں شمار کرتے ہیں اور رخصت و سہولت کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔
۲۔<u>دوسرا اُصول قلتِ تکلیف ہے:</u>
یہ عدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیونکہ قوانین میں جتنی زیادہ سختیاں ہونگی اُسی قدر تکلیف میں زیادتی ہوگی۔ آیاتِ قرآنیہ البقرہ نمبر ۲۸٦، سورہ النساء آیت نمبر ۲۸۔
رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے(دارقطنی) مذکورہ اُصول کی تائید ہوتی ہے۔ (ان اللہ فرضو فرائض۔۔فلاتحبثونہا۔
ترجمہ: ‘‘اللہ نے فرائض مقرر کیے ہیں اُن کو ضائع نہ کرو۔ حدود مقرر کر دیے ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ جو چیزیں حرام کر دی ہیں اُن کی پردہ دری نہ کرو۔ اور جن چیزوں سے بغیر بھولے ہوئے خاموشی اختیار کی ہے محض تم پر مہربانی کے لیے۔ اُن کے متعلق کرید نہ کرو۔ اور
‘‘ دین آسان ہے لیکن جو شخص دین میں مبالغہ کرتا ہے اُس پر وہ غالب آجاتا ہے’’۔
۳۔<u>تیسرا اُصول تدریج ہے</u>:
قرطبی میں حدیث مبارکہ ہے:
ان اللہ بدع شیاً من الکرامۃ۔۔ولکن اوجب علیھم مرۃ بقدرۃ۔
"فضیلت و کرامت کی کوئی بات ایسی نہیں رہی جسے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو عطا نہ فرمایا ہو۔ یہ بھی اُسی کا فضل و احسان ہے کہ شرائع (احکام)کو اُس نے ایک ہی دفعہ میں نہیں اُتارا بلکہ یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ واجب کیا"۔

اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کی درج ذیل تصریح نہایت دقیع ہے۔
إنما نزل أول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار ؛ حتى إذا ثاب الناس إلى الإسلام نزل الحلال والحرام . ولو نزل أول شيء لا تشربوا الخمر ؛ لقالوا : لا ندع الخمر أبدا . ولو نزل : لا تزنوا ؛ لقالوا : لا ندع الزنا أبدا ۔
(بخاری)
''پہلے مفصل (سورۃ حجرات سے لے کر آخر قرآن تک) کی وہ سورت نازل ہوئی۔ جس میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگ اسلام پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ تو پھر حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر مثلاً شراب نہ پینے کا حکم اول ہی دن نازل ہوتا تو لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اسی طرح ابتدا ہی میں زنا چھوڑنے کا حکم نازل ہوتا تو لوگ کہہ اُٹھتے کہ ہم اس سے ہرگز باز نہ آئیں گے۔''
اس طریق سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ قانون کے اجرا میں تدریجی طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ اور زیادہ زور تعلیم و تربیت (ذہنی فضا ہموار کرنے) پر دینا چاہیے۔

مقاصد شریعت:

مقاصد شریعت کا بیان احکام شریعت کو ایک باہم مربوط اور واضح اہداف کے حامل نظام کے طور پر سمجھنا ممکن بنا دیتا ہے۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مسائل میں حکم شریعت معلوم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں جن کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو۔
امام غزالیؒ نے مصالح یا مقاصد کی ایک فہرست مرتب کر دی جو آج تک ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:
''مصلحت سے ہماری مراد مقصودِ شریعت کی محافظت ہے اور شریعت کا مقصد خلقِ خدا کے سلسلے میں پانچ چیزوں سے عبارت ہے۔ وہ یہ کہ اُن کے دین، جان، نسل اور مال کی حفاظت کی جائے۔ ہر وہ چیز جو ان پانچ بنیادی چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہو مصلحت شمار ہوگی۔ اور ہر وہ چیز جو ان بنیادوں کے لیے خطرہ ہو، مفسدہ شمار ہوگی جسے دور کرنا مصلحت قرار پائے گا۔''
مزید یہ کہ شاطبی کے مطابق '' مصالح اور مفاسد سے مراد یہ ہے کہ وہ شارع کی نظر میں مصالح و مفاسد ہوں اشخاص کی طبیعت کے مناسب اور غیر مناسب ہونے کا اعتبار نہیں۔

سدِّ ذرائع:
ایسے ذرائع و وسائل اور اسباب کا انسداد یا اُن کو روک دینا جو مفاسد یا معصیت کا ذریعہ بنتے ہوں۔ ذریعہ کسی چیز تک پہنچنے کے لیے وسیلے یا راستے کو کہتے ہیں۔ خواہ یہ چیز خرابی (مفسدہ) کا باعث ہو یا فائدہ (مصلحۃ) کا باعث ہو اور یہ قول یا فعل ہو۔ ہمارے موجودہ سیاق و سباق میں لفظ ذرائع کا اطلاق اُن وسائل پر ہوتا ہے جو مفاسد تک پہنچاتے ہوں۔

سدِّ ذرائع کے چار درجات ہیں:

۱۔ پہلا درجہ:
ہر وہ کام جو یقینی طور پر فساد کا ذریعہ ہے۔ شریعت میں یہ ذریعہ اختیار کرنا حرام ہے۔

۲۔دوسرا درجہ:
وہ کام جس کے بارے میں ظنِ غالب یہ ہو کہ یہ فساد کا ذریعہ بنتا ہے جیسے شراب بنانے والے پر انگور کا رس بیچنا وغیرہ۔ یہ سب اُمور بھی ناجائز ہیں۔

۳۔تیسرا درجہ:
وہ افعال جو شاذ و نادر ہی فساد اور خرابی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس میں مصلحت یعنی فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور مفسدہ یا خرابی کا امکان کم۔ ان افعال کو اس دلیل کی بنا پر ممنوع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کہ یہ مفاسد کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے پیدا ہونے والی خرابی ایک راجح مصلحت و فائدہ سے دبی ہوئی ہے۔

۴۔ وہ افعال جو مفسدہ یعنی خرابی و نقصان کا کثرت سے ذریعہ بنتے ہوں۔

<u>مفاسد دور کرنا مصالح حاصل کرنے سے زیادہ مقدم ہے۔</u>

<u>درء المفاسد اولیٰ من جلب المصالح۔</u>

''مصالح حاصل کرنے سے زیادہ مقدم مفاسد دفع کرنا ہے۔''

شریعت میں مامورات پر عمل کرنے سے زیادہ منہیات سے بچنے پر زور دیا گیا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ :

فإذا أمرتكم بالشيء فخذوا به ما استطعتم وإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه .

''جب تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جس قدر طاقت رکھتے ہو اس کو کرو اور جب کسی سے روکوں تو پرہیز کرو۔''

اس روایت میں حکم کرنے سے متعلق اُمور میں ''**ماستطعتم**'' کی قید ہے اور نہی (نہ کرنے) سے متعلق امور میں یہ قید نہیں ہے جس سے اوامر کے مقابلے میں نواہی کی زیادہ اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

اسلام میں مقصد کا اعلیٰ ہونا اور اس کے حصول کے ذرائع کا پاکیزہ ہونا دونوں ہی مطلوب ہیں۔اسلامی شریعت اس قاعدے کو ہر گز ماننے کےلیے تیار نہیں کہ مقصد ہر قسم کے ذریعہ کو جائز کر دیتا ہے۔ اور نہ اس کے نزدیک یہ اُصول ہی قابل قبول ہے کہ صحیح مقصد کے حصول کے لیے بہ کثرت غلط طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔برخلاف اس کے اسلام یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ صحیح مقصد کیلیے صحیح طریقے ہی اختیار کیے جائیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اس غرض سے سود رشوت حرام کھیل جوا یا دیگر محظورات کے ذریعہ روپیہ کماتا ہے کہ وہ مسجد بنائے گا یا رفاہی خدمت انجام دے گا تو مقصد کی یہ پاکیزگی حرمت کو رفع نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسلام میں مقاصد اور نیتیں حرام پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

اس سلسلے میں متعدد احادیث ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے چھوڑ رہے ہیں۔

اضطرار اور ضرورت:

اضطراری حالت اور ضرورت سے مراد وہ حالت ہے جب انسان اپنے مذہب ، مال ،عقل یا نسل کو تباہی سے بچانے کے لیے مجبور ہو جائے ۔

ضرورت کے وقت ممنوع چیزیں مباح ہو جاتی ہیں۔

امام غزالیؒ نے فرمایا ہے: **جميع المحرمات تباح باالضرورة.**

''یعنی تمام حرام چیزیں بوقت ضرورت مباح ہو جاتی ہیں'' ۔

مگر یہ قاعدہ عام نہیں بلکہ اس کے لیے متعدد شرائط بھی ہیں۔ جو مختصر طور پر ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ نص کی شرط:۔

تنگی اور مجبوری کا لحاظ وہاں کیا جائے گا۔ جہاں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو۔

۲۔ مقدار کی شرط:

الضرورات بقدر یقدرھا (ضرورت کے وقت ممنوع چیز کے مباح ہونے کی مقدار معین ہے) کیونکہ مقدار ضرورت کی مقرر نہیں کی جاتی بلکہ اُس چیز کی کی جاتی ہے جو اس ضرورت کی وجہ سے مباح کی گئی ہے۔ ضرورت ایک اتفاقیہ چیز ہے جو قاعدہ کلیہ سے

مستثنٰی ہوتی ہے۔ اور جو چیز مستثنٰی ہوتی ہے وہ محدود رہتی ہے۔ مثلاً بھوکے کو روٹی چرانا مباح ہو جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کئی من آٹا چرالے۔

۳۔<u>وقت کی شرط</u>:

اجازت بوقت مجبوری صرف اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ عذر یا مجبوری باقی رہے۔ اور جب وہ مجبوری کی حالت ختم ہو جائے تو وہ رخصت یا حکمِ استثنائی بھی باقی نہ رہے گا۔ اور عام حکم لوٹ آئے گا۔

یہ یاد رہے کہ اضطرار کی حالت میں جو حرام چیز استعمال کی جائے وہ قرآن کی آیت کے رُو سے بغاوت اور تجاوز کے ساتھ نہ ہو۔(غیر باغٍ ولا عادٍ)

<u>رشوت اور تحفے تحائف</u>

مسند احمد بن حنبل کی حدیث ہے :نِعم المالُ الصالحُ لِلرَّجُلِ الصَّالحِ۔

"صالح مال، صالح آدمی کے لیے بہترین چیز ہے"۔

لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الراشی والمرتشی والرائش (مسند احمد)

"رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور دونوں کے درمیان واسطہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے"۔

رشوت کو ہدیہ کے نام سے پیش کرنے سے اس کی حرمتِ حلّت میں تبدیلی نہیں ہو جاتی۔

سنن ابو داؤد کی حدیث ہے:

مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ غُلُولٌ۔

"جس کو ہم نے کسی کام پر مقرر کر دیا اور اس کے معاش کا بھی انتظام کر دیا ۔اس کے بعد وہ جو کچھ لے گا وہ خیانت ہوگی"۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک والی کو قبیلۂ ازد کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے کچھ مال اپنے لیے روک رکھا اور کہا: یہ آپ لوگوں کا ہے اور یہ میرے لیے ہدیہ ہے۔ نبی ﷺ اس پر برہم ہوئے اور فرمایا:‘‘اگر تم سچے ہو تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھے رہتے اور پھر دیکھ لیتے کہ ہدیہ تمہارے پاس آتا ہے یا نہیں’’ پھر فرمایا:

عَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ، قَالَ اسْتَعْمَلَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم

رَجُلاً مِنَ الأَزْدِ يُقَالُ لَهُ ابْنُ اللُّتْبِيَّةِ عَلَى الصَّدَقَةِ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ هَذَا لَكُمْ وَهَذَا أُهْدِيَ لِي قَالَ فَهَلاَّ جَلَسَ فِي بَيْتِ أَبِيهِ ، أَوْ بَيْتِ أُمِّهِ فَيَنْظُرَ يُهْدَى لَهُ أَمْ لاَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ يَأْخُذُ أَحَدٌ مِنْهُ شَيْئًا إِلاَّ جَاءَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهُ عَلَى رَقَبَتِهِ إِنْ كَانَ بَعِيرًا لَهُ رُغَاءٌ ، أَوْ بَقَرَةً لَهَا خُوَارٌ ، أَوْ شَاةً تَيْعَرُ ، ثُمَّ رَفَعَ بِيَدِهِ حَتَّى رَأَيْنَا عُفْرَةَ إِبْطَيْهِ - اللَّهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ اللَّهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ. (بخاری)

''کیا بات ہے کہ جس شخص کو میں عامل مقرر کرتا ہوں وہ کہتا ہے: یہ تمہارے لیے ہے اور یہ میرے لیے ہدیہ ہے۔ وہ اپنی ماں کے گھر میں نہ بیٹھا رہا کہ ہدیہ اس کے پاس آجاتا! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے جو شخص بھی کوئی چیز بغیر حق کے لے گا وہ اللہ کے ہاں اس مال کو اپنے اوپر لادے ہوئے آئے گا تو دیکھو تم میں سے کوئی شخص قیامت کے دن اپنی گردن پر اونٹ، گائے یا بکری کو اٹھائے ہوئے نہ آئے اس حال میں کہ یہ جانور چیخ رہے ہوں گے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کے بغل کی سفیدی دکھائی دینے لگی اور فرمایا: اے اللہ!میں پہنچا چکا۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ان شدید احکام کے پیشِ نظر قاضی اور والی کو چاہیے کہ وہ خود کو اپنے ماں باپ کے گھر میں فرض کر لے۔منصب سے معزولی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے گھر میں رہتے ہوئے جو کچھ ملتا اس کو منصب پر رہتے ہوئے حاصل کرنا جائز ہوگا اور جس کے بارے میں اسے یہ معلوم ہو کہ یہ منصب کی بناء پر مل رہا ہے تو اس کا لینا حرام ہوگا۔رہے احباب کے وہ ہدیے جن کے بارے میں اشکال محسوس ہو کہ معزولی کی صورت میں اسے ملتے یا نہیں تو وہ مشتبہ ہیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔''

(احیاء علوم الدین، کتاب الحلال، ص ۱۳۷)

شارع نے حاکم یا قاضی کو ہدیہ قبول کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ اُس شخص کیلیے ہے جو اُسے اس عہدے پر مقرر ہونے سے پہلے

ہدیہ نہ دیتا ہو۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہ ہدیہ کہیں فیصلے میں جانب داری کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

۔حلال۔حرام۔ متشابہات (یہاں وہ بحث درج کریں جو آپکے نوٹ میں ہے)

۔تصور ضرر:۔ضرر کے لغوی معنی نقصان (Damage)کے آتے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے ضرر سے مراد وہ نقصان ، پریشانی یا تکلیف ہے جو ناجائز طور پر کسی شخص کو پہنچے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ضرر سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ احادیث میں سب سے جامع حدیث لا ضرر ولا ضرار جس کو امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے۔

فقہائے اسلام نے اس حدیث کی بنیاد پرمتعدد قواعد فقہیہ بیان کیے ہیں بعض اہم قواعد جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں یہ ہیں۔

١۔ **الضرر یزال۔** ضرر کو دور کیا جائے گا۔

٢۔ **الضرر الاشد یزال باالضرر الاخف**۔بڑے اور شدید تر ضرر کو چھوٹے اور خفیف تر ضرر کے ذریعہ دور کیا جائے گا۔

٣۔ **الضرر لا یزال بمثلہ۔** ضرر کو اس جیسے دوسرے ضرر سے دور نہیں کیا جائیگا۔

تصور عموم بلویٰ:

عموم بلویٰ سے مراد کوئی ایسی (نا پسندیدہ یا نامناسب) حالت جو اتنی عام ہو جائے اور اس قدر پھیل جائے کہ اس سے بچنا مشکل ہو جائے۔ عموم بلویٰ کے نتیجہ میں بعض احکام میں تحفیف ہو جاتی ہے۔ عموم بلویٰ کا اُصول یہ ہے کہ جن معاملات میں نص قطعی موجود نہ ہو وہاں عموم بلویٰ کی وجہ سے مکروہات میں تخفیف کی جا سکتی ہے۔

حلال اور حرام کے جمع ہونے کی صورت میں حرام کو غلبہ ہوگا:

ما اجتمع الحلال و الحرام۔۔(مصنف عبدالرزاق)

بعض محدثین اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً نقل کیا ہے (زیلعی) اور بعض نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مو قوفا روایت کی ہے۔ فقہاء نے ذیل کا اصول نکالا ہے۔

''جب ایسی دو دلیلوں کا ٹکراؤ ہو جن میں سے ایک سے حرمت ثابت ہوتی ہو اور دوسری سے اباحت تو حرمت کو مقدم رکھا جائیگا۔

مثلاً اگر مردار کی چربی تیل کے ساتھ مل جائے تو ایسے تیل کا استعمال جائز نہیں ہے۔

جس چیز کا لینا حرام اُس کا دینا بھی حرام ہے۔

ماحرم اخذہ حرم اعطائۃ۔ "جس کا لینا حرام ہے اُس کا دینا بھی حرام ہے"۔

جیسے سود، رشوت، کہانت وغیرہ کی اجرت۔

جس فعل کا کرنا حرام اُس کا دوسرے سے مطالبہ بھی حرام ہے:

ما حرم فعلہ حرم طلبہ۔

"جس فعل کا کرنا حرام ہے دوسرے سے اُس کا مطالبہ بھی حرام ہے"۔

قیمتوں سے کھیلنا:

اسلام نے بازار کو آزاد چھوڑنا پسند کیا ہے۔کہ طبعی قوانین اپنا کام کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں عہد رسالت میں جب قیمتیں چڑھ گئیں اور لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارے لیے اشیاء کے نرخ مقرر کر دیجئے تو رسول نے فرمایا،''اللہ ہی قیمتوں کا مقرر کرنے والا ہے گرانی اور ارزانی وہی پیدا کرتا ہے اور رزق دینے والا بھی وہی ہے۔میں اللہ سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی شخص بھی خون یا مال کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی مطالبہ نہ کرے۔'' (مسند احمد) پیغمبر اسلام نے اس حدیث کے ذریعے اعلان فرما دیا کہ افراد کی آزادی میں بلا ضرورت مداخلت کرنا ظلم ہے۔

لیکن اگر بازار میں غیر طبعی عوامل داخل ہو جائیں مثلاً ذخیرہ اندوزی اور قیمتوں سے کھیلنا تو ایسی صورت میں اجتماعی مصلحت کو افراد کی آزادی کے مقابلہ میں مقدم سمجھنا چاہیے۔۔اور ایسی صورت میں نرخ مقرر کرنا معاشرہ کی ضرورت کا تقاضا ہے تاکہ نفع اندوزی کرنے والے حریصوں سے معاشرہ کو بچایا جا سکے۔

مذکورہ حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نرخ مقرر کرنا ہر حال میں ممنوع ہے خواہ رفعِ حرج اور صریح ظلم سے روکنے کے لیے کیوں نہ کیے جائیں بلکہ محقق علما اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نرخ مقرر کرنا بعض حالات میں تو حرام اور ظلم ہے لیکن بعض حالات میں منصفانہ اور جائز کام ہے۔لٰہذا اگر نا روا طریقہ پر ظلم و زیادتی کرکے لوگوں کو ایسی قیمت پر چیزیں فروخت کرنے کے لیے مجبور کر دیا جائے جس سے وہ راضی نہیں ہیں یا مباحات سے انہیں روکا جائے تو یہ حرام ہوگا۔ اور اگر لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے کی غرض سے نرخ مقرر کیے جائیں مثلاً مروجہ قیمت (Standard Price)کے مطابق معاوضہ لے کر فروخت کرنے کے لیے انہیں

مجبور کر دیا جائے یا معروف معاوضہ سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے سے انہیں روکا جائے تو ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوگا۔
پہلی صورت کے بارے میں مذکورہ حدیث وارد ہوئی ہے۔ لٰہذا جب لوگ معروف طریقہ پر بغیر ظلم و زیادتی کے مال فروخت کرتے ہوں اور اشیاء کی قلت یا آبادی میں اضافہ کی وجہ سے قیمتیں چڑھ جائیں تو معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے۔ ایسی صورت میں لوگوں کو مجبور کرنا کہ وہ مقررہ قیمت پر چیزیں فروخت کریں ناحق کی زیادتی ہوگی۔
رہی دوسری صورت یعنی لوگوں کے ضرورت مند ہونے کے باوجود تُجار اشیاء فروخت نہ کریں اور معروف قیمت سے زیادہ کا مطالبہ کریں تو ایسی صورت میں مروجہ نرخ کے مطابق اشیاء فروخت کرنا واجب ہے۔ اور نرخ مقرر کرنے کامطلب یہ ہے کہ مروجہ نرخ کو ان پر لازم کردیا جائے۔ ایسے موقع پر قیمتوں کی تعیین کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس عدل کو لازم کر دیا ہے اس پر کاربند ہونے کے لیے تاجروں کو مجبور کر دیا جائے۔
اس ضمیمہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

1. اسلام میں حلا ل و حرام از مولانا یوسف قرضاوی
2. مبادیات اصول فقہ از عبد الطیف خان گنڈاپور و محمد خان منہاس
3. قواعدِکلیہ از ڈاکٹر محمود احمد غازی
4. محاضرات فقہ (ایضاً)
5. فلسفہ شریعت اسلام ڈاکٹرصبحی محمصانی
6. مقاصد شریعت از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

اہم الفاظ و اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ و تشریح
(GLOSSARY OF WORDS)

NOTE: The meaning and definition of the following words are given in the context of this book. You may find some of the

meanings and explanations different in the dictionary. The words and phrases are given as used in the Book and not in Alphabatical order.

رخصت : Concession/Concessionary Laws – Those commands which are for particular circumstances, limitations and excuses

عزیمت : Steadfastness / Firm Intention / Strict Laws / General laws – Those commands which are for mankind in general with respect to their general circumstances (i.e They are not based on limitations and excuses)

موجودہ حالت : Existing circumstance

متوقع حالت : Expected Circumstance

حکم شرعی تکلیفی : Defining Law

غلطی : Mistake

اکراہ : Coercion

بے ہوشی : Unconsciousness.

بچپن : Minority Age.

فتور عقل : Unsoundness of Mind.

دیوانگی : Madness.

رضاکارانہ : Voluntary.

جہالت : Ignorance.

ضرورت : Dire Necessity/ those affairs which cannot be ignored for the sake of human life and the continuity of human society. Basically such affairs are of five kinds called OBJECTIVES OF SHARIAH: 1) Religion 2) Life 3) Progeny 4) Reason 5) Property.

حاجت : Those affairs which can be ignored with some inconvenience/hardship.

مشقت : Hardship.

مصلحت : The realization or accomplishment of an advantage or eradication of some evil or inconvenience or such form of remission which is based on the protection and care of the objective of the Law Giver.

مصلحت مرسلہ : Public interest / The state of a thing in the observance of which a MUJTAHID considers or sees the public interest and its reliance or rejection is not stated in a text (NASS).

تسہیلی : Facilitative.

تخفیف : Remission/Alleviate.

یسر : Easy.

عسر : Difficulty/ Distressful situation.

عدم تشدید : Non Coercive.

غوروفکر : Contemplation/Meditation.

تفکر : Contemplate.

نرمی : Softness/Relaxation.

ارتفاقات : Daily matters of the people.

تقویٰ : Piety.

نسیان : Forgetfulness.

آگہی : Awareness.

عذر : Excuse.

استثنا : Exception.

مستثنیٰ : Exempted.

اصلی یا ابتدائی حکم : Original Order.

استعداد : Capacity.

صلاحیت : Capability.

الضرر یزال : Harm should be eliminated.

لاضرر و لا ضرار : There is to be no harm and no reciprocating harm.

الاضطرار لا یبطل حق الغیر : People's rights are not devoured because of necessity.

الضرورات تبع المحضورات : Necessity renders prohibited matters permissible.

اذا ضاق الامرا تسع : When a matter tightens it will widen and vice versa.

المشقۃ تجلب التیسیر : Hardship begets ease.

رخصت ابدال: Rukhsat that replaces a particular worship with another.

رخصت تاخیر: That delays doing something.

رخصت خوف: That changes a structure that is of salaat due to fear.

رخصت ترک واجب: That cancels a command due to a valid excuse.

رخصت قصر: That reduces the worship.

امت وسط: Ummat justly balanced/community of the middle way. Signifies that distinguished group of people which follows the path of justice and equity, of balance and moderation.

تقلید: Rigid conformity.

ابطال: Nullification.

تصوف: Muslim term for mysticism.

اُمت: Community of Muslims

شریعہ: Detailed law prescribed by Islam.

اجتہاد: Literally means exerting one's utmost and as a term of Islamic jurisprudence it implies the deduction of laws in accordance with the laid down principles from the Quran and sunnah applicable to new circumstances and conditions.

فقیہہ: Well-versed in Islamic Jurisprudence.

مجتہد: One who undertakes and carries out ijtihad.

مجّدد: One who revives and restores Islam.

مناظرہ: Scholastic ''duels''

غیر عقلی: Irrational.

عقلی توجیہہ: Rational interpretation.

اخلاقی انحطاط: Moral degeneration

درست محل و مقام: In right perspective and with true import.

بدعت: Innovation.

تاتاری یلغار: Tatar's deluge.

ظِلّ اللہ: Shadow of God.

خلوت نشینی: Seclusion.

نشاندہی کرنا: to Point out./Pointation
منطقی: Logical
تجدید: Striving with a view to bring about the revival of Islam in all its various aspects and in its true form and spirit as against modernization and innovation.

ماخذ کتب

تفسیر و حدیث

تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
تفسیر ابن کثیر۔ ترجمہ مولانا محمد جُونا گڑھیؒ حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر
فی ظلال القرآن اُردو ترجمہ سید معروف شاہ شیرازی۔ سید قطب شہیدؒ
معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب
تعلیم القرآن صابر قرنی
زادِر اہ (منتخب احادیث کا مجموعہ) مولانا جلیل احسن ندوی

نقوشِ ہدایت(منتخب احادیث) سراج احمد ندوی
تفسیر سورۃ فاتحہ خرم مراد

سیر ت

سرور عالم ﷺ۔۔ مولانا سید ابو الاعلی مودودی
سنت کی ائینی حیثیت ایضاً
پیغمبر اسلام اور غروات سرایا حکیم محمو د احمد ظفر
محاضرت سیرت ڈاکٹر محمود احمد غازی
سیرت رحمت عالم ﷺ ڈاکٹر ضیاء العمری
النبی الخاتم ﷺ مولانا مناظر احسن گیلانی
دروس سیرت ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
زندگیاں صحابہ کی ڈاکٹر عبد الرحمن رفعت پاشا

متفرق

۔تنقیحات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۔خلافت و ملوکیت ایضاً
۔تجدید و احیائے دین ایضاً
۔الجہاد فی الاسلام ایضاً
۔اسلامی ریاست ایضاً
۔اسلامی قانون اور اس کےنفاذ کی عملی تدابیر ایضاً
۔رسائل و مسائل حصہ اول و دوم ایضاً
۔اسلام کا نظریۂ سیاسی ایضاً
۔شہادتِ حق ایضاً

۔اسلام اور جاہلیت ایضاً
۔اسلام کا نظام حیات ایضاً
۔اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے۔ ایضاً
۔قادیانی مسئلہ ایضاً
۔بناؤ اور بگاڑ ایضاً
۔ہدایات ایضاً
۔تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل ایضاً
۔روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ایضاً
۔مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل ایضاً
۔دینیات ایضاً
۔خطبات ایضاً
۔اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ایضاً
۔اسلام اور موجودہ سیاسی کشمکش تینوں حصے مولاناسیدابوالاعلیٰ مودودیؒ
۔قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ایضاً
۔تصریحات ایضاً
۔جہاد فی سبیل اللہ ایضاً
۔تفہیمات حصہ اول، دوم، سوم ایضاً
۔مسئلہ قومیت ایضاً
۔تزکیۂ نفس امین احسن اصلاحیؒ
۔دعوت دین اور اس کا طریق کار ایضاً
۔حقیقت ِ دین ایضاً
۔دین میں ترجیحات مولانا یوسف القرضاوی
۔اسلام میں حلال و حرام ایضاً
۔اخوان المسلمون کا تربیتی نظام ایضاً
۔مفردات القرآن دونوں جلدیں امام مولانا راغب الاصفحانی
۔قرآن کے کثیر المعانی الفاظ دونوں حصے صابر شاہ فاروقی

۔اسلام ایک نظر میں مولانا صدر الدین اصلاحی
۔دین کا مطالعہ کیسے کریں ایضاً
۔جہاد اسلامی خلیل احمد حامدی
۔اسلام کا قانون بین الممالک ڈاکٹر محمود احمد غازی
۔قواعدِکلیہ ایضاً
۔محاضرات ِ فقہ ایضاً
۔تعمیر سیرت کے لوازم نعیم صدیقی
۔اپنی اصلاح آپ ایضاً
۔تحریکی شعور نعیم صدیقی
۔المودودی ایضاً
۔تذکرہ مودودی ایضاً
۔اسلام اور عدل اجتماعی سید قطب شہید ؒ
۔جادہ و منزل ایضاً(ترجمہ خلیل حامدی)
۔مبادیات اصولِ فقہ عبداللطیف خان گنڈہ پور و محمد خان منہاس
۔خطابات جمعہ اربعین نودی ڈاکٹر اسرار احمد
۔الوجیز فی الفقہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان
۔جامع الاصول ایضاً
۔اصول دعوت ایضاً
۔دوائے شافی حافظ ابن قیم
۔زاد المعاد ایضاً
۔اعلام الموقعین ایضاً
۔اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے۔ سید حامد علی
۔امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی
۔سید احمد شہید ایضاً
۔تدوین ِ فقہ ایضاً
۔تاریخ دعوت و عزیمت تمام حصے مولانا ابوالحسن علی ندوی

۔اسلام اور مغربیت کی کشمکش ایضاً
۔اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ایضاً
۔امام ابوحنیفہ اُستاد ابوزہرہ
۔امام مالک ایضاً
۔امام شافعی اُستاد ابوزہرہ
۔امام احمد بن حنبل ایضاً
۔علم اصول فقہ ایک تعارف تمام حصے ڈاکٹر خالد احمد ڈھلون
۔مقاصد شریعت ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی
۔سید احمد شہید مولانا غلام رسول مہر
۔اسلام اور جدید ذہن کے شبہات محمد قطب
۔قرآن کا راستہ خرم مراد
۔اپنی تربیت کیسے کریں ایضاً
۔نالۂ شب ایضاً
۔حقوق العباد اورمعاملات مولانا محمدتقی عثمانی
۔Our dialogue تینوں حصے عادل صلاحی
۔اسلامی شریعت، مقاصد و مصالح حامدیوسف العالم
۔فلسفہ شریعت اسلام ڈاکٹر صبحی محمصانی
۔انسانیت موت کے دروازے پر مولانا ابوالکلام آزاد
۔منہاج القاصدین ابن جوزی
۔مجلہ شرح خالداتاسی
۔فقہی مباحث حصہ اول و دوم ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
۔ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۳، اکتوبر ۱۹۳۳، اکتوبر ۱۹۳۵، مارچ ۱۹۳۹، ۱۹۶۶۔ جون ۱۹۴۰، جولائی ۱۹۴۰،، مئی ۲۰۰۳ستمبر ۲۰۰۵، فروری ۲۰۰۶، اپریل

۲۰۰٦، جون ۲۰۰٦، اکتوبر ۲۰۰٦، اگست ۲۰۰۷، جنوری ۲۰۱۱، فروری ۲۰۱۲، فروری ۲۰۱۴، ستمبر ۲۰۱۴، نومبر ۲۰۱۴، جنوری ۲۰۱۵، مارچ ۲۰۱۵، اپریل ۲۰۱۵، مئی ۲۰۱۵، جون ۲۰۱۵، جولائی ۲۰۱۵، جنوری ۲۰۱٦، جون ۲۰۱٦،

۔روزنامہ جسارت کراچی مودودی نمبر

۔ماہنامہ چراغ راہ کراچی اسلامی قانون نمبر

۔قومی ڈائجسٹ لاہور جنوری ۱۹۸۰

۔ہفت روزہ آئین لاہور جولائی ۱۹۷۲

۔متعدد ویب سائٹس